ابتدائیہ

مغربی ادب سے انتخاب

افسانے

ناول

سچی کہانیاں

مستقل سلسلے

پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

دفتر کا پتا 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ کراچی

خط و کتابت کا پتا: بنام مدیر ماہنامہ افق پوسٹ بکس نمبر 874 کراچی 74200 فون نمبرز 021-35620771/2

فیکس 021-35620773 کے ذریعے مطبوعات سے افق پبلی کیشنز ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

کرپشن آف ڈیماکریسی......!!

انتخابی عمل میں کسی بھی قسم کی جعل سازی دراصل نہ صرف جمہوریت بلکہ خود انتخابات کی روح کے منافی ہے۔ چیف جسٹس آف پاکستان جناب جسٹس افتخار محمد چوہدری اور جسٹس جناب عارف حسین خلجی پر مشتمل بینچ نے کہا ہے کہ بلاشبہ جمہوری معاشروں میں انتخابی عمل میں شفافیت ناگزیر ہے۔

وطنِ عزیز میں جب بھی انتخابات کی بات ہوتی ہے تو غیر جانبدارانہ اور منصفانہ آزاد الیکشن کے حوالے کے طور پر صرف 1970ء کے انتخابات کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ وطن عزیز میں ایک بار پھر انتخابات کا غلغلہ اٹھ رہا ہے۔ عنقریب نہیں تو اپنے وقت پر جو زیادہ دور نہیں انتخابات ہونے میں آنے والے ہیں انتخابات کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہو رہی ہیں۔ جلسے جلوسوں کی بہار لگنے لگی ہے۔ ہر سیاسی پارٹی نے سیاسی دنگل لگانے اور مقابلے میں اترنے کی تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ اسی سلسلے میں سپریم کورٹ نے الیکشن کمیشن کو انتخابی فہرستوں کو درست کرنے انہیں شفاف الیکشن کے قابل بنانے کی ہدایت جاری کر دی ہیں لیکن الیکشن کمیشن جس پر غالباً حکمرانوں اور سیاستدانوں کا فطری دباؤ ہے وہ دہری پریشانی میں مبتلا ہے۔ اسے نہ اگلتے بن رہی ہے نہ نگلتے بن رہی ہے۔ سپریم کورٹ کی طرف سے دی گئی ڈیڈ لائن جو درحقیقت وطن عزیز میں ہونے والے انتخابات کے عمل کو شفاف اور جمہوریت کی اصل روح کے مطابق بنانے کی کوشش ہے سپریم کورٹ کا حکم ہے کہ تمام ووٹر لسٹوں کی اغلاط دور کر دی جائیں تاکہ ووٹ دینے کے اصل حق دار افراد کو بلا امتیاز ووٹ کا حق حاصل ہو سکے۔ اس طرح جعل سازی اور جعلی ووٹوں کا راستہ روکا جا سکے گا اور انتخابات کو شفاف اور منصفانہ بنایا جا سکے گا۔ اس کے لیے تمام ہی سیاسی جماعتیں جو انتخابات میں حصہ لینے والی ہیں کو بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرنا ہوگا تب ہی یہ ممکن ہو سکے گا ورنہ سپریم کورٹ کے احکامات کے باوجود انتخابی فہرستوں کی درستگی کا عمل اس قدر تاخیر کا شکار نہ ہوتا اس کی اصل وجہ سیاسی جماعتوں کا خوف ہے کہ اگر انتخابی فہرستوں سے ان کے درج کرائے گئے جعلی ووٹوں کی نشاندہی ہو گی تو پھر یقیناً ان کی کامیابی ممکن نہیں ہو سکے گی۔ تقریباً تمام ہی سیاسی جماعتوں نے حسب توفیق ان انتخابی فہرستوں میں اپنے جعلی ووٹوں کا اندراج خواہ اضافہ کر رکھا ہے۔ پھر دوسرا یہ کام کہ جو

اصل ووٹر انتخابی عمل سے دور رہتے ہیں اس ڈر خوف کے باعث گھروں سے نہیں نکلتے کہ کہیں کسی انتخابی فساد کا شکار نہ بن جائیں یا جس امیدوار کو وہ درست سمجھتے ہیں اور ووٹ دینا چاہتے ہیں لیکن ان کے حلقے میں کسی دوسری جماعت کے حامیوں کا اثر و رسوخ اور زور چلتا ہے وہ اپنے آپ کو اپنے سیاسی حریف کی نظروں میں نہ آنے دینے کے لیے اپنے گھر میں ہی بیٹھے رہ جاتے ہیں۔ اور خواہش کے باوجود اپنے ووٹ کا حق استعمال نہیں کر سکتے۔ ایسے تمام ووٹروں کے ووٹ بھی طاقت ور امیدوار کے حامی اور انتظامیہ اپنے حق میں جعل سازی دھونس دھڑلے کے ذریعہ استعمال کر لیتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ خود میرے ساتھ گزشتہ الیکشن کے موقع پر پیش آیا کہ جب میں خود ووٹ ڈالنے پہنچا تو معلوم ہوا نہ صرف میرا بلکہ میرے خاندان کے تمام افراد کے ووٹ بھگتائے جا چکے تھے۔ میں اپنا سا منہ لے کے واپس آ گیا۔ ایسا ڈراما اکثر ہوتا ہے جب مدمقابل بااثر امیدوار کو یہ خوف ہو کہ فلاں خاندان یا گھر والوں کے ووٹ اس کے حق میں نہیں ڈالے جائیں گے تو وہ اس کا بندوبست پہلے سے ہی کر لیتے ہیں۔

الیکشن کمیشن اور عدلیہ کی یہ ساری تگ و دو دراصل وطن عزیز میں نہ صرف شفاف الیکشن کے ذریعہ جمہوری اقدار کو مضبوط و مستحکم کرنا ہے اور آئین پاکستان کی پاسداری بھی تب ہی ممکن ہے الیکشن کمیشن نے خود یہ اقرار کیا ہے کہ موجودہ فہرستوں میں تقریباً تین کروڑ بوگس یعنی جعلی ووٹ پائے جاتے ہیں۔ اب سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق گو کہ الیکشن کمیشن نے ووٹر لسٹوں سے تمام جعلی ووٹ حذف تو کر دیے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی 8 کروڑ نئے ووٹرز کو نئی فہرستوں میں جگہ بھی دی گئی ہے۔ جو بڑی چھان پھٹک کے بعد دی گئی ہے۔ یقیناً اس سے وطن عزیز میں شفاف انتخابات کے عمل میں اگر مکمل طور پر نہ سہی بڑی حد تک ضرور شفافیت آنے کا امکان ہے۔ برسہا برس کی خرابیوں کی اصلاح یقیناً راتوں رات نہیں ہو سکتی۔ لیکن جس طرح ایک آزاد عدلیہ جمہوریت کی بنیاد ہوتی ہے اسی طرح ایک آزاد الیکشن کمیشن بھی جمہوریت کو استحکام بخشتا ہے۔ رائے دہندگان کی رائے کا احترام ہی الیکشن کو شفاف بنا سکتا ہے۔ اس کے لیے الیکشن کمیشن کا خود شفاف ہونا ضروری ہے۔ وطن عزیز میں جمہوریت کے لیے جمہوری اداروں کے استحکام و فروغ کے لیے جمہوریت کی بقا کے لیے ملک میں آزادانہ منصفانہ انتخابات کا ہونا ناگزیر ہے۔ ملک میں جمہوری نظام قائم ہو مضبوط ہو اور جمہوری ادارے چلیں یہ ایک نہایت سنجیدہ اور اہم معاملہ ہے۔ اللہ کرے کہ ہر آنے والے انتخابات واقعی شفاف ہوں۔ آمین

گفتگو

عمران احمد

> حدیث نبوی ﷺ
>
> حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "چار چیزیں ایسی ہیں جسے میسر آ گئیں اسے دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل ہوگئی۔ (۱) شکر گزار دل (۲) خدا کو یاد کرنے والی زبان (۳) مصیبت پر صبر کرنے والا بدن (۴) ایسی بیوی جو اپنی جان اور شوہر کے مال میں خیانت نہیں کرتی۔" (متفق علیہ، مشکوٰۃ)

عزیزان محترم...... سلامت باشد!

اپریل کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔ امید ہے قارئین کے ذوق پر پورا اترے گا۔ گزشتہ دو ماہ سے پرچے میں غیر محسوس انداز میں آپ کی تجاویز کی روشنی میں تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔ یقیناً آپ نے اسے محسوس کیا ہوگا۔ زیر نظر شمارہ میں ہم نے مختصر افسانوں کے لیے بھی ایک گوشہ مختص کیا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مختصر لیکن مقصدیت لیے ہوئے افسانے ارسال کریں۔ اسماء الحسنیٰ کا سلسلہ قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔ اس ماہ اس میں بھی کچھ تبدیلی کر کے اسے مزید بہتر کیا جا رہا ہے۔ رواں ماہ سلسلہ وار کہانی بازی گر بعض وجوہ کی بناء پر شامل اشاعت نہیں۔ جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ بازی گر کی کمی ہم نے محترم یعقوب بھٹی کے ناول امید سحر سے پوری کر دی ہے۔ یہ ناول آپ کو ضرور پسند آئے گا۔

قارئین کے اصرار پر ماہنامہ آنچل کی طرح نئے افق میں بھی "روحانی مسائل کا حل" کے عنوان سے ان شاء اللہ آئندہ ماہ سے کالم کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ جس میں معروف روحانی شخصیت حضرت حافظ شبیر احمد قرآن کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل پیش کریں گے۔ اس میں شرکت صرف کوپن کے ذریعے ہی ہوگی ایک کوپن پر صرف ایک سوال کا جواب دیا جائے گا۔ سوال کے ساتھ اپنا مکمل نام معہ والدہ کا نام اور گھر کے کس حصے میں آپ کی رہائش ہے ضرور لکھا جائے۔

> ہم انتہائی دکھ کے ساتھ اپنے قارئین کو اطلاع دے رہے ہیں کہ ہمارے دیرینہ ساتھی اور عوام کے محبوب مصنف، ناول نگار اور ڈرامہ نویس محترم یعقوب جمیل اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن۔ مرحوم ایک ماہ سے فالج کا اٹیک ہونے کے باعث بستر علالت پر تھے۔ انہوں نے اپنے پسماندگان میں بیوہ ایک بیٹا بیٹی اور پاکستان اور بنگلہ دیش میں لاکھوں چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑا ہے۔ مرحوم نے اپنے کیریئر کا آغاز بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) میں فلمی کہانی نویس اور مکالمہ نگار کے طور پر کیا تھا۔ وہ اردو، بنگلہ اور گجراتی زبان پر یکساں عبور رکھتے تھے۔ پاکستان آ گئے اور ڈائجسٹوں سے وابستہ ہوگئے وہ آخری سانسوں تک وہ لکھتے رہے۔ آج وہ قانون قدرت کے تحت ہمارے ساتھ نہیں رہے مگر ان کی تحریریں ان کی یادیں ہمیشہ انہیں ہمارے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

محمد فهد...... مظفر گڑھ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ! سدا خوش رہو آباد رہو۔ کیسے مزاج گرامی ہیں جناب من کے آخر ایک عرصہ کے بعد دوستوں کی پرزور فرمائشوں نے دوبارہ قلم اٹھانے پر مجبور کر ہی دیا لکھنے کی جسارت ہم کر رہے ہیں تو پبلشنگ کا شرف آپ بھی ضرور بخشیے گا۔ ورنہ ہم وعدہ خلاف لوگوں کے کٹہرے میں ٹھہرائے جائیں گے۔ جو ہم نہیں چاہتے۔ کافی عرصہ کے بعد حاضری کی وجہ سے طرز تحریر میں ذرا تبدیلی رہے گی جو کہ شاید چاہنے والوں کو ذرا عجیب اور گراں گزرے (خیر اللہ کرم کرے) موجودہ ملکی حالات اور گورنمنٹ کے اقدامات پر اگر غور کیا جائے تو گورنمنٹ آٹے میں نمک کے برابر بھی کارکردگی نہیں دکھا پائی اور پنجاب گورنمنٹ نے بھی اپنے کئی عیب چھپانے کے لیے کچھ چھوٹے چھوٹے اقدامات کر کے طلبہ کو خاموش کرانے کے لیے LapTop دے ڈالے اور عوام کے لیے Yellow Cab کا [illegible]

وہ طلبہ کہاں جائیں گے جنہوں نے بغیر کسی ادارے کو Join کیے پرائیویٹ طور پر داخلے بھی لیے اور اچھے نمبرز بھی حاصل کیے۔ کیا انہیں صرف اسی بات کی سزا دی جا رہی ہے کہ وہ سرکاری اداروں کے طلبہ نہیں یا جانی مانی ہستیوں کے منظور نظر نہیں؟ اگر وہ اس قابل ہوتے کہ ریگولر ایڈمیشن بھیج پاتے تو وہ پرائیویٹ داخلے بھیج کر کیا خود کے مستقبل کو خود ہی تاریک کرنا پسند کرتے۔ کیا آپ جواب دے سکتے ہیں۔ یا فیڈرل گورنمنٹ یہ بتا سکتی ہے کہ تمام مراعات و سہولیات کے حق دار صرف پیپلز پارٹی کے ورکرز ہی ہیں۔ کیا عوام کا کسی بھی سہولت پر کوئی حق نہیں۔ جب کہ گورنمنٹ عوامی پیسے کو ہی استعمال کر کے صرف پارٹی ورکرز کو سہولیات مہیا کر رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں آج ملک میں امریکہ نواز پالیسیوں / پارٹی ورکرز کو ہی سہولیات مہیا کرنے کی پالیسیوں پر ہی کیوں عمل کیا جاتا ہے۔ کیا ہم 1947ء کے پاکستان کا ایجنڈا بھول چکے کیا ہم قائد و اقبال کے پاکستان کو بیچ چکے کہ ہم نے اپنے اسلاف کی قربانیوں اور انمول خون کی قیمت لگا ڈالی ہے۔ ایک بار سوچیے گا ضرور۔ اب آتا ہوں محفل کے دوستوں کی طرف جناب احمد کیف صاحب! اسلام مسنون کیسے مزاج ہیں [illegible] کافی مصروف ہو یار کافی عرصے سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔ جناب ارشاد قریشی صاحب! تحفہ سلام قبول کیجیے آپ کی حالت بھی کچھ احمد علی کیف جیسی معلوم ہوتی ہے ورنہ شروع میں تو آپ نے بھی بہت کالز کیں مگر اب تو جناب فون کر کے اتنا تک پوچھنا گوارا نہیں کہ زندہ بھی ہو؟ جناب سید عبداللہ شاہد صاحب! اسلام محمدی قبول فرمایئے جناب کس دنیا میں رہتے ہیں کوئی اتا پتا دیجیے اپنا۔ بزرگوار محترم جناب صابر لنگاہ صاحب! فرزند ارجمند کی طرف سے تحفہ سلامی اور نذرانہ دعائے صحت قبول فرمایئے۔ جناب ریاض بٹ صاحب! اخا کبار آپ کو سلام کہتا ہے اور جواب کا منتظر رہے گا۔ جناب ابن مقبول صدیقی صاحب! فرزند ارجمند کا سلام قبول کیجیے بمع نیک تمنائیں۔ جناب عبدالمالک کیف صاحب! اسلام مسنون کہاں غائب ہو بھائی کوئی رابطہ نہیں یار! جناب عبداللہ [illegible] صاحب! اسلام مسنون قبول ہو جناب۔ محترمہ مسرت اقبال میں اناچیز کی جانب سے گلدستہ سلامی بنتا ہے آج کل آپ کافی چھائی ہوئی ہیں۔ [illegible] کی تو شاعری یاد گی۔ خیر جواب کا منتظر رہوں گا۔ ڈیئر راؤ چاند صاحب! برادرم سلام قبول ہو یار پلیٹ فارم پر کافی عرصے کوئی حاضری نہیں یار کوئی ناراضگی ہے۔ بہت مصروف ہو پڑھائی میں اور سنا ہے شاید کچھ دوگی بھی ہو آج کل تو طبیعت ٹھیک ہے اب اور جلدی پلیٹ فارم پر اپنی واپسی یقینی بناؤ یار تمہارے [illegible] بہت یاد کر رہے ہیں تمہیں۔ ڈیئر ایس شاہین، محترمہ ریحانہ سعیدہ، محترمہ شہناز بانو، محترمہ شمسی ارشاد، محترمہ طاہرہ جبیں تارا، جناب ناظم بخاری، ڈاکٹر واجد نگینوی، محترم وقاص احمد وکی، سیدہ فوزیہ رضوی، نایاب صدف، فرح ناز، ثوبیہ ناز، رابعہ حسن لنگاہ، شفاعت حسین لنگاہ (تمام لنگاہ فیملی) اور محفل کے باقی تمام نئے اور پرانے دوستوں کو محمد فہد کی جانب سے سلام اور ڈھیروں خوشیوں کی دعاؤں کا تحفہ قبول ہو۔ آخر میں تمام دوستوں کے لیے نیک تمناؤں کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔ کسی کو کوئی بات بری لگے تو ایڈوانس معذرت چاہوں گا۔

عبدالمالک کیف...... صادق آباد! فروری کا شمارہ نئے افق 22 جنوری کو ملا۔ مگر آج تبصرہ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ آج دل بہت اداس ہے۔ اپنے ملک کے حالات پر سیاسی شعبدہ بازوں نے اسے کہاں سے کہاں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ سوچا تھا جمہوری حکومت آئی ہے تو ملک کے حالات تبدیل ہوں گے۔ نوجوانوں کے خواب شرمندۂ تعبیر ہوں گے۔ نوکریاں پڑھے لکھوں کی دہلیز پر ملیں گی۔ پانی، بجلی و صنعت و معیشت ترقی کریں گی اور پاکستان میں انقلاب آئے گا لیکن سب سوچیں دھری رہ گئیں۔ سب کچھ الٹ ہوا چار سال بیت گئے کہنے کو تو جمہوری حکومت نے کام شروع کر دیا مگر در حقیقت لٹیروں کا ہی راج رہا۔ امیر دن رات امیر اور غریب دن رات غریب بنتے گئے۔ لوگوں کی جان سستی اور روپے کی قدر ریزہ ہو گئی۔ لوگ مجبوراً خودکشیاں کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بھوک سے مجبور ہو کر والدین اپنے لخت جگر لے کے بازاروں میں آ گئے برائے فروخت کا بورڈ لے کے آہ کیسا دن دیکھنے کو ملا انہیں [illegible] اور اس کے ساتھ قتل و غارت گری کا طوفان برپا ہو گیا۔ جو [illegible] عوام کو الجھایا جاتا رہا۔ ہر شعبے میں نوکریوں [illegible] نوکریوں میں نظر آتے ہیں جو فقط کاغذات جمع کر کے غائب [illegible] نوجوان نے خالی اسامیوں کے فارم پر کر کے اپنی سی وی کی فوٹو کاپیاں [illegible] کے ساتھ کسی ڈاکٹر یا 18 گریڈ کے آفیسر سے تصدیق کروانے تک ان کی کتنی منتیں کرنی پڑتیں۔ پھر دور دوسرے شہروں کی خاک چھان کر ڈگریاں ہاتھوں میں لے کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے تک کن مراحل سے گزر رہے ہیں۔ یہ میں یا میرے جیسے نوجوان ہی جانتے ہیں۔ مگر امید کا دامن تا حال نہیں چھوڑا ہے آج سب دوستوں سے بہنوں سے اور قارئین سے اپنے دکھ سکھ بیان کرنے کو جی چاہتا ہے کہتے ہیں کہ دکھ سکھ شیئر کرنے سے اگر کم نہیں ہوتے تو انسان کا بوجھ ہلکا ضرور ہو جاتا ہے۔ اسی لیے آج اپنی بات کروں گا۔ میں اپنے حالات کا بیروزگاری کا غربت کا رونا نہیں رونا چاہتا وقت کی روٹی کا اللہ تعالیٰ نے جو وعدہ کر رکھا ہے وہ تو ہر حال میں ملے گی مگر انسان برسر روزگار نہ ہو تو دنیا کے ساتھ چلنا محال [illegible] ایک انسان اپنی اولاد کی خوشی کے لیے چھوٹی سی فرمائش بھی پوری نہ کر سکے لوگ کہتے ہیں اک عمر بتا دی کیف لیکن کیا ملا لکھنے لکھانے سے کیا ملتا ہے (مگر جہاں پاکستان کے سی [illegible] میں صحیح معنوں میں کوئی کام نہ ہوا ہو وہاں ادیبوں اور لکھاریوں کی فلاح و بہبود کے لیے کون سوچے) مگر انہیں کون سمجھائے کہ یہی قلم [illegible] لکھاریوں کو سچائی کی پرکھ بتاتا ہے اور ہم اپنا سچ لکھنے سے ہٹتے نہیں۔ اس لیے کچھ وقت

سے پریشانی تھی کہ اپنی بیروزگاری کا توڑ کیسے نکالا جائے کہ اتنے پیسے تو ہونے چاہیں کہ بندہ اپنی لکھی گئی کہانیاں موادوقت پر اچھے کسی میگزین میں بھیج سکے۔ یا دوسرے اخراجات TCS یا رجسٹری کروانے تک کے پیسے بھی ادھار لینے پڑیں تو ایسے میں لکھنا کو ترک کرنے کو جی چاہتا ہے یا پھر ایک شاعر اپنی کئی سالوں کی محنت سے اپنا مواد ایک کتاب کی شکل میں جمع کر لیتا ہے مگر اسے شائع کرانے کی سکت نہیں رکھتا۔ تو اس پر کیا بیتتی ہے جسے لگی ہو وہی جانے۔ یوں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا حال دل کہہ رہا ہوں بلکہ ایک اپیل کر رہا ہوں کہ مجھے جاب کی ضرورت ہے۔ سب دوستوں سے گزارش ہے کہ اگر کہیں سے کوئی ویکنسی نکل آئے کسی بھی ادارے میں تو آگاہ کریں۔ اگر نئے افق کی وساطت سے اک بیروزگار کا چولہا جلے گا تو بہت خوشی کی بات ہوگی ورنہ حکومت اور حالات سے تو میرے جیسے نوجوان مایوس ہو چکے ہیں۔ بہر حال میرے حق میں دعا کیجیے گا اور اگر کوئی اس سلسلے میں رابطہ کرے تو نئے افق کے ذریعے یا اس نمبر 0313-3452463 پر انتظام کرے ممنون رہوں گا۔ نئے افق کے اسٹاف کو سلام تبصرہ آئندہ ماہ کروں گا۔

طاہرہ جبین تارا ..... لاہور! محترمی عمران صاحب آداب امید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ نئے افق قدرتی منظر اور فطرت کی عکاسی کے ساتھ موصول ہوا۔ ٹائٹل میں آسمان کے ساتھ نیلگوں پانی اور ناخدا کے بغیر کشتی اور کونپلیں اور سایہ پر قد آور درخت ایک خوب صورت امتزاج ہے فطری منظر کا۔ مشتاق انکل جب سارا شہر دستانے پہن لے تو پھر انسان اپنا لہو کہاں تلاش کرے۔ ایک بار پھر ڈینگی وائرس ایکٹیو ہو چکا ہے۔ بدلتے موسم نے جہاں بہار کی آمد کی نوید دی ہے وہاں اجل کی آمد بھی بتادی ہے۔ ڈینگی وائرس پہلے سے زیادہ ایکٹیو ہو چکا ہے اور ان لوگوں کے لیے زیادہ خطرناک جو پہلے اس کا شکار ہو چکے ہیں اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اور اسے پھیلانے والوں سے نجات دے۔ "گفتگو" میں بہت سے ساتھیوں سے ملاقات ہوئی۔ شہناز آپی مجھے خود آپ سے نہ ملنے کا بے حد افسوس ہے دراصل میرا بھتیجا گاڑی اسلام آباد لے کر گیا ہوا تھا اور مجھے Eyes Problem تھا۔ ڈسٹ الرجی کی وجہ سے میں بائیک پر بھی آپ سے ملنے نہیں آسکتی تھی۔ اگر گاڑی گھر میں موجود ہوتی تو میں بیماری کے باوجود آپ سے خود ملنے ہوٹل آجاتی اور آپ سب کو زبردستی اپنے گھر لے آتی جب تین دن بعد بھتیجا گھر آیا تو آپ میرے شہر سے رخصت ہو چکی تھیں۔ زندگی رہی تو آپ سے پھر ملاقات ہوگی۔ عالیہ انعام الٰہی صاحبہ اگر آپ اردو ادب کے افسانوی اور داستانوی ادب کے رموز سے آشنا ہوتیں تو آپ میری لفظی کہانی میں واقعہ تلاش نہ کرتیں اگر آپ نے لفظوں سے معاشرے کے کسی پہلو کی اصلاح کرنی ہو تو پھر لفظوں کے ذریعے اصلاح کی جاتی ہے اور میرا مقصد بھی یہی تھا کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا اور اللہ کی نعمتوں کو جھٹلاتا ہے اور آخر میں خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ اس لیے لفظی کہانی میں واقعہ تلاش کرنا چہ معنی دارد ویسے اب ایک واقعہ کو بنیاد بنا کر کہانی ارسال کر رہی ہوں۔ اس میں آپ کو واقعہ نظر آئے گا۔ "یا احد" اسمائے مبارک کی صفات ایک بہت اچھا اقدام ہے۔ آج کل ہر انسان مشکلات میں گھرا ہوا ہے اور اسمائے مبارک کو اس طرح یاد کر کے اپنی مشکلات سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ "اقرا" پڑھ کر ایمان تر و تازہ ہو گیا۔ کاش ہمارے حکمران اپنی فرعونیت ترک کر دیں۔ ہٹ دھرمی تکبر کی وجہ سے ہی آج ہم زوال کا شکار ہیں۔ گردش نے تو ہمیں بھی مبتلا کر دیا ہے۔ منشی کے ساتھ مشاہد کیا؟ شہناز آپی آپ کا ہیرو تو برائیوں کی دلدل میں گر رہا ہے۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے شاہ زیب کی طرح مضبوط کردار کا ہونا چاہیے۔ "بازی گر" سسپنس کی انتخاب دیکھیں عقدہ کیا کھلتا ہے۔ دل کو تھام کے رکھنا پڑے گا۔ بیت المقدس تاریخی اوراق اپنی جھلکیاں اور اپنا رنگ دکھا کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ والے حمید تو میرے بچپن کے رائٹر ہیں خطروں کے کھلاڑی دلچسپ موڑ لے رہی ہے۔ کاش ناگن سے میری بھی ملاقات ہو جاتی قرآنی عورتیں بہت زبردست انبیاء اکرام کی ازواج مطہرات سے تعارف بہت اچھا لگا۔ اگر مزید انبیاء اکرام کی ازواج مطہرات کا تعارف دیا جائے تو ہماری معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوگا۔ قاتل کی تلاش میں تشنگی سی محسوس ہوئی خاص کر انسپکٹر کامران کے حوالے سے۔ جلال اور ناصر کے حوالے سے ایک دم کہانی کو سمیٹ دیا؟ زن زر اور زمین کے تناظر میں لکھی گئی کہانی انکل فقیر محمد بخش بہت زبردست رہی۔ اسیر ناز سلوش ڈشے کی کہانی ترجمہ تھی مزا نہیں آیا۔ زہر عشق ریاض بٹ اچھی تحریر تھی۔ پڑھ کر مزا آیا۔ ویسے قاتلہ کو میں نے بھی پہچان لیا تھا کہ انہی دونوں بہنوں میں سے کوئی ایک ہوگا۔ آپ کی کہانیوں کو پڑھ کر ہم بھی تیز ہوتے جا رہے ہیں۔ جاسوسی کے جراثیم پیدا ہو گئے ہیں۔ ضدی فرشتہ بس ایک شعر عرض ہے۔

ارادے جن کے پختہ ہوں نظر جن کی خدا پہ ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتا

برزخ، برزخ کا صحیح تصور کھینچا ہے۔ جب انسان دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو پھر مادی دنیا سے اس کا رشتہ بھی کٹ جاتا ہے۔ واپس لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔ شکر ہے دونوں نرا اینڈ ایلین سدھر گئے ایک شک کی وجہ سے گھر اجڑ جاتا۔ زندہ سایہ وجاہت صباحت اس کا نام تو روح کا انتقام ہونا چاہیے تھا۔ بے گناہ لہو ضرور رنگ لاتا ہے۔ ایک کہانی "مغرب نے ہمیں لوٹا" اور غزل بھیج رہی ہوں امید ہے شائع کر کے مشکور فرمائیں گے۔ شمسی جی آپ کہاں ہیں؟ اب فائق آپ پر ہونا چاہیے کیا خیال ہے اس مہینے تو کہانی نہ گفتگو میں شامل۔ نئے افق کو سجانے سنوارنے والوں اور قارئین کو بہت بہت سلام۔

ناظم بخاری ..... لودھراں! محترم عمران احمد قریشی صاحب السلام علیکم! کیسے ہیں آپ امید ہے کہ بفضل خدا خیریت سے ہوں گے۔ کافی عرصے بعد نئے افق کے صفحات پر آپ کے اور قارئین کے سامنے حاضر ہوں۔ امید ہے کہ آپ خوش آمدید کہیں گے۔ اتنا عرصہ نئے افق سے دوری کی

لیے رسی یہ میں ضرور بتاؤں گا۔ بات یہ ہے کہ میری ایک کہانی "میرا کہانی آفت" پاکستان کے ایک بہت ہی پیارے ماہنامے کے لیے منتخب ہو گئی تھی۔ ادارے نے اس کہانی کو سلیکٹ بھی کر لیا تھا۔ اور وہ کہانی اگلے ماہ شائع بھی ہونے والی تھی خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ وہ ماہنامہ ہی بند ہو گیا۔ اور میرا من اندر سے بہت ویران ہو گیا۔ بس اس روز سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں کتنی ہی کیوں نہ سخت محنت کر لوں۔ میرے نصیب میں ایک اچھا رائٹر بننا نہیں لکھا اور نہ ہی اس محبوب ماہنامے میں لکھنا لکھا ہے۔ جس میں لکھنے کا میرا خواب ہے اور تب سے میرا من لکھنے پڑھنے سے اکتا گیا اور میں عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کرنے اور روزگار کی فکر میں مشغول ہو گیا۔ پچھلے ڈیڑھ دو سالوں میں زندگی میں بہت سی تبدیلیاں آئیں۔ جان سے پیارے بابا جانی ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے اور وہیں چند ماہ پہلے میرا نام میری زندگی ایک شخصیت سے منسوب ہو گئی۔ میں اپنی مسز سے بے حد خوش ہوں۔ گو وہ ایک بے ادبی اور لکھنے پڑھنے سے دور دور رہنے والی لڑکی ہے۔ مگر مجھے اس کے باوجود بے حد عزیز ہے۔ میری ہر ضرورت کا خیال رکھنے والی اس کی جتنی بھی تعریف کروں بے حد کم ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نہ صرف ہم دونوں میں ذہنی ہم آہنگی ہے بلکہ میرا اور اس کا ستارہ بھی خوب ملا ہے اور میں سمجھتا ہوں شاید اسی وجہ سے خدا نے میرے رزق میں بے حد وسعت اور برکت دی ہے۔ کام تو وہی ہے سیلز مین کا مگر اب بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے۔ اب ہر روز شادی کے بعد اتنی ٹینشن بن جاتی ہے۔ جس کا میں کبھی خواب بھی نہیں دیکھتا تھا۔ میں خدا کا بے حد شکر ادا کرتا ہوں کہ میری زندگی میں میری شریک حیات کے آنے سے نہ صرف میرا آدھا ایمان مکمل ہو گیا ہے بلکہ بہت سے گناہوں سے بھی بچنے کا مجھے موقع مل گیا ہے۔ میری زندگی بہت پاکیزہ اور معتبر ہو گئی ہے۔ میں ہر وقت دعا کرتا ہوں کہ خدا کا مجھ پر اسی طرح کرم رہے اور اس کا اسی طرح ہر وقت شکر ادا کرتا رہوں۔ دوبارہ نئے افق کے صفحات پر آنے کی وجہ صرف اتنی ہے کہ [illegible] بہت چاہا کہ لکھنا پڑھنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ترک کر دوں مگر ..... مجبور ہو کر پھر نئے افق کے صفحات پر حاضر ہو رہا ہوں۔ اس بار ایک کہانی آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔ یہ وہی کہانی ہے جو شائع نہ ہو سکی تھی۔ امید ہے کہ اب آپ اسے شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ کچھ افسانے اور بھی میرے پاس موجود ہیں اس کہانی کی اشاعت کے بعد وہ بھی فوراً روانہ کروں تا کہ اس بار آپ سے اور قارئین سے بنا ہوا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برقرار رہے۔ اس دوران امید ہے کہ چھوٹی کہانیاں بھی قلم سے نکلیں گی اگر آپ کی اور قارئین کی دعا شامل حال رہی تو آخر میں ان دوستوں کا شکریہ ادا کروں گا جنہوں نے میرے بابا کے چلے جانے کی مجھ سے تعزیت کی اور میری شادی کے موقع پر مجھے مبارک باد سے نوازا۔ اب اجازت دیجیے۔ آخر میں آپ کو اور تمام قارئین کو بہت بہت سلام اور دعائیں اس بار میں اپنے کونٹیکٹ نمبرز بھی لکھ رہا ہوں۔ اگر کوئی دوست مجھ سے دوستی کرنا چاہے مجھ سے رابطہ کرنا چاہے تو میں خوشی محسوس کروں گا۔ 0345-8722370/03068722370 اپنا خیال رکھیے گا خدا حافظ۔

☆☆ (بخاری صاحب مایوسی گناہ ہے۔ آپ کا انداز تحریر بتاتا ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ سکتے ہیں آپ کی کہانی کے بارے میں کیا رائے ہے آپ جلد جان جائیں گے۔ آپ نے اپنی بیگم کو بے ذوق لکھا ہے یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ وہ باذوق ہیں اس لیے تو انہوں نے آپ کو پسند کیا۔)

محمد اسلم جاوید ..... فیصل آباد! بڑی آرزو تھی ملاقات کی ہمیشہ سلامت رہو۔ جناب مشتاق احمد قریشی صاحب۔ السلام علیکم آپ خیریت سے ہوں گے اور میں اللہ کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ چند روز ہوئے شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں بک اسٹال پر ماہ مارچ کا تازہ پرچہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا سرورق اپنی مثال آپ تھا۔ ایسا خوب صورت پرچہ نکالنے پر دلی مبارک باد قبول فرمائیں۔ ہر ماہ کے آخر پر پرچے کا بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے۔ غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ میرے دل میں سدا آپ کے لیے اچھے جذبات رہیں گے۔ یہ ایک معیاری جریدہ ہے۔ پہلے سے زیادہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے تمام سلسلے مثلاً اقرا، دستک، گفتگو، بزم سخن اور خوشبوئے سخن سلسلہ وار کہانیاں، مغربی کہانیاں اور ناقابل فراموش کہانیاں بہت بہتر ہیں۔ ذوق آگہی اور اسماء الحسنیٰ بھی خوب صورت تحریریں ہیں۔ خط سے آگہی ملاقات ہو جاتی ہے میرے چند خطوط آپ کے پاس Pending میں بڑی مدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ چند غزلیں ارسال کر رہا ہوں کسی قریبی شمارے میں شائع کر دیں۔ پچھتاوا، اسیر، ضدی فرشتہ، زہر عشق، بازی گر، گردش، [illegible] خطروں کے کھلاڑی اچھی کہانیاں تھیں۔ قلم کاروں کو میری طرف سے دلی مبارک باد ہو۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور صحت دے۔ آپ کی زندگی میں سدا خوشیوں کے پھول کھلتے رہیں۔ تحریر میں کوئی خامی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ زندگی جیسی بھی ہے بہر حال گزر جاتی ہے۔ معاشی بحران ہے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حاضر ہوں اور کوئی بات نہیں زندگی نے وفا کی تو پھر ملاقات ہوگی اس کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں نیک تمناؤں کے ساتھ۔

بشیر احمد بھٹی ..... بھاولپور. محترم عمران احمد صاحب آداب مارچ 2012ء کے نئے افق میں چند تبدیلیاں کی گئی ہیں یا آپ نے بہت ہی اچھا کیا ہے۔ پہلی تبدیلی یہ کہ فہرست میں ہر شعبہ جات کو علیحدہ کر دیا ہے۔ اس سے قارئین کو اپنے پسندیدہ مضمون تک پہنچنے میں آسانی رہے گی۔ ابتدائیہ مغربی ادب سے انتخاب متفرق سچی کہانیاں فہرست دیکھ کر سب سے پہلے صفحہ نمبر کے ذریعے اپنے پسندیدہ مضمون کو پہلے پڑھا جا سکتا ہے۔ دوسری تبدیلی بہت ہی خوب ہے۔ یعنی گفتگو میں قارئین کے جو خطوط شائع ہوتے ہیں۔ ان تمام قارئین کے نام اور شہر واضح موٹے موٹے لکھے گئے ہیں۔ اس طرح ہر قاری کو اپنا خط تلاش کرنے کے لیے عدسے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس دفعہ ٹائٹل پر کسی صنف نازک حسینہ مہ جبین کی صورت نظر نہیں آئی۔ قدرتی سینری بڑی بھلی لگ رہی ہیں۔ خالی کشتی، نیلگوں جھیل سامنے دھند میں چھپے ہوئے سر سبز پہاڑ چمکتے سورج کی کرنیں اچھی تبدیلی ہے۔ بے

شک قدرت کے حسین مناظر ہر انسان کو بہت بھلے لگتے ہیں۔ سیاح کا شوق سیاحت کے ذریعے پورا ہو جاتا ہے۔ جو لوگ سیاحت کے لیے نہیں جا سکتے وہ ایسی سینریوں کو دیکھ کر (سبحان اللہ) کہہ کر اپنے ثواب میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ آپ پلیز ٹائٹل پر خواتین کی تصویر شائع کر دیا کریں۔ مگر کبھی کبھار خوب صورت سینری ضرور شائع کیا کریں شکریہ۔ مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک ''کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں۔ پنجاب کے دل لاہور میں ڈینگی کی وبا سے مرنے والے ایک سو پچیس افراد کا شاخسانہ خلیفہ دوئم حضرت عمر بن خطاب کا فرمان نیز یہ کہ پنجاب حکومت ہو یا وفاقی حکومت دونوں نے اپنے ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔ ایک بے ضمیر انسان کے ضمیر کو بیدار کرنے والا دو صفحے کا مضمون ہے۔ خدا کرے ایسے مضامین پڑھ کے ہمارے کرپٹ حکمرانوں کی آنکھوں پر پڑا ہوا پردہ ہٹ جائے مگر ایوانوں میں بیٹھے ہوئے دولت کے پجاری بھلا کب خوف کھاتے ہیں۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب آپ کا تبصرہ پڑھا۔ پھر منگلا ڈیم ضلع جہلم سے ریاض حسین قمر کا تبصرہ پڑھا۔ شہناز بانو جی کراچی سے ان کا طویل تبصرہ پڑھا۔ ریحانہ سعیدہ لاہور' ریاض بٹ احسن ابدال' عالیہ انعام الٰہی کراچی طویل تبصرہ سید عبداللہ شاہد حیدر آباد طویل تبصرہ محمد اسلم جاوید فیصل آباد منیر احمد ساغر میاں چنوں' عصمت اقبال مین منگلا ڈیم۔ مجاہد ناز سنجر پور۔ ان کے خوب صورت تبصرے پڑھے۔ دعائے صحت کی اپیل کہانی کار محترم یعقوب جمیل پر فالج کا حملہ پڑھ کر دکھ ہوا۔ خدا ان کو صحت یابی عطا فرمائے۔ حسام بٹ صاحب اسماء الحسنٰی فہرست میں بالکل درست لکھا ہے۔ جب کہ صفحہ 20 پر عنوان اسماء الحسنٰی لکھا گیا ہے۔ اقرأ ایمان افروز سلسلہ ہے۔ اس کے صفحات بڑھا دیں۔ اخبارات میں ایسی پیاری احادیث مبارکہ شائع کرنا بے ادبی کیونکہ اخبارات کو محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ گندی نالیوں میں اخبارات اور کچرا دانوں میں پڑے نظر آتے ہیں جب کہ ڈائجسٹ پھر بھی حفاظت سے رکھے جا سکتے ہیں۔ بیت المقدس سلسلہ وار تاریخی کہانی کو الماس ایم اے صاحب بہترین طریقے سے آگے بڑھا رہے ہیں۔ بازی گر کی قسط نمبر 4 پڑھی کافی دلچسپ سلسلہ وار ہنگامہ خیز کہانی ہے۔ خطروں کے کھلاڑی آخری صفحات میں موجود ہندی ادب کا ذائقہ لیے ہوئے ہے۔ کافی سبق آموز ہے۔ مغربی ادب یعنی انگریزی ادب ترجمہ شدہ کہانیاں ضدی فرشتہ' برزخ' واپسی' زندہ سایہ پر تجسس رہیں۔ اصل میں بات یہ ہے کہ انگریزی کہانیوں میں بہت ایڈونچر ہوتا ہے۔ اپنے دیس کی بچی کہانیاں پچھتاوا' اسیر' زہر عشق بھی اچھی رہی۔ مارچ کا شمارہ پڑھ کے کافی تسکین حاصل کر لی ہے۔ اب اپریل کے شمارے کا شدت سے انتظار ہے۔

مجاہد ناز عباسی ۔۔۔ سنجر پور! محترم جناب عمران احمد السلام علیکم اسدا خوش رہو ہمیشہ پھولوں کی طرح مسکراتے رہو آمین۔ اس بار شمارہ ٹائم پر ملا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ دستک میں جناب مشتاق احمد قریشی نے بالکل سچ کہا ہے۔ گفتگو میں صدارتی کرسی ریاض حسین قمر کے نام تھی۔ ریاض بھائی کیسے ہیں آپ؟ شہناز باجی کیسے مزاج ہیں آپ کے باجی آپ کی تحریر ''گردش'' بہت اچھی ہے۔ مجھے اگلی قسط کا بے صبری سے انتظار ہے۔ ریحانہ سعیدہ نے حکمرانوں کے خلاف اپنے قلم سے بھڑاس نکالی۔ ریاض بٹ آپ کی تحریر ''زہر عشق'' مجھے بہت پسند آئی۔ عالیہ انعام الٰہی کا تبصرہ کافی بڑا تھا لیکن باجی کے لکھنے کا انداز بہت منفرد ہے لیکن باجی آپ نے کہا تھا کہ ایک بھرے خاندان میں کھانے کا مینو تیار کرنا مشکل کام ہے لیکن یہ تو ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ سید عبداللہ شاہد بہت شکریہ میری تحریر ''محبت و عشق'' پسند کرنے کا اور مجھے یاد کرنے کا محمد اسلم جاوید منیر احمد ساغر اور عصمت اقبال مین صاحبہ کو بھی محفل گفتگو میں پا کر بہت اچھا لگا۔ اس دفعہ تو ہمیں ایک نیا سلسلہ پڑھنے کو ملا ''اسماء الحسنٰی'' ''اقرأ'' میں جناب طاہر قریشی صاحب نے بہت پیاری باتیں بتائیں۔ فقیر محمد بخش لنگاہ صاحب کی تحریر ''پچھتاوا'' بہت اچھی تھی۔ نازسلوش ذشے کی تحریر ''اسیر'' بھی قابل تعریف تھی۔ بزم سخن کا سارہ انتخاب اپنی مثال آپ تھا۔ خوشبوئے سخن میں نازسلوش ذشے' ریاض حسین قمر' عبدالحکیم ساجد اور میثم علی آغا کی غزلیں پسند آئیں۔ ذوق آگہی میں ابن مقبول جاوید احمد صدیقی نے ہمیں درود پاک کی فضیلت کے بارے میں بہت اچھی تعلیم دی۔ آخر میں تمام نئے افق اسٹاف تمام نئے رائٹرز اور تمام افق پڑھنے والوں کو سلام۔

انجم فاروق ساحلی ۔۔۔ لاہور! آداب امید ہے ہر طرح سے خیریت ہوگی۔ اس مرتبہ ٹائٹل قدرتی منظر' جمیل کشتی اور سورج کے اجالے سے خوشنما اور جاذب نظر تھا۔ گہرے سندوری رنگ میں ڈائجسٹ کا نام اور سرخ شیڈ بھی خوب جا رہا تھا۔ اسے اس طرح چلنے دیا جائے۔ سینئر رائٹر ''یعقوب جمیل'' کے فالج سے بستر علالت پر جانے سے بے حد افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جلد از جلد صحت و تندرستی عطا فرماوے آمین۔ خدا خیر کرے حملہ شدید نہ ہوا تو صحت یاب ہو جائیں گے۔ کل 24 فروری سپر اسٹار میکر اور مین آف پاکستان فلم کے ڈائریکٹر جرار رضوی کو بھی ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ حالت نہ سنبھلنے پر انہیں الشفاء اسپتال سے پنجاب کارڈیالوجی اسپتال بھیج دیا گیا۔ خدا انہیں بھی تندرستی عطا فرماوے۔ دستک اور اداریہ گفتگو اس مرتبہ ملکی حالات کا جام جہاں نما تھی۔ سیاستدانوں نے ذاتی مفادات اور خود غرضی سے ملک کو بہت سے مسائل سے دو چار کر دیا ہے۔ مہنگائی' کرپشن انارکی پھیلی ہی جا رہی ہے۔ محترمہ شہناز بانو' عالیہ انعام اور سید عبداللہ شاہد کے خطوط نمایاں تھے۔ عبداللہ شاہد صاحب یاد آوری کا شکریہ فی زمانہ مہنگائی اور دوسرے مسائل کی وجہ سے رابطہ مسلسل برقرار نہیں رہتا۔ بہرحال کوشش کی جائے گی۔ زندہ سایہ' واپسی' ضدی فرشتہ' اسیر' زہر عشق' گردش اچھی تحریریں تھیں۔ قرآنی عورتیں بھی خوب تھی۔ بازی گر اور خطروں کا کھلاڑی زیر مطالعہ ہیں سیما کاش' نلاری کی نظم پکار ارض فلسطین اچھی کاوش تھی۔ کوہر تاباب اور کرن بھی اچھی آزاد نظمیں تھیں۔ عمران صاحب! آنچل میں نئے افق کا جو اشتہار آ رہا ہے اس میں اب تک پکار اور ہالہ کھلاڑی کہانی کے نام آ رہے ہیں اب اسے تبدیل کر دیں۔ بیت المقدس میں حضرت [illegible] کے محمد حسین ہیکل نے عمر فاروق اعظم میں بھی تحریر کیے ہیں۔ البتہ ضخیم کتاب کی

اس لیے پوری تفصیل اور جزئیات کے ساتھ اس مسئلے کو ڈسکس کیا گیا تھا۔ قاتل کی تلاش شائع کرنے کا شکریہ۔ فیملی میگزین میں میر اشکاری کے نام سے شکاریات کا ناول تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔

ریاض بٹ ۔۔۔ حسن ابدال! السلام علیکم نئے افق کا ماہ مارچ 2012ء کا شمارہ جونہی بک اسٹال پر نظر آیا۔ خرید کر گھر لے آئے۔ سرورق اس بار [illegible] اور منظر دلکش۔ قدرتی مناظر کا اپنا ہی ایک رنگ ہوتا ہے۔ مشتاق احمد قریشی صاحب دستک میں اس بار ڈینگی کی وبا کے متعلق بتا رہے تھے۔ [illegible] جو جانیں ضائع ہوئی ہیں اور ہو رہی ہیں ان کا لہو کس کے ہاتھ پہ تلاش کیا جائے [illegible] پیاری محفل گفتگو کی طرف پہلا خط ریاض حسین قمر کا ہے۔ آپ کا پوچھے پر تبصرہ اچھا لگا [illegible] اور ہونٹوں کی چاندی ہے۔ بہن شہناز بانو اب تو آپ کا گلہ دور ہو گیا ہوگا۔ اصل میں [illegible] شروع میں [illegible] قسطیں نہ پڑھی جائیں۔ اس بار کی قسط بھی پسند آئی۔ آپ کی طرح میں بھی [illegible] کرتا ہوں کہ محفل میں آ جائیں۔ سب بہن بھائی آپ کی کمی شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ بقول شاعر

فریاد کر رہی ہے ترسی ہوئی نگاہ
دیکھے ہوئے کسی کو بہت دن گزر گئے

شہناز بہن میری کہانی تلاش مجرم پسند کرنے کا بے حد شکریہ اب باری آتی ہے عالیہ انعام بہن کی۔ آپ کا خط ہمیشہ کی طرح مفصل اور جامع ہے لفظوں کی مالا بنانا آپ کو خوب آتا ہے۔ آپ کے خیالات واقعی اچھے ہیں۔ میرا انداز تحریر اور کہانیاں پسند کرنے پر یہ بندۂ ناچیز مشکور و ممنون ہے۔ تفتیشی کہانیوں کو جس طرح لکھنا چاہیے اسی طرح لکھنے کی سعی کرتا ہوں۔ سید عبداللہ شاہد میری تحریریں آپ کے ذوق پر پورا اتر رہی ہیں یہ بات میرے لیے طمانیت اور راحت کا باعث ہے۔ منیر احمد ساغر محفل میں خوش آمدید اب یہ سلسلہ جاری رکھنے کی سعی کیجیے گا۔ میری تحریر کردہ تفتیشی کہانیوں پر آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ عصمت اقبال کی حاضری بھی محفل کی شان بڑھا رہی ہے۔ مجاہد ناز بھائی جو عوام سانپ سے ڈری ہوئی ہے وہ رسی سے بھی ڈر رہی ہے۔ آپ کی بات مجھے بری نہیں لگی۔ دراصل مجھے عمران خان صاحب سے صرف اتنا گلہ ہے کہ وہ فصلی بیٹروں کو اپنے ارد گرد جمع کر رہے ہیں۔ جو مخلص اور بے لوث لوگ (ہر حلقے سے) کئی سالوں سے عمران صاحب کے ساتھ ہیں۔ ان کا کیا ہوگا۔ جو مفاد پرست لوگ تحریک انصاف میں شامل ہو رہے ہیں۔ اگر ان کو ٹکٹ نہ دیا گیا تو؟ خیر اس بحث کو جانے دیں میری کہانی تلاش مجرم پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ ویسے عمران خان فائٹنگ کپتان تھے۔ میں ان کا فین ہوں۔ دیرینہ اور سینئر قلم کار محترم یعقوب جمیل کے لیے یہ بندۂ ناچیز دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہے کہ خدا بزرگ و برتر انہیں صحت کامل عطا فرمائے آمین۔ حسام بٹ کی اسماء الحسنٰی ہمارے دلوں کو قوت ایمانی سے منور کر رہی ہے۔ یہ ایک اچھا اور قابل تعریف سلسلہ ہے۔ جس کے لیے نئے افق کی پوری ٹیم تعریف کے قابل ٹھہری ہے۔ طاہر قریشی صاحب کی اقرأ سونے پہ سہاگہ کا کام دے رہی ہے۔ اب بات ہو جائے باقی تحریروں کی الماس ایم اے کی بیت المقدس کی یہ قسط بھی بہت اچھی اور معلوماتی ہے۔ اس بار فقیر محمد بخش لنگاہ کی تحریر کردہ سچی کہانی پچھتاوا دوہرے کی زینت بنی ہے۔ محترم تیمیر اجیسی لڑکیاں اس طرح گھروں کو تباہ کرتی ہیں اور انجام کار اسی طرح قتل ہوتی ہیں۔ لگتا ہے سچی کہانیوں پر آپ کی گہری نظر ہے۔ اسیر نازسلوش ذشے کی ایک خیالی کہانی [illegible] ان خطروں کے کھلاڑی (اے حمید) کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ بہت اچھی جا رہی ہے یہ کہانی۔ انجم فاروق ساحلی [illegible] ہو جائے مغربی ادب سے منتخب کہانیوں [illegible] کی میں تمام انتخاب اچھا ہے۔

عبدالحکیم ساجد ۔۔۔ منڈی امام محترم جناب [illegible] مشتاق احمد قریشی و عمران احمد قریشی! آداب امید ہے کہ آپ بمع اسٹاف [illegible] کہ آپ کے درجات بلند فرمائے اور نئے افق کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے آمین۔ اب آتے ہیں [illegible] کی طرف مارچ 2012ء کا نئے افق نئی توانائیوں اور بھرپور رعنائیوں کے ساتھ ملا۔ اس دفعہ کے سرورق نے تو دل [illegible] دیا۔ کیا دلکش وادیٔ کشمیر کا منظر لیا گیا تھا۔ بہت خوب صورت انتہائی جاذب۔ فہرست کو بھی ٹکڑوں میں بانٹ کر سجایا گیا تھا۔ اس دفعہ کچھ نئے نام بھی دیکھنے کو ملے۔ ''دستک'' میں مشتاق صاحب جی نے بہت اچھا لکھا۔ وہ بھی انصاف کی دہلیز پر اپنا کشکول لیے کھڑے لوگوں کی حالت زار پر بیان کر رہے تھے۔ ''گفتگو'' کے ابتدائیے میں عمران بھائی نے بھی ہمیں اپنا عکس دیکھنے کے لیے ٹینڈل کی طرف متوجہ کیا۔ ریاض حسین قمر جی ٹاپ پر تھے مبارک ہو۔ جی ہم آپ کو یاد نہ کریں تو ہمارے آنے کا مقصد یاد آوری کا شکریہ۔ ہر دل عزیز محترمہ شہناز بانو جی آپا جی ہم ناراض تو نہیں ہیں بس کچھ مصروفیات کی وجہ سے حاضر ہونے میں دیر ہو گئی اور شکایت [illegible] آپ سے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اصل میں ہمارے بھائی امیر حمزہ جی آپ شعری مجموعہ منظر عام [illegible] میں مصروف ہیں۔ دوسری طرف احمد علی کیف جی بھی بڑے بڑے شعرا کرام سے ملاقاتوں میں لگے ہوئے ہیں لیکن اب آپ کی شکایت دور کرنے کا وقت آ ہی گیا اور امید ہے اس دفعہ آپ کو ہماری حاضری پر بھی خوشی محسوس ہوگی۔ تمام تبصرے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ سید

مورخہ 24-01-2012 ہوئی۔ سرورق سے گزر کر جو تازگی ملی اس پر دل سے یہ آواز نکلی کہ اے ابر کرم آج اتنا برس اتنا برس کہ وہ جا نہ سکیں۔ مبارک باد۔ ماڈل واشتہارات بس واجبی سے تھے۔ لسٹ مضامین کی کلیہ تعداد 20 رہی۔ جس میں طرح طرح کے موتیوں کو پرو کر ایک لڑی بنائی ہوئی تھی اور اس لڑی میں ایک موتی (پچھتاوا) والد محترم کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ جس پر ہم سب اہل خانہ لنگاہ فیملی آپ کے دل سے شکر گزار ہیں۔ دستک دل کی آواز اور سبق آموز رہی کہ سوچو دستو کہ کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں۔ گفتگو میں عمران صاحب وقارئین بہن بھائیوں عزیزوں دوستوں کے سنگ۔ اعلامیہ میں جن باتوں کا ذکر ہوا ان کو سن و پڑھ کر آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہم سب مسلمان ہو کر ایک دوسرے کے ساتھ کیا کر رہے ہیں۔ اس پر صرف دعا ہے کہ اللہ پاک ہم سب کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق دے اور شیطان سے راہ نجات دے آمین۔ محترم حسام بٹ صاحب کی تحریر تحقیق کا سلسلہ اسماء الحسنیٰ شروع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ پسند آیا۔ صفحات کو بہت کم جگہ دی گئی۔ جس سے پیاس بجھائی نہیں جا سکتی الٹا بڑھ جاتی ہے غور ضرور کرنا۔ صدارتی کرسی پر ریاض حسین قمر صاحب مبارک باد قبول فرمائیں۔ فقیر محمد بخش لنگاہ کی عزت افزائی کا شکریہ۔ انسان کا دل ایک شیشہ ہے جو خود ہوتا ہے وہی اس کو دوسرا نظر آتا ہے۔ برادرم شکریہ دعائیں آپ کے نام ہیں۔ عزیزی بہن شہناز بانو صاحبہ سدا مسکراؤ اور اپنے اہل خانہ بچوں پوتوں پوتیوں میں آباد و شاد رہو۔ بہت دل خوش کر دیا آپ کے انداز بیان نے محفل گفتگو کے سنگ مبارک ہو۔ دیگر سلسلہ وار داستان گردش میں بھی آپ نے موتی پرو کر دل خوش کر دیا۔ قسط پسند آئی اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ باقی پیاری بہن آپ کی دلی دعاؤں کا متمنی ہوں اور اللہ پاک نے جس بھی رنگ و حال میں رکھا ہوا ہے۔ اس پر اس کا شکر گزار ہوں۔ برادر جناب ریاض بٹ صاحب کی تحریر نے دل خوش کر دیا۔ بٹ صاحب خداوند کریم آپ کو خوش و خرم رکھے۔ آپ کے ہر ہر لفظ نے ہمارے لیے خوشیاں بکھیر دیں۔ صاحبزادی عالیہ انعام الٰہی صاحبہ نے اپنے انداز و بیان میں خوب صورتی بکھیر دی اور خوب سے خوب تر حاضری محفل دی۔ دل خوش کر دیا اور محبت خداوند کریم کا گھر ہے۔ جس میں سے کچھ حصہ آپ کو ملا شکر کیا کریں۔ دعا گو ہوں۔ محترم سید عبداللہ شاہد صاحب کے بھرپور تبصرے نے دل خوش کر دیا۔ مجاہد ناز عباسی صاحب نے خوش کن حاضری دی۔ عصمت اقبال مین صاحبہ آپ کے بہت کم لکھنے نے ہی خوش کر دیا۔ محفل میں بھرپور انداز میں شریک ہوں تا کہ آپ کی لکھی گئی تحریر کا کوئی بھی لفظ ہمارے لیے سبق بن سکے۔ ریحانہ سعیدہ صاحبہ اور محمد اسلم جاوید صاحب نے بھی خوب سے خوب تر حاضری دی شکریہ دعا گو ہوں آپ کے لیے سائیں اور عقیل میاں چنوں کے منیر احمد ساغر صاحب کا کم لکھنا ہی ہمارے لیے خوش آمدید کے باعث دبا برخوردار قدم سے قدم بڑھا کر چلو اور خوشیاں و کامیابیاں آپ کے ساتھ ہوں دعا ہے۔ سچ بیانیوں میں قرآنی عورتیں (مجاہد لکھنوی) قاتل کی تلاش (انجم فاروق ساحلی) اسیر (ناز سلوش ذشے) سبق آموز تحریریں رہیں۔ مصنفین کو ہماری طرف سے مبارک باد کا پیغام اقرا جناب طاہر احمد قریشی صاحب اور نیا سلسلہ اسماء الحسنیٰ حسام بٹ صاحب دل سے پڑھی جانے والی سبق آموز دینی تحریریں فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مصدق رہے۔ آئندہ کا انتظار رہے گا۔ شکریہ دعائیں۔ سلسلہ وار روحانی تاریخی سلسلہ بیت المقدس (الماس ایم اے) بازی گر (حسام بٹ صاحب) شہناز بانو (گردش) اور محترم اے حمید صاحب کی سلسلہ وار داستان "خطروں کے کھلاڑی" مصنفین نے تیزی اور میلان کو برقرار رکھا۔ خوابوں کی دنیا میں ڈبو دینے والے سلسلے رہے۔ جن کے مطالعہ سے سبق حاصل ہوتا ہے۔ تاریخ سے آشنائی ہوتی ہے۔ بزم سخن خوشبوئے سخن ذوق آگہی جن کی سجاوٹ اور مقابلے کے میدان کو صحت بخشی۔

محمد ارشاد قریشی ــــ اسلام آباد ہمارے ارض پاک میں اس وقت جو حالات ہیں اس پر جناب مشتاق احمد قریشی صاحب اور عمران احمد قریشی صاحب بہت کچھ لکھتے ہیں۔ جس میں اصلاح کے بہت سارے پہلو ہیں۔ اگر کوئی کچھ تو۔ مگر ہمارے حکمران تو کچھ بھی سننے پر تیار نہیں۔ عوام کس حال میں ہے۔ انہیں کچھ خبر نہیں گیس بجلی اور مہنگائی نے تو عوام کا برا حال کر دیا ہے۔ نہ جانے کب وہ وقت آئے گا۔ جب عوام خوشحال ہوں گے۔ ابھی تو روز بروز برے سے برا حال ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ روٹی کو ترس رہے ہیں ۔۔۔ گیس ہے نہ بجلی ہے اور ۔۔۔ لوٹ مار اور بدامنی نے پوری کر دی ہے۔ ہمارے پاس بہت بڑا آسرا دعا کا ہے۔ اور مالک کائنات سے دعا گو ہوں کہ وہ ہمارے گناہوں کو معاف کر دے اور ہم سب کے لیے آسانیاں پیدا فرما دے۔ ہمیں وہ حکمران دے جن کو ہماری اور ہمیں ان کی فکر ہو آمین۔ مارچ کا شمارہ خوب صورت سرورق کے ساتھ میرے سامنے ہیں۔ 4 دن سے زیر مطالعہ ہے۔ سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کیا لکھوں۔ لکھنے والوں نے کمال کر رکھا ہے۔ فقیر محمد بخش لنگاہ (پچھتاوا) ناز سلوش ذشے (اسیر) شہناز بانو (گردش) بہت خوب آپ تینوں کی کہانیاں بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ ریاض بٹ (زہر عشق) الماس ایم اے (بیت المقدس) حسام بٹ (بازی گر) دونوں لکھاری بہت خوب لکھ رہے ہیں۔ مجاہد لکھنوی نے قرآنی عورتیں بہت خوب لکھا۔ امید کرتا ہوں کہ آپ مزید اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔ اسماء الحسنیٰ حسام بٹ نے جو نیا سلسلہ شروع کیا ہے بہت اچھا لکھا گیا۔ اللہ پاک حسام بٹ اور مجاہد لکھنوی کو اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔ ریاض حسین قمر آپ کا بہت شکریہ کہ آپ کو میرا انتخاب اچھا لگا۔ میری طرف سے آپ کو بیٹے کی شادی اور بہو کی آمد مبارک ہو۔ ۔۔۔ شہناز بانو آپ کا شکریہ ۔۔۔ اللہ پاک کی عنایت اور آپ کی دعا کی قبولیت کا اثر ہے کہ میں صحت و تندرستی کی طرف واپس آ رہا ہوں۔ غزل پسند کرنے کا شکریہ۔ بھائی سے ملاقات ۔۔۔ آپ کی۔ ریاض بٹ آپ کا شکریہ آپ نے یاد رکھا۔ سید عبداللہ شاہد، عصمت اقبال مین، مجاہد ناز عباسی آپ کا شکریہ کہ آپ نے یاد رکھا اور غزل کو پسند کیا۔

تحریریں قابل ستائش کی گئی تھیں۔ انجم فاروق ساحلی کی "قاتل کی تلاش" سازشی اور سیاسی ۔۔۔ ایک عمدہ کہانی تھی۔ ساحلی تم نے ۔۔۔ اور جلال خان کو مجرموں کی حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ لیکن اختتام میں تم نے ان کے خلاف ۔۔۔ کی اور ڈپٹی اور خان صاحب کو صاف بچالیا کیوں بھلا اور جرائم پیشہ گروہ کے سرغنہ کے چہرے مہرے اور نام گرامی سے پردہ نہیں اٹھایا۔ بہر حال اسموس اور اسیر حال گر ۔۔۔ اپنے ایکشن تھرل اور ٹریلنگ پوائنٹس کی وجہ سے اپنی دھاک بٹھانے میں کامیاب رہی۔ قرآنی عورتیں جسے مجاہد لکھنوی نے قلم بند کیا۔ اسلامی تاریخ کے سنہری ابواب سے بیان عظیم المرتبت مسلمان خواتین ۔۔۔ کا تذکرہ تھا آج کی خواتین کو ان عظیم عورتوں کی بڑھ کر تقلید کرنا چاہیے۔ سلسلے وار ناول میں بیت المقدس کا تازہ حصہ پڑھا۔ حضرت عمر ۔۔۔ ارض مقدس کے انتظام و انصرام سے آگہی ہوئی حضرت خالد بن ولید کے ساتھ ان کا مکالمہ جلیل القدر صحابی کے دور حکمرانی کی روشن ۔۔۔ مثالی دستاویز بھی۔ اگر نئے افق میسر نہ آتا تو بیت المقدس کے معروضی حقائق سے شائد ہی باخبر ہو پاتا۔ خطروں کے کھلاڑی میں جناب ۔۔۔ لطیف اور پر مذاق پیرائے سے عظیم ہندوستان کے چھوٹے بڑے شہروں اور جنگلات کی سیر کروا رہے ہیں اور ہمیں مسحور کیے دیے ہے ۔۔۔ شہناز بانو گردش میں اور حسام بٹ بازی گر میں اپنے مشاق قلم کا جادو جگا رہے ہیں۔ محترم حسام بٹ نے اسماء الحسنیٰ کے عنوان سے اللہ تعالیٰ کے ۔۔۔ ناموں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے۔ ان کی شخصیت کے اس رخ نے چونکا دیا ہے۔ بہر کیف یہ سلسلہ اچھا لگا۔ امید ہے کہ اس کی برکت سے نئے افق کی آن بان میں اضافہ ہوگا۔ اس بار خطوط کی محفل گفتگو میں ریاض حسین قمر مسند اول کے حق دار ٹھہرے۔ مبارک ہو قمر صاحب۔ اللہ عزوجل آپ کو اور آپ کے اہل خانہ کو بھی خوشیوں سے شاد و آباد رکھے آمین۔ عدالت کی کوتاہی کے باوجود آپ نے تبصرہ پسند کیا بے حد شکریہ۔ محترمہ شہناز بانو صاحبہ نے بھرپور تبصرے کے ساتھ محفل میں موجود تھیں۔ بجیا آپ نے مکمل کہانیوں کے جواب میں اپنی مجبوری بیان کی ہے۔ مگر ساتھ ہی شمی ارشاد کی تحریروں کو میرے لیے ریفر کیا ہے۔ شمی کو میں روز اول سے پڑھتا آیا ہوں۔ محترمہ کی چند معرکتہ الآرا کہانیاں میرے دل پر انمٹ نقوش کی مانند ثبت ہو چکی ہیں اور مجھے اپنے یادگار کلائمکس کی وجہ سے ازبر ہیں۔ پچھلی بار شمی جی نے "حقیقی مسرت" لکھ کر خود کو منوالیا تھا لیکن بجیا یہ لکھتے لکھتے چھٹی کر جاتی ہیں۔ اب دیکھیے نا اس مرتبہ محترمہ شمی صاحبہ اپنی پر مغز اور خوب صورت کہانی لے کر نہیں دکھائی دے رہی ہیں۔ قرآنی آیات کی روشنی میں انہوں نے جو تحریر لکھی تھی وہ مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ میں نے تبصرہ کیا تھا مگر شمی جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس مرتبہ ان کا تبصرہ بھی نظر نہیں آیا۔ میں تلاش کرتا رہ گیا۔ اور پھر دل مسوس کر رہ گیا۔ اب بجیا آپ ہی بتائیے کہ شمی ارشاد کہانیاں لکھنے سے کیوں گریز کر رہی ہیں؟ ریاض بٹ اور ریحانہ سعیدہ کے بند ے بھرپور اور خوب صورت لگے۔ محترمہ عالیہ انعام الٰہی نے اس دفعہ اپنے تبصرے میں جن قیمتی خیالات کا اظہار کیا انہیں پڑھ کر اس بات کی تسلی و تشفی ہو گئی کہ میں نے عالیہ جی سے جو گلے شکوے کیے تھے اور ان کی پر حکمت اجارہ داری کی وجوہات دریافت کی تھیں وہ بالکل درست اور حدود میں رہتے ہوئے پوچھی تھیں۔ خلاف توقع عالیہ جی نے جس فراخ دلی سے جواب دیا ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بھائی عمران احمد دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ فقط دعا گو۔

منیر احمد ساغر ــــ میاں چنوں السلام علیکم امید ہے کہ آپ سمیت نئے افق کا تمام اسٹاف اور قارئین کرام بخیریت ہوں گے۔ اس ماہ نئے افق کا تازہ شمارہ 28 تاریخ بروز منگل مارکیٹ سے مل گیا۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی کی حقیقی باتیں پڑھیں۔ پھر گفتگو کی محفل میں حاضری دی۔ باجی شہناز بانو صاحبہ کا خط پڑھا۔ واقعی آپ نے محمد اسلم جاوید صاحب سے ٹھیک کہا۔ تبصرہ کرنا مشکل نہیں ہے۔ بس سچائی کے ساتھ جو محسوس کریں وہی لکھ دیں۔ ویسے ہم آپ کی رائے سے پوری طرح متفق ہیں کہ عمران صاحب کو نئے افق کو خوفناک نمبر یا پر اسرار نمبر ضرور نکالنا چاہیے آپ کی کہانی گردش گزشتہ تحریوں کی طرح بہت ہی خوب اور بہترین کہانی ہے۔ امید ہے کہ کہانی اگلی اقساط میں تحیر اور ایکشن کے سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی نظر آئے گی۔ دیگر قارئین کے مختصر اور طویل خطوط پڑھنے کے بعد کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ اے حمید کی "خطروں کا کھلاڑی" شہناز بانو کی "گردش" حسام بٹ کی "بازی گر" الماس ایم اے کی "بیت المقدس" "زندہ سایہ" "ڈاکٹر وجاہت علی خان" "برزخ" "نسیم سحر" "زہر عشق" ریاض بٹ اور "ضدی فرشتہ" ابوضیا اقبال کی کہانیاں پڑھی ہیں۔ ۔۔۔ کی سب بہت اچھی لگی ہیں۔ بقیہ کہانیاں ابھی پڑھی نہیں ہے۔ امید ہے کہ وہ بھی بہت بہتر اور اچھی ہوں گی۔ غزلوں میں محمد اسلم جاوید، قمر جہاں، ۔۔۔ اور شہناز بانو کی شاعری پسند آئی۔ حسن اختر، فقیر محمد بخش صابر لنگاہ اور محمد آشان کا انتخاب بھی اچھا لگا۔ آخر میں ہماری طرف سے یعقوب جمیل صاحب کے لیے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے آمین۔ ان کی بیماری کا سن کر بے حد افسوس ہوا۔ ان کی بیشتر سلسلے وار کہانیاں ابھی تک یادگار ثابت ہوئی ہیں۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ آپ سب کے لیے دل سے دعا گو ہوں۔

الاسماء الحسنیٰ

ادارہ

یوں تو اللہ تبارک تعالیٰ کے اَن گنت صفاتی نام ہیں جن میں سے بیش تر کا علم صرف اسی عَلِیْمُ الْخَبِیْرِ کو ہے۔ قارئین کی آسانی اور سہولت کے پیشِ نظر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک مستند روایت کو بنیاد بنا کر ماہ نامہ "نئے افق" کے لیے اس تعمیری و اصلاحی اور دنیا و آخرت کے معاملات کے لیے یکساں مفید سلسلے کا آغاز کیا جارہا ہے۔

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ تسعہ و تسعین اسماما ئتۃ الا واحدا من احصاھا دخل الجنۃ.

ترجمہ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم سو نام ہیں۔ جس نے ان ناموں کو محفوظ کیا اور ان کی نگہداشت کی وہ جنت میں جائے گا۔

"نئے افق" کے ان صفحات پر قادرِ مطلق کے انہی ننانوے یعنی ایک کم سو اسماء الحسٰنی کا تذکرہ ہوگا۔ اپنی جائز اور نیک حاجات کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس کے صفاتی ناموں سے پکارنا اور اس ذات پاک کی رحمتوں، برکتوں اور نعمتوں سے فیض یاب ہونا عبادت کا درجہ رکھتا ہے اور ہر عبادت کے بعد دعا کرنا ایک لازمی عمل ہے۔ حدیث کے مطابق "دعا" ہر نوعیت کی عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کی تفصیل اور تشریح سے قبل دعا کے معاملے پر روشنی ڈالنا نہایت ہی اہم اور ضروری ہے۔ ان لطیف روحانی تقاضوں کو پورا کیے بغیر دعا کی قبولیت کی امید رکھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی پودے کو پانی کی جگہ تیزاب پلائیں اور اس سے پھر بھی خوش ذائقہ پھل یا خوش نما پھول کی توقع رکھیں۔ اگر درج ذیل راہ نما اصولوں کی حرمت کا پاس کرتے ہوئے دعا کی جائے تو اسے روح الامین کے پَر لگ جاتے ہیں۔

دعا مومن کا ہتھیار، عبادت و بندگی کا نچوڑ، دل دردمند کا درماں اور قلب مضطرب کا سہارا ہے۔ جب سارے ظاہری سہارے جواب دے جائیں تو قعات کے روزن اور امیدوں کے دریچے بند ہو جائیں تمنا کی ہری شاخ، حسرتوں کے بے رنگ کانٹے کا روپ دھار لے ہر سمت اندھیرا چھا جائے مایوسی کے اس عالم میں بندۂ مومن کے پاس ایک دعا ہی کی قندیل رہ جاتی ہے وہ ہاتھ اٹھاتا ہے رب کی بارگاہ میں جاتا ہے لجاجت کے ساتھ گڑگڑاتا ہے۔ فلک سے رحم لانے اور بخشش پانے کے لیے اس کے والہانہ نالے اٹھتے، اس کی آہیں بلند ہوتی، اس کے اشک رواں رہتے اور اس کی فریادی نوائیں نکلتی ہیں۔ اس کے من میں اپنے کرتوتوں، شیطان کے چرکوں، نفس کے زخموں کی کسک کا احساس تازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں جھوٹے خداؤں سے توقعات کی حماقتوں زمانے کے بے وفائیوں، راستہ کی صعوبتوں، منزل کی دشواریوں اور زندگی کی شکایتوں کا درد جاگ اٹھتا ہے۔

دعاؤں میں ہر ضرورت اور ہر بھلائی کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ہر طرح کی پریشانی سے نجات کے لیے وظیفہ سکھایا گیا ہے۔ ہر مقام کی مناسبت سے ذکر کی تلقین کی گئی ہے۔ یہ اس قدر بابرکت دعائیں ہیں کہ اگر آدمی ان کا اہتمام کرلے تو اس کے شب روز کی ساری ساعتیں اللہ کے ذکر و مناجات سے معطر معطر ہو جائیں گی۔

بعض نادانوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ دعا کر کے تھک گئے قبول ہی نہیں ہوتی۔ یہ غلط فہمی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس دربار میں کوئی صدا رائیگاں نہیں ہوتی، اگر مصلحت کی وجہ سے کوئی دعا قبول نہیں ہوتی تو آخرت کے لیے ذخیرہ کر دی جاتی ہے یا اس کے عوض آنے والی کوئی آفت ٹال دی جاتی ہے اور یا قبول تو ہو جاتی ہے لیکن مصلحتاً اس میں تاخیر کر دی جاتی ہے۔

اللہ

معانی: معبودِ حقیقی (ذاتی نام)

تاثیر: اسمِ ذات

اعداد: 66

مفرد عدد: 3

ہ	ل	ل	ا
5	30	30	1

ورد: یا اللہ

فضائل و ظائف۔

☆ جو شخص جمعہ کے دن 200 مرتبہ "یا اللہ" پڑھے گا اس کی ہر مشکل آسان ہوگی اور ہر قسم کے مرض سے صحت پائے گا۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذاتِ عالی ایک ایسی لافانی اور ٹھوس حقیقت ہے جو کائنات کے ذرّے ذرّے سے ظاہر ہو رہی ہے انسان اگر تھوڑی سی بھی توجہ دے اور غور و فکر کرے تو اسے اپنے اردگرد پھیلی اللہ تعالیٰ کی لاکھوں نعمتیں نظر آ رہی ہوتی ہیں جن پر وہ سوچتا تک نہیں۔ چھوٹی چھوٹی نعمتوں اور انعاماتِ الٰہی کے علاوہ خود انسانوں کا ایک عالم ہے جنوں کا ایک عالم ہے، حیوانات و نباتات کا اپنا ایک عالم ہے، جمادات و مائعات کا ایک عالم ہے جن کی مختلف اقسام و خصوصیات ہیں جو اپنی جگہ مکمل دلیل کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ ایک بڑی اہم اور واضح حقیقت ہے کہ اس کائناتِ ارض و سماء کا وجود خود اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر جو ان سب کا خالق و مالک ہے گواہی دے رہا ہے۔ جو لوگ اپنے تجسس کے ہاتھوں یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں اللہ کون ہے؟ کیسا ہے اور کہاں ہے؟ انہیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کی ذاتِ عالی وہ ذات ہے جو تمام کمالات اور علوم کا [illegible] ہی نہیں منبع و محور بھی ہے اسی ذاتِ عالی کو ہر چیز پر ہر طرح سے پوری پوری قدرت حاصل ہے وہی ذات ہر کام کرتی ہے، دیکھتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے ہر چیز کے ظاہر و باطن سے وہ پوری طرح باخبر اور [illegible] نے تخلیق کی ہے وہی خالق [illegible] مالک ہماری ہر قسم کی عبادات و ریاضت کا حق دار بھی وہی ہے۔

"اللہ" واحد معبودِ حقیقی، خالق و مالکِ کائنات ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ جب ساری کائنات کا ایک ایک ذرہ جو اس خالق و مالک کی تخلیق ہے، فنا ہو جائے گا، مر جائے گا تب بھی وہ ذاتِ واحد زندہ اور موجود رہے گی۔ "اللہ" اس معظم ترین ہستی کا نام ہے جو تمام عالموں کو پالنے والی، اس کی ہر طرح سے نگہداشت کرنے والی ہے اس کی ذاتِ عالی شان سے زمین و آسمان ہی نہیں بلکہ پوری کائنات منور ہے۔ قرآن حکیم میں لفظ اللہ جو اسم ذاتِ الٰہی ہے۔ ۲۶۹۷ مرتبہ آیا ہے اس لفظ "اللہ" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی حرف الگ کر دیا جائے تب بھی اس کے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ لفظ اللہ سے اگر حرف الف الگ کر دیا جائے گا تب بھی معنی میں فرق نہیں آئے گا اور الہ سے بھی اگر الف الگ کر دیا جائے تو "لہ" رہ جائے گا ان تمام حالتوں کے باوجود اللہ تبارک و تعالیٰ کے اسمِ ذات میں اس کے نام کی پاکی اور اطلاع موجود رہتی ہے۔ یہ صرف اسی لفظ "اللہ" کی خصوصیت و خوبی ہے۔ اس کے معنی اس ہستی کے ہیں جس کی پرستش کی جائے۔ لفظ اللہ قرآنِ کریم میں جگہ جگہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ عرب میں اللہ کی ذات کے لیے استعمال ہوتا رہا ہے۔

لفظ "اللہ" اسمِ ذات کے طور پر آیا ہے، یوں تو اللہ تعالیٰ کے بے شمار صفاتی نام ہیں جبکہ یہ نام تمام صفاتِ الٰہی پر حاوی ہے۔

دنیا کی کسی بھی زبان میں اللہ کی ہستی کا مفہوم دینے والا ایسا کوئی لفظ نہیں ہے، عربی میں یہ لفظ کسی اور ہستی کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ ایسے ہی کلمہ طیبہ کے پہلے حصے "لا الٰہ الا اللہ" کے تمام حروف اور الفاظ اسی لفظ اللہ سے نکلتے ہیں۔ یہ بھی اس لفظ کی خاصیت و جامعیت ہے۔

♥

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی

(تشریح) اس حدیث میں اہل جنت کی صفت "ضعیف متضعف" بتلائی گئی ہے اس سے مراد وہ ضعف و کمزوری نہیں ہے جو قوت و طاقت کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے کیونکہ وہ ضعف و کمزوری کوئی قابل تعریف صفت نہیں ہے بلکہ ایک حدیث میں تو صراحتہً فرمایا گیا ہے کہ "............." (صحیح مسلم) (طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور محبوب ہے) بلکہ جیسا کہ ترجمہ میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہاں ضعیف و متضعف سے مراد وہ شریف الطبع متواضع اور نرم خو شخص ہے جو معاملہ اور برتاؤ میں عاجزوں اور کمزوروں کی طرح دوسروں سے دب جائے اور اس لیے لوگ اسے کمزور سمجھیں اور دبا لیا کریں ...... اسی لیے اس حدیث میں ضعیف و متضعف کے مقابلہ میں متکبر کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ بہرحال حدیث کا حاصل یہ ہے کہ تواضع و نرمی اور عاجزی اہل جنت کی صفت ہے اور غرور و استکبار اور اکھڑپن دوزخیوں کے اوصاف ہیں۔

اس حدیث میں جنتیوں کی صفت میں "ضعیف متضعف" کے ساتھ ایک بات یہ بھی فرمائی گئی ہے کہ اگر وہ بندہ اللہ پر قسم کھالے تو اللہ اس کی قسم پوری کردے۔ بظاہر اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس طرح اشارہ فرمانا ہے کہ جب کوئی بندہ اللہ کے لیے اپنی خودی کو مٹا کر اس کے بندوں کے ساتھ عاجزی اور فروتنی کا رویہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ اتنا مقرب ہوجائے گا کہ اگر وہ قسم کھالے کہ فلاں بات یوں ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کی لاج رکھے گا' اور اس کی بات کو پورا کرو کھائے گا' یا یہ کہ اگر وہ بندہ کسی خاص معاملہ میں اللہ کو قسم دے کر اس سے کوئی خاص دعا کرے گا' تو اللہ اس کی دعا ضرور قبول کرے گا۔

(۲۲۱)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا۔ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا۔ (مسلم و بخاری)

(تشریح) کبریائی اور بڑائی دراصل صرف اس ذات پاک کا حق ہے جس کے ہاتھ میں سب کی موت و حیات اور عزت و ذلت ہے' جس کے لیے کبھی فنا نہیں اور اس کے علاوہ سب کے لیے فنا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:۔

اور اسی کے لیے کبریائی اور بڑائی ہے ..... آسمانوں میں اور زمین میں' اور وہی ہے زبردست اور حکمت والا۔

پس اب جو بر خود غلط انسان کبریائی اور بڑائی کا دعویدار ہو اور اللہ کے بندوں کے ساتھ غرور و تکبر اس کا رویہ ہو' وہ گویا اپنی حقیقت بھول کر اللہ تعالیٰ کا حریف بنتا ہے' اس لیے وہ بہت ہی بڑا مجرم ہے' اور اس کا جرم نہایت ہی سنگین ہے اور اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا ہے کہ اپنی اس فرعونی صفت کی وجہ سے وہ جنت میں نہ جاسکے گا۔

یہ اصولی بات پوری تفصیل سے پہلے واضح کی جاچکی ہے کہ جن حدیثوں میں کسی بدعملی یا بداخلاقی کا انجام یہ بتایا جاتا ہے کہ اس کا مرتکب جنت میں نہ جاسکے گا' ان کا مطلب عموماً یہ ہوتا ہے کہ یہ بدعملی یا بداخلاقی اپنی اصل تاثیر کے لحاظ سے جنت سے محروم کردینے والی اور دوزخ میں پہنچانے والی ہے۔

یا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس کے مرتکب سچے ایمان والوں کے ساتھ اور ان کی طرح سیدھے جنت میں نہ جاسکیں گے بلکہ ان کو جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا' اس لیے اس حدیث کا مطلب بھی اس اصول کی روشنی میں یہی سمجھنا چاہیے کہ غرور و تکبر اپنی اصلیت کے لحاظ سے جنت سے دور کرکے دوزخ میں ڈلوانے والی خصلت ہے یا یہ کہ مغرور اور متکبر شخص سیدھا جنت میں نہ جاسکے گا' بلکہ اس کو دوزخ میں اپنے غرور و تکبر کی سزا بھگتنی پڑے گی' اور جب وہاں آگ میں تپا کے اس کے تکبر کے مادہ کو جلا دیا جائے گا اور غرور کی گندگی سے اس کو پاک و صاف کردیا جائے گا تو اگر وہ صاحب ایمان ہے تو اس کے بعد جنت میں جاسکے گا۔

(۲۲۲)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تین آدمی ہیں جن سے اللہ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا۔ اور ان کا تزکیہ نہیں کرے گا...... اور ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ان کی طرف نگاہ بھی نہیں کرے گا...... اور ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے' ایک بوڑھا زانی دوسرا جھوٹا فرمانروا اور تیسرا نادار و غریب متکبر۔ (صحیح مسلم)

(تشریح) بعض معصیتیں بذات خود بھی سنگین اور گناہ کبیرہ ہوتی ہیں لیکن بعض خاص حالات میں اور خاص اشخاص سے اگر ان کا صدور ہو' تو ان کی سنگینی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے' مثلاً چوری بذات خود بڑی معصیت ہے لیکن اگر چوری کرنے والا کوئی دولت مند ہو' جس کو چوری کی کوئی ضرورت نہ ہو' یا سرکاری سپاہی اور چوکیدار ہو' تو پھر اس کا چوری کرنا اور بھی زیادہ سنگین جرم ہوگا اور اس کو قابل معافی نہیں سمجھا جائے گا...... اس حدیث میں اسی قسم کے تین مجرموں کے حق میں اعلان فرمایا گیا ہے کہ ان بدبختوں بدنصیبوں سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم کلام نہ ہوگا' اور ان کا تزکیہ بھی نہ فرمائے گا اور آخرت میں یہ مجرم رب کریم کی نظر کرم سے بھی قطعی محروم رہیں گے...... ایک بوڑھا زناکار' دوسرا جھوٹا فرمانروا' تیسرا ناداری کی حالت میں تکبر کرنے والا...... اور یہ اس لیے کہ جوانی کی حالت میں اگر کوئی شخص زنا کا مرتکب ہو' تو اس کا یہ گناہ کبیرہ ہونے کے باوجود قابل درگزر بھی ہوسکتا ہے کیونکہ جوانی کی حالت میں شہوت سے مغلوب ہونا ایک فطری کمزوری ہے...... لیکن اگر کوئی بوڑھا بڑھاپے میں یہ حرکت کرے' تو یہ اس کی طبیعت کی سخت خباثت کی نشانی ہے' اسی طرح اگر کوئی بیچارہ عام آدمی اپنی ضرورت نکالنے کے لیے جھوٹ بول جائے' تو اس کا گناہ بھی کبیرہ ہونے کے باوجود قابل معافی ہوسکتا ہے لیکن ایک صاحب اقتدار حکمران اگر جھوٹ بولتا ہے تو یہ اس کی طبیعت کی انتہائی گندگی اور خدا سے بے خوفی کی نشانی ہے...... ایسے ہی کوئی دولت مند اگر تکبر کرے تو انسان کی عام فطرت کے لحاظ سے یہ کچھ زیادہ مستبعد نہیں۔

"[illegible] دولت [illegible] ست نہ گردی مروی"

لیکن گھر میں فقر و فاقہ کے باوجود اگر کوئی شخص غرور و تکبر کی چال چلتا ہے تو بلاشبہ یہ اس کی انتہائی دنائی اور کمینہ پن [illegible] الغرض تینوں قسم کے یہ مجرم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی ہم کلامی سے اور اس کی نظر کرم سے اور تزکیہ سے محروم رہیں گے' تزکیہ نہ کیے جانے کا مطلب بظاہر یہ ہے کہ ان کے گناہ معاف نہیں کیے جائیں گے' اور صرف عقیدہ یا بعض اعمال صالحہ کی بنیاد پر ان کو مومنین صالحین کے ساتھ شامل نہ کیا جائے گا' بلکہ ان کو سزا بھگتنی ہی پڑے گی' واللہ اعلم۔

(بشکریہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

بیت المقدس

الماس ایم اے

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول اور وہ شہر ہے جہاں سے مولائے کائنات پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرش بریں کا سفر کیا۔ وہ شہر جو مسلمانوں کو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ شہر جو نصف صدی سے یہودیوں کے زیر تسلط ہے۔ جہاں کلمہ گو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ جہاں یہودیوں کے مظالم پر دنیا نے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ وہ شہر جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے جہاں متعدد پیغمبروں اور صحابہ کرام کے مزارات واقع ہیں۔ یہ شہر آج بھی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور کسی صلاح الدین ایوبی کا منتظر ہے۔ یہ شہر کیسے فتح ہوا اور کس طرح اس کا سقوط ہوا آئیے اسے ممتاز مورخ اور ادیب الماس ایم اے کی نظر سے دیکھیں۔

تاریخ کے جھروکوں سے لہو کو گرماتی ایمانی جذبوں کو جھنجوڑتی تحریر

قیصران بھی جذباتی ہوگیا۔ اس نے جذبات سے پُر بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"تم میری ہو جوزی...... میں تمہیں ساتھ لے کر چلوں گا۔"

جوزیفائن نے جلدی سے قیصران کو چھوڑ دیا اور کہا۔ "نہیں قیصران...... میں ابھی تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔"

قیصران کو جوزی کی ایک دم تبدیلی سے تعجب ہوا۔ اس نے پوچھا۔ "کیوں جوزی! تم ابھی کیوں نہیں جاسکتیں؟ تم خود ہی تو اس جہنم سے نکلنا چاہتی ہو۔"

جوزیفائن نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ شہزادہ پلیوگس اسے ڈھونڈتا ہوا راہداری تک پہنچ چکا تھا۔

جوزی نے منہ پھیر کر قیصران سے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

جوزی باہر جانا چاہتی تھی مگر قیصران نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر جھک کر اسے بوسہ دیا اور بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کب آؤ گی جوزی......؟"

جوزی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور بولی۔ "قیصران! میں نے چار سال تمہارا انتظار کیا ہے۔ کچھ دن تم بھی انتظار کرو۔ شہزادہ دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اسے میں نے چھوٹے بھائی بلکہ بیٹے کی طرح پالا ہے۔ ملکہ بھی اس کی دشمن ہے۔ جس دن میں نے محسوس کیا کہ شہزادہ اپنی حفاظت کرسکتا ہے اسی گھڑی میں محل چھوڑ دوں گی۔"

جوزیفائن جانے لگی تو قیصران نے اسے خدا حافظ کہا۔

جوزیفائن نے مسکرا کر قیصران کو دیکھا۔ پھر راہداری کی طرف چلی گئی۔ قیصران نے جھانک کر دیکھا۔ جوزیفائن شہزادے کو اس طرح گھسیٹ رہی تھی جیسے ماں اپنے شریر بچے کو کھینچتی ہے۔

قیصران اس اتفاقیہ ملاقات پر بہت خوش تھا۔ اگرچہ ملاقات مختصر تھی لیکن قیصران کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

پس جب قیصران بستر پر لیٹا تو اس نے اپنی اس ملاقات کو اپنے ذہن میں ترتیب دینا شروع کیا تاکہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ قیصران اور جوزی دونوں ہی حد درجہ جذباتی تھے۔ اس وقت کی گفتگو سے قیصران کو یہ اندازہ ضرور ہوا کہ جوزی کا یہ کہنا بڑی حد تک درست معلوم ہوتا تھا کہ اسے محل میں کوئی خاص مقام حاصل

ہے اور اس کا مقام ملکہ اینا سے کسی طرح کم نہیں۔ جوزی محل میں کس طرح پہنچی تھی؟ اس بارے میں کوئی بات واضح نہ ہوئی تھی مگر یہ بات درست تھی کہ ولی عہد شہزادے کی پرورش اور نگہداشت جوزی کے سپرد تھی۔
جوزی کی باتوں سے قیصران کو یہ بھی یقین ہو گیا کہ ملکہ اینا کا کردار نہ صرف یہ کہ داغ دار تھا بلکہ اس عورت سے کسی قسم کی مدد یا وفا کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو حصول مطلب کے لیے بڑے سے بڑا اقدام بھی اٹھا سکتی تھیں۔
قیصران کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی کہ جوزیفائن اس وقت اس کے ساتھ کیوں نہیں جانا چاہتی۔ جوزیفائن نے شہزادے کی زندگی بچانے کے لیے ضرور سخت انتظامات کیے ہوں گے۔ پس اس کا یہاں سے جانا شہزادے کی ہلاکت کا باعث بن سکتا تھا۔
پس قیصران نے آگے سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور سونے کی کوشش کرنے لگا تا کہ تازہ دم ہو کر صبح قسطنطنیہ کی ملکہ سے گفتگو کر سکے۔

❀❀❀

کنٹا کوزین بازنطینی سلطنت کا ایک طاقت ور سردار تھا۔ یہ شخص ایک انتہائی شاطر اور مفاد پرست انسان تھا۔ سلطنت کے دوسرے امیر وزیر اسے پسند نہ کرتے تھے بلکہ اس کے خوف سے زبان تک نہ ہلا سکتے تھے۔ شہنشاہ اینڈ ونیکس کی زندگی ہی میں کوزین حکومت کے سیاہ و سفید کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شہنشاہ اس پر بڑا اعتماد کرتا تھا لیکن وہ در پردہ شہنشاہ کی جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس نے ملکہ اینا کو ہاتھوں میں لے لیا تھا اور ملکہ اور کوزین کے تعلقات بڑھتے بڑھتے ناجائز حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ کوزین کی بیشتر راتیں ملکہ اینا کی خواب گاہ میں گزرتی تھیں۔ ان رنگین راتوں کی داستان محل کی کنیزوں اور غلاموں کی زبانوں پر تھیں لیکن وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی خاموش رہتے تھے۔
اینڈ ونیکس سوم کی وفات پر کوزین نے اپنے شہنشاہ بننے کا ڈول ڈالا مگر اسے بازنطینی سرداروں کی مخالفت کا شدید سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام سرداروں کی سرغنہ اور سردار اعلیٰ جوزیفائن تھی۔ جوزیفائن کہنے کو تو شہزادہ پلیوگس کی آیا اور اتالیق تھی لیکن تمام سردار اس پر مکمل اعتماد کرتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ شاہی محل میں اگر شہزادے کی حفاظت کوئی کر سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف جوزیفائن ہے۔ جوزیفائن گزشتہ چار سال سے شہزادے کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ جس وقت جوزیفائن شاہی محل میں پہنچی۔ شہزادے کی عمر مشکل سے آٹھ سال تھی۔ جوزیفائن نے بڑی محبت اور محنت سے شہزادے کی نگہداشت کی اور اس کی جان کی حفاظت کی تھی ورنہ کنٹا کوزین نے شہزادے کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کئی بار کوشش کی تھی لیکن جوزیفائن کی وجہ سے اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔
جوزیفائن نے کنٹا کوزین کا شہنشاہ بننے کا خواب تو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا مگر ملکہ اینا کی کوشش اور بعض مفاد پرست سرداروں کی سازش سے کوزین، شہزادے کا والی مقرر کیا گیا لیکن یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور آخر کار کوزین نے مجبور ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا تھا اور بازنطینی حکومت کے نصف حصہ پر قبضہ کر لیا۔ جوزیفائن کا کوزین سخت مخالف تھا اور اسے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد وہ جوزیفائن کو عبرت ناک سزا دے گا۔ ملکہ اینا کو بھی جوزیفائن سے نفرت تھی لیکن جوزیفائن کو شہزادہ اپنی سگی ماں سے زیادہ عظیم سمجھتا تھا اور سلطنت کے نیک خواہوں نے جوزیفائن کو قصر شاہی کا پورا کنٹرول دے رکھا تھا۔

[illegible] کو قیصران بیدار ہوا تو ملکہ کا پیغام آ گیا۔ وہ [illegible] تیار ہوا اور ایک یونانی کنیز کی راہبری میں ملکہ اینا کی خواب گاہ کے برابر والے کمرے میں پہنچا جسے ملکہ نے ملاقات کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ اس ملاقاتی کمرے کی [illegible] سے قیصران کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ ہر چیز بے نظیر اور لاجواب تھی۔ قد آدم آئینے کے فریم پر جواہرات جڑے گئے تھے۔ سونے کے گلاس اور صراحیاں چنی ہوئی تھیں۔
قیصران جو چیز دیکھتا تو دیکھتا رہ جاتا۔ ابھی اس نے تمام چیزوں کا سرسری جائزہ بھی نہ لیا تھا کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور شہنشاہ قسطنطین کی بیوہ ملکہ اینا شاہانہ کروفر کے ساتھ کنیزوں کے جلو میں داخل ہوئی۔ ملکہ اینا کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ بناؤ سنگھار سے وہ دلہن نظر آتی تھی۔ اپنے بیش قیمت شاہی لباس میں جب وہ ہاتھ ملانے کے لیے قیصران کی طرف بڑھی تو قیصران کو یوں محسوس ہوا جیسے حسن و امارت کا ایک سمندر موجیں مارتا ہوا اس کی طرف آ رہا ہے۔
قیصران ملکہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ ایک تو ملکہ کا بیش قیمت شاہانہ لباس، اس پر ملکہ کی موہنی صورت، [illegible] قیصران کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی پرستان میں آ گیا ہو۔
قیصران نے کوشش کر کے جلد ہی خود پر قابو پا لیا اور ملکہ [illegible] کے حضور آداب پیش کیا۔ ملکہ نے بھی [illegible] لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ قیصران کچھ جھجکا۔ مگر آداب شاہی کا خیال آتے ہی اس نے اپنا ہاتھ ملکہ کے ہاتھ میں دے دیا۔ ملکہ نے قیصران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر آہستہ سے دبایا اور مسکرانے لگی۔ تمام کنیزیں بھی مسکرا دیں۔ پھر تو جیسے گلستان کھل گیا۔ [illegible] اور دبے دبے [illegible] کی بارش شروع کر دی۔
ملکہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ قیصران ہوش میں ہونے کے باوجود بوکھلایا سا ایک ایک کا منہ دیکھ رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ حسینوں کے اس حسن بے محابا اور شاداب برجوانیوں کی تپش سے بوکھلا گیا تھا یا پھر اس کی نظریں کسی اور جمال جہاں آراء کو تلاش کر رہی تھیں۔
ملکہ نے اپنی زرنگار کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔ اس وقت ملکہ کا رخ قیصران کی طرف تھا۔
''خوب رو ترک زادے! تمہارا نام کیا ہے؟''
''قیصران ملکہ محترمہ!'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔
ملکہ نے قیصران کو گھورا اور کہا۔ ''لیکن قیصران تمہارے چہرے کے نقوش ترکوں سے زیادہ نصرانی وجاہت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے یا اس کی کوئی وجہ اور ہے؟''
قیصران کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ اسے پہچان لیا گیا ہے۔ پھر بھی اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی اصلیت ہرگز ظاہر نہ ہونے دے گا۔ پس اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''اسے محض اتفاق کہا جا سکتا ہے ملکہ عالیہ!''
''عثمانی سلطان کے حرم میں نصرانی بیگمات کی تعداد کتنی ہے؟'' یہ ملکہ اینا کا دوسرا چبھتا ہوا سوال تھا۔
قیصران کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لیے اس نے جواب دینے کی بجائے خاموشی کا سہارا لیا اور سر جھکا لیا۔
ملکہ کو کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ایک لمحہ انتظار کے بعد خود ہی کہا۔
''قیصران! دراصل ہم سلطان سے دوستی کے خواہش مند ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ سلطان بڑے صاحب نظر ہیں پس ہم جو تحفہ ان کی خدمت میں پیش کریں گے امید ہے کہ سلطان اسے ضرور پسند

فرمائیں گے۔"

"ملکہ عالیہ......" قیصران نے احتجاج کرنا چاہا مگر ملکہ نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ملکہ نے قیصران سے کہا۔

"قیصران! یہ بات آداب شاہی کے خلاف ہے کہ ملکہ کی بات درمیان میں کاٹ دی جائے۔ تمہیں اس وقت تک خاموش رہنا چاہیے جب تک ہم اپنی بات مکمل نہ کرلیں۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہمارے محل میں جوزیفائن نام کی ایک ایسی حسینہ موجود ہے جس کے حسن کو دیکھ کر چاند بھی شرماتا ہے۔ ہم یہ تحفہ "سلطان ترکی" کے حضور پیش کرنا چاہتے ہیں۔"

پھر ملکہ نے قیصران کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہم اپنی بات مکمل کرچکے ہیں۔ اب تم جو کہنا چاہتے ہو۔ وہ کہہ سکتے ہو۔"

قیصران کے پاس اب کہنے کو کیا رہ گیا تھا؟ وہ انتہائی حواس باختہ ہوگیا تھا۔ ملکہ اینا کس قدر چالاک تھی۔ وہ جوزیفائن سے پیچھا چھڑانے کے لیے کتنی گہری سازش کررہی تھی۔

"بے چاری جوزیفائن۔" قیصران نے دل میں کہا۔ اسی وقت ملکہ کی آواز پھر ابھری۔

"ترکی سفیر ہماری حسین پیش کش سے سوچ میں پڑگئے۔ کیا ہمارا تحفہ سلطان کے شایان شان نہیں؟"

قیصران کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ ملکہ اینا کی پیش کش دراصل جوزیفائن سے پیچھا چھڑانے کی ایک سازش تھی یا وہ خود اس سے سودے بازی کررہی تھی۔ چنانچہ اس نے سنبھل کر کہا۔

"اے ملکہ! تحفہ کا تو وہ فیصلہ کرسکتا ہے جسے تحفہ دیا جاتا ہے۔ آپ کا تحفہ میرے لیے نہیں ہے۔ اس لیے میں اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔"

ملکہ اینا نے کرسی پر پہلو بدلا اور اس کے چہرے پر فتح کی سرخی چھلک پڑی۔ وہ نرم لہجے میں بولی۔

"قیصران! ہم تمہارے مرتبے سے واقف ہوچکے ہیں۔ تم دولت عثمانیہ کے ان سرداروں میں ہو جنہیں سلطان کی قربت حاصل ہے۔ اس لیے تم جیسی عظیم ہستی کے لیے بھی ہم جوزیفائن کا تحفہ پیش کرسکتے ہیں۔"

ملکہ کی بات ختم ہوتے ہی قیصران نے سوال کیا۔ "اگر میں یہ تحفہ قبول کروں تو مجھے اس کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی؟" قیصران نے خالص تاجرانہ انداز اختیار کیا۔ ملکہ اینا نے قیصران کی طرف ایک تیر پھینکا تھا۔ وہ جوزیفائن کے بدلے میں سلطان یا کم از کم اس کے ایک اعلیٰ افسر کی ہمدردیاں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ پس یہ سودا اسے کسی طرح مہنگا نہ تھا۔ ملکہ نے کہا۔

"قیمت نہیں بلکہ خدمت۔ فوجی مدد کے معاوضے میں ہم سے نقد رقم قبول کی جائے۔"

قیصران ملکہ کی مکاری خوب سمجھ رہا تھا۔ سلطان ترکی اور خان نے چلتے وقت قیصران کو اشارہ کیا تھا کہ معاوضہ کے لیے زر کے بجائے زمین پر زور دیا جائے مگر ملکہ اینا نقد رقم پر سودا کرنا چاہتی تھی۔

آخر قیصران نے پروقار لہجے میں کہا۔ "اگر سلطان ترکوں کے خون کی قیمت لینا پسند کریں تو......؟"

ملکہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ترکوں کو رام کرنا مشکل ہے۔ اس نے ایک لمحہ سوچا پھر بولی۔ "نقد رقم کے علاوہ ہم سلطان کو تحفے میں پچاس کنیزیں بھی دے سکتے ہیں۔ ہاں رقم منہ مانگی دی جاسکتی ہے۔"

قیصران نے دیکھا کہ ملکہ زمین کی بات گول کرگئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کوئی علاقہ یا قلعہ دینے پر آمادہ نہیں۔ ہاں نقد رقم دینے پر تیار ہے۔

"اگر رقم کا اندازہ بتایا جائے تو سلطان کو رضا [illegible] ہے۔" قیصران ہر [illegible]

"[illegible] (دینار کے برابر)" ملکہ فوراً بول پڑی۔

یہ بات [illegible] تو قیصران نے دریافت کیا۔ "کوزین کے [illegible] کو ختم کرنے کے لیے کتنی فوج کی ضرورت ہوگی؟"

ملکہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "تیس ہزار کا لشکر کافی ہوگا۔"

قیصران کو ہنسی آگئی۔ وہ بولا۔ "اگر ملکہ گستاخی معاف فرمائیں تو میں یہ کہوں گا کہ تیس ہزار ترک لشکر سے تو بلقان کی تمام ریاستوں کو بڑی آسانی سے فتح کیا جاسکتا ہے۔ ملکہ نے ترک لشکر کی طاقت کا شاید غلط اندازہ لگایا ہے۔"

ملکہ شرمندہ ہوگئی۔ اس کو کیا، تمام یورپی ممالک کو ترکوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا صحیح اندازہ نہ تھا۔

آخر ملکہ نے بے بسی سے پوچھا۔ "قیصران! اگر ہمارا اندازہ غلط ہے تو تمہارے خیال میں کتنا لشکر کافی ہوگا۔"

قیصران کو بازنطینیوں کی صحیح طاقت کا اندازہ لگانے کا موقع ہاتھ آگیا تھا۔ پس اس نے معصومیت سے پوچھا۔ "کنٹا کوزین کے پاس کتنا لشکر ہے؟"

"ہماری اطلاع کے مطابق پچیس تیس ہزار۔" ملکہ نے جواب دیا۔

"آپ کی فوجی طاقت کتنی ہے؟" قیصران نے اس انداز میں پوچھا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ تھی۔ حالانکہ یہ ایک اہم راز تھا جس کے افشاء ہونے سے جنگ کا نقشہ بدل جایا کرتا ہے۔

ملکہ نے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور [illegible] ہمارے پاس بھی ہے۔"

قیصران کے لیے گفتگو ختم ہوچکی تھی۔ اسے اہم باتیں معلوم ہوگئیں۔ ملکہ کی خواہش، جوزیفائن کے بارے میں نئی سازش، فوجوں کی تعداد، ملکہ کے پر مسرت شب و روز وغیرہ وغیرہ۔

قیصران کی روانگی سے پہلے ملکہ اینا نے اس کے اعزاز میں دوپہر کو ایک شان دار ضیافت کا اہتمام کیا جس میں مرحوم شہنشاہ کی تمام جائز و ناجائز بیگمات اور شہزادیوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ کنیزوں کی فوج ظفر موج اس کے علاوہ تھی۔ چنانچہ دعوت ہوئی اور بڑی شان دار ہوئی۔

ضیافت کے بعد رقص و نغمہ کی محفل گرم ہوئی۔ چونکہ یہ محفل قیصران کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی اس لیے وہ رقص و نغمہ کی محفل سے اپنا دامن نہیں بچا سکا۔ قیصران کو اپنے وطن کے نغمے سن کر بڑی فرحت ہوئی۔ ایک دیہاتی رقص سے تو وہ اس قدر محظوظ ہوا کہ بے ساختہ اس کے منہ سے تحسین اور آفریں کے وہ کلمات نکلے جو قسطنطنیہ کے نصرانی خوشی کے موقع پر ادا کرتے تھے۔ قیصران کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ لیکن سازوں کے شور میں اس کی آواز دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔

ضیافت اور محفل رقص و سرود دونوں ہی خوب تھیں لیکن اس تمام عرصہ میں قیصران کی نظریں بھٹکتی رہیں اور کسی کو تلاش کرتی رہیں۔ آخر وہ نظر آگئی جس کا انتظار قیصران کو تھا۔ جوزیفائن محفل میں کیا آئی جیسے چاند نکل آیا اور ستاروں کی روشنی ماند پڑگئی۔ جوزیفائن کے مقابلہ پر بیگمات اور شہزادیوں کا حسن پھیکا پڑ گیا۔ قیصران دوسروں کی نظریں بچا کر جوزیفائن کو دیکھ رہا تھا مگر جوزیفائن قصداً نظریں چرا رہی تھی۔

ایک بار ملکہ اور قیصران کی نظریں ملیں تو ملکہ مسکرائی پھر اس نے سر گھما کر جوزیفائن کو اس انداز

میں دیکھا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ قیصران تم بھی جوزیفائن کو دیکھ لو جسے ہم تمہیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ قیصران ملکہ کا اشارہ سمجھ گیا لیکن اس نے جوزیفائن کی طرف نظر نہ کی۔

قیصران جانے سے پہلے ایک بار جوزیفائن سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ اس سے زیادہ جوزیفائن بااختیار تھی۔ وہ اگر چاہتی تو قیصران سے کسی نہ کسی بہانے مل سکتی تھی۔ قیصران یہی سوچ کر صبر کر گیا۔

محفل برخاست ہونے کے قریب تھی۔ بیگمات اور شہزادیاں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اسی وقت جوزیفائن تیزی سے قیصران کے قریب آئی اور آہستہ سے قیصران کے کان میں کہا۔

تھیوڈور کی فتح

ان الفاظ کے پیچھے کچھ اور الفاظ بھی تھے مگر جوزیفائن جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے دوسری طرف نکل گئی۔

قیصران کے لیے تھیوڈور کا نام بالکل نیا تھا۔ تھیوڈور سے جوزیفائن کا کیا مطلب تھا۔ اور یہ تھیوڈور کس چڑیا کا نام ہے؟ جنگ تو ملکہ اینا اور کنٹا کوزین کے درمیان ہو رہی تھی۔ ''تھیوڈور'' کہاں سے بیچ میں آ گئی۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی قیصران کی سمجھ میں کچھ نہ آ سکا۔ آخر قیصران نے تنگ آ کر اس جملے کو ذہن سے نکال دیا۔ وہ خواہ مخواہ ان معموں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

❀❀❀

سلطنت عثمانیہ کا سلطان اورخان دربار خاص میں امراء اور وزراء سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اس کو قیصران کے واپس آنے کی اطلاع دی گئی تو اس نے دربار برخاست کیا اور قیصران کو تخلیہ میں طلب کیا۔

قیصران، سلطان کے سامنے حاضر ہو کر تسلیم بجا لایا۔

سلطان نے مسکرا کر پوچھا۔ ''ملکہ اینا کا کیا حال ہے؟''

قیصران نے ادب سے جواب دیا ''ملکہ میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ کنٹا کوزین کو شکست دے سکے۔''

''کتنی فوج کی خواستگار ہے ملکہ؟'' سلطان نے دریافت کیا۔

''ملکہ ناتجربہ کار ہے اور خوف زدہ بھی۔ وہ بہت بڑا لشکر چاہتی ہے لیکن اس غلام کا خیال ہے.....''

قیصران کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔ اسے خیال گزرا کہ کہیں وہ سلطان کے حضور گستاخی تو نہیں کر رہا۔ کیونکہ سلطان نے اس کا خیال نہیں پوچھا تھا۔

سلطان نے قیصران کو سہارا دیا۔ ''قیصران! گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہارا خیال بھی سننا چاہتے ہیں۔ تمہیں وہاں بھیجنے کا مقصد یہی تھا کہ ہمیں صحیح حالات کا علم ہو سکے۔''

قیصران کو حوصلہ ہوا۔ وہ بولا۔ ''اگر چھ سات ہزار عثمانی لشکر ملکہ کو بھیج دیا جائے تو کنٹا کوزین کی بغاوت کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔''

''اور اگر اتنا ہی لشکر کنٹا کوزین کو دے دیا جائے تو وہ کیا کر سکے گا؟''

سلطان کے اس سوال نے قیصران کو الجھن میں ڈال دیا۔ اس کے جانے تک تو کنٹا کوزین کو لشکر دینے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ اب سلطان کا اس سوال سے کیا مطلب ہے۔

سلطان نے قیصران کو الجھن میں دیکھا تو نرمی سے کہا۔ ''قیصران! تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔ ہم تمہاری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

قیصران کو مجبوراً اپنی رائے پیش کرنی پڑی۔ اس نے کہا۔

''سلطان عالم! عثمانی لشکر کی شجاعت سے ہمارا کوئی دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر کوزین کو چھ ہزار کا عثمانی لشکر دیا گیا تو وہ آگے بڑھ کر صرف قسطنطنیہ کا محاصرہ کر سکتا ہے اسے فتح نہیں کر سکتا۔''

سلطان نے قیصران کو غور سے دیکھا۔ کچھ سوچا اور پھر کہا۔

''قیصران! تمہارے اندازے میں ضرور حقیقت ہو گی۔ لیکن قسطنطنیہ فتح نہ ہونے کی وجہ تم جانتے ہو؟''

''کیوں نہیں سلطان معظم..... قسطنطنیہ کا محل وقوع ایسا ہے کہ اس پر آسانی سے قبضہ نہیں ہو سکتا۔ ایک طرف بحر اسود اور دو طرف اونچی اونچی پہاڑیاں اس کی قدرتی محافظ ہیں جن سے ٹکرانا خودکشی کے مترادف ہے۔ غلام یہ نہیں چاہتا کہ عثمانی لشکر کا ایک سپاہی بھی بلاوجہ ضائع ہو۔''

سلطان نے دریافت کیا۔ ''مدد کی صورت میں کیا پیش کش کی ہے؟''

''ملکہ مدد کی صورت میں دس ہزار دوکات اور بہت سے غلام اور کنیزیں خدمت اقدس میں پیش کرنے کی خواہش مند ہے۔'' قیصران نے ملکہ کی پیش کش دہرا دی۔

''کوئی قطعہ زمین؟'' سلطان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''زمین دینے پر ملکہ آمادہ نظر نہیں آتی۔ ہاں نقد رقم بڑھائی جا سکتی ہے۔'' قیصران نے صاف صاف کہہ دیا تاکہ اس پر کوئی الزام نہ ہے۔

سلطان گہری سوچ میں پڑ گیا۔ قیصران کنکھیوں سے سلطان کے چہرے کے آثار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ آخر سلطان نے سر اٹھایا اور کہا۔

''قیصران! تمہارے آنے سے قبل ہم اسی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ تم جانتے ہو کہ بازنطینی سلطنت کے تمام ایشیائی علاقے سلطنت عثمانیہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ اب مسئلہ ''داخلہ یورپ'' کا تھا۔ کنٹا کوزین اور ملکہ اینا کے جھگڑے نے ہمیں یورپ میں پچھلے دروازے سے داخلہ کا سنہری موقع دیا ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ملکہ اینا کے بجائے ہم

کنٹا کوزین کی مدد کریں۔

قیصران دم بخود رہ گیا۔ اسے تو خواب میں بھی اس کا خیال نہ تھا۔ یہ فیصلہ اس کے لیے اچانک اور نہایت حیرت انگیز تھا۔ آخر سلطان نے اس کی حیرت دور کردی۔ انہوں نے بتایا۔

''تمہارے جانے کے بعد کنٹا کوزین نے بھی اپنی سفارت بھیج کر مدد کی خواہش کی ہے۔ وہ سفارت اب تک ہمارے مہمان خانے میں ہے۔ میں تمہاری واپسی کا انتظار کررہا تھا۔ ملکہ اینا اور کنٹا کوزین ہمارے لیے دونوں برابر ہیں۔ ملکہ اینا نے کوئی معقول پیش کش نہیں کی۔ پھر کیوں نہ ہم کوزین کی مدد کریں۔ اس نے نقد رقم کے علاوہ قلعہ زنپ کا مشترکہ کنٹرول...... اور بھی کچھ وعدے کیے ہیں۔''

قیصران کیا بولتا۔ کیا جواب دیتا۔ وہ اس فیصلے کی مخالفت کرتا تو کون سنتا؟ اسے کوزین یا ملکہ اینا میں سے کسی سے بھی کوئی ہم دردی نہ تھی۔ دونوں سے ہی اس کا کوئی رشتہ ناتا نہ تھا۔ اور مسلمان ہونے کے بعد تو اس کے لیے وطن کا تصور ہی بدل گیا تھا۔

قیصران کو فکر تھی تو جوزیفائن کی۔ کنٹا کوزین اس کا جانی دشمن تھا۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد جوزیفائن اس کے ہتھے چڑھ گئی تو اس کا کیا حشر ہوگا؟ یہ سوچ کر ہی قیصران کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

جب تک کنٹا کوزین شہزادے کا والی رہا۔ جوزیفائن نے ملکی سیاست میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ اس کی تمام تر توجہ شہزادے کی طرف تھی۔ وہ محل سرا کی ناظم بلکہ مالکہ تھی۔ وہاں اس کا سکہ چلتا تھا۔ جوزیفائن کو ملکہ اینا اور کوزین کے تعلقات سے ضرور چڑ تھی اور اسے یہ بھی خوف تھا کہ کوزین کی عیاش طبیعت کہیں اس پر کوئی مصیبت نہ لے آئے۔ لیکن کوزین کو جوزیفائن پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔

کوزین کی بغاوت کے بعد جوزیفائن کو اور زیادہ محتاط ہونا پڑا۔ اب اسے محل کے علاوہ باہر کی بھی فکر رہتی تھی۔ اسے علم تھا کہ کوزین بدطینت ہے اور وہ جو کچھ بھی کر گزرے وہ کم ہے۔ پھر اس کے ہم درد اب بھی قسطنطنیہ اور محل کے اندر موجود تھے۔ یہ مفاد پرست لوگ ایسے گھلے ملے تھے کہ ان کی شناخت مشکل تھی۔ جوزیفائن نے بھی جوابی حملے کے طور پر اپنے آدمی کوزین کے علاقے نیکوٹیکا میں پھیلا رکھے تھے۔ کوزین کی فوج اور اس کے خاص ملازموں میں بھی جوزیفائن اور شہزادے کے ہم درد موجود تھے۔ جوزیفائن کو انہی مخبروں کے ذریعہ معلوم ہوا تھا کہ قیصران کے قسطنطنیہ قیام کے دوران کوزین نے بھی سلطان ترکی سے مدد کی درخواست کی ہے اور سلطان کو زر، زمین کے علاوہ اپنی بیٹی تھیوڈور کو سلطان کے حرم میں داخل کرنے کی پیش کش کی ہے۔ جوزیفائن نے اندازہ کرلیا تھا کہ اتنی بڑی پیش کش کے پیش نظر سلطان، کوزین کی ضرور مدد کرے گا۔ اسی وجہ سے جوزیفائن نے ضیافت کے دوران قیصران کے کان میں کہا تھا کہ ''تھیوڈور کی فتح ہوگی۔''

لیکن اس شکست و فتح سے پہلے ہی شاہی محل سرا میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے شاہی محل کے در و بام ہل کے رہ گئے اور خلوص اور اعتماد کے تمام آبگینے چکنا چور ہوگئے۔ جوزیفائن نے احتیاط کے طور پر شہزادے کے لیے الگ باورچی خانہ بنوایا تھا۔ اس نے اس باورچی خانے کے تمام ملازم اپنے اعتماد کے رکھے تھے۔ کھانے کے دوران اس نے یہ انتظام کیا تھا کہ باورچی خانے سے کھانے کی میز تک قدم قدم پر کنیزیں قطار باندھ کر کھڑی ہو جاتیں۔ باورچی انہیں کھانے کی قابیں پہنچاتے اور پھر وہ ہاتھوں ہاتھ ان قابوں کو کھانے کی میز تک لے جاتی

... جو ڈش پہنچتی، سب سے پہلے اسے ... چکھ کر اطمینان کرتی اور پھر شہزادے کی ... بڑھا دیتی تھی۔

اس دن بھی حسب معمول کھانا شروع ہوا۔ قابیں ... ڈشیں آتی رہیں۔ کھانا نکلتا اور تقسیم ہوتا رہا۔ نصف کے قریب کھانا کھایا جاچکا تھا کہ ایک قاب میں جس ... کوئی بھنا ہوا پرندہ تھا جوزیفائن کی میز کے پاس ... کی کنیز کے ہاتھ میں آیا جس نے جوزیفائن کو ... پیش کرنی تھی۔

قاب کنیز کے ہاتھ میں آئی۔ جوزیفائن نے بغیر ... کی طرف گھومے اپنا ہاتھ قاب لینے کے لیے اس ... طرف بڑھایا لیکن قاب کنیز نے جوزیفائن کو نہ ... ایک لمحہ بعد جوزیفائن نے مڑ کے کنیز کو دیکھا۔ کنیز کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔ جس کے نتیجے میں قاب کنیز کے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہوگئی۔

جوزیفائن ایک لمحہ کے اندر معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئی۔ اس نے حکم دیا کہ محل سرا کے تمام دروازے فوراً بند کردیے جائیں تاکہ کوئی شخص باہر نہ جانے پائے۔ جوزیفائن کے حکم کے ساتھ ہی پہرہ لگ گیا۔ فوراً تمام دروازے بند کردیے گئے۔ اب جو کھڑا تھا وہ کھڑا ... اور جو بیٹھا تھا وہ بیٹھا رہ گیا۔

جوزیفائن نے شاہی طبیب کو طلب کیا۔

شاہی طبیب ہانپتا کانپتا سرکاری پہرے میں حاضر ہو گیا۔

جوزیفائن نے شہزادے کو کھانا کھانے سے روک ... یا تھا۔

اب جوزیفائن نے اس کنیز کے سر پر محبت سے ... جس کے ہاتھ سے قاب گری تھی اور اسے ... اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی۔

اس وقت تک محل سرا میں کہرام مچ گیا تھا۔ ہر طرف زہر، زہر کی آوازیں بلند ہورہی تھیں۔ ہر کوئی ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔

ملکہ اینا کو خبر ملی تو روتی پیٹتی بیٹے کی خیریت کو دوڑی آئی۔

کسی نے کہا۔ ''کتنی مکار ہے؟''

کوئی بولی۔ ''گھڑیال کے آنسو دیکھو۔''

ملکہ نے شہزادے کو دیکھنا چاہا لیکن شہزادے نے ملنے سے انکار کردیا۔

ملکہ منہ لٹکائے واپس ہوگئی۔ شہزادے سے زیادہ اسے اپنی فکر تھی۔ اسے معلوم تھا کہ زہر کسی نے بھی دیا ہو اس کا نام درمیان میں ضرور آئے گا۔

اور ہوا بھی یہی۔

جوزیفائن نے تمام باتیں اس کنیز سے اگلوالیں۔

باورچی خانے سے تعلق رکھنے والی چار کنیزیں اور دو باورچی گرفتار کرکے قید خانے پہنچا دیے گئے۔

جوزیفائن نے ملکہ اینا پر شبہ کا اظہار نہیں کیا لیکن بازنطینی امراء اور سرداران نے ملکہ کو معاف نہیں کیا اور ملکہ کو اس کی خواب گاہ میں عارضی طور پر قید کردیا گیا۔

اس کنیز نے جس نے یہ راز اگلا تھا۔ جوزیفائن نے باورچی خانہ کا ناظم اعلیٰ مقرر کردیا۔

❁❁❁

قسطنطنیہ سے واپس آنے کے بعد قیصران بجھا بجھا سا رہنے لگا تھا۔ اس کا دل کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد سلطان نے قیصران کو بلا کر اسے اطلاع دی۔

''قیصران! ہم یورپ میں پہلا قدم رکھنے کے لیے جارہے ہیں۔ پتہ نہیں کیا انجام ہو؟''

قیصران نے تسلی دی۔ ''خدا کارساز ہے۔ فتح انشاء اللہ ہماری ہوگی۔''

سلطان خوش ہوگیا اور کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ

عثمانی لشکر کے ساتھ تم بھی قسطنطنیہ جاؤ۔"

قیصران کا غنچہ دل کھل گیا۔ قسطنطنیہ اس کا وطن تھا۔ وہاں اس کی جانِ بہار جوزیفائن تھی۔ پس قیصران نے جانے سے پہلے سلطان سے درخواست کی کہ جب ہم فاتح کی حیثیت سے قسطنطنیہ میں داخل ہوں تو اسے کچھ لوگوں کی جاں بخشی کی اجازت دی جائے۔

سلطان کے پوچھنے پر قیصران نے شرمیلے لہجے میں بتایا۔ "وہاں میری خالہ زاد بہن جوزیفائن ہے اور وہ میری منگیتر ہے۔"

سلطان کی نظر میں قیصران کی قدر اور عزت اور بڑھ گئی۔ اس نے نہ صرف ان لوگوں کی جاں بخشی کی اجازت دی جن کی سفارش قیصران نے کی بلکہ قیصران کو ملکہ اینا سے صلح کرنے کی بھی پوری اجازت دے دی۔

مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ قیصران کی کوششوں سے مخالف جماعتوں میں صلح ہوگئی۔ قیصران نے ہی معاہدہ کی شرائط طے کی تھیں اور انہی شرائط پر معاہدہ ہوا۔ یہ شرائط مختصراً اس طرح تھیں۔

۱۔ شہنشاہ، شہزادہ جان پلیوگس قرار پایا۔

۲۔ شہنشاہ کنٹا کوزین تسلیم کیا گیا۔

۳۔ شہنشاہ ملکہ اینا قرار پائی۔

۴۔ شہنشاہ لیڈی کنٹا کوزین تسلیم کی گئی۔

یوں چار اشخاص شہنشاہ قسطنطنیہ قرار پائے جن میں دو مرد اور دو خواتین تھیں۔

دل صاف ہوگئے۔ دشمن گلے ملے۔ قہقہے بلند ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا قلعہ، سارا شہر، در و بام، برجیاں اور فصیلیں چراغوں سے جگمگا اٹھیں۔ مٹھائیاں تقسیم ہوئیں۔ قلعہ کے دروازے کھلوا دیے گئے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپے ہوئے انسان شہر کی طرف دوڑ پڑے۔ ایک بہار تھی کہ رواں دواں۔

خوشیوں کا طوفان تھا کہ سمندر میں بل کھاتی لہریں۔ ڈھنڈورچیوں نے نئے شہنشاہوں کے ناموں کا گلی گلی اعلان کر دیا۔

کنٹا کوزین اپنے لشکر کے ساتھ فاتحانہ انداز میں قلعہ قسطنطنیہ میں داخل ہوا اور ملکہ اینا اور شہزادے پلیوگس نے اس کا استقبال کیا۔

عثمانی لشکر میدان میں ہی فروکش رہا۔ قرہ خیل نے ترکوں کو قلعہ کے اندر جانے کی اجازت نہ دی۔

اس کی وجہ قیصران نے یہ بیان کی کہ ترک کسی دوسرے پرچم تلے رات بسر نہیں کیا کرتے۔ یہ سلطانی حکم تھا۔

دوسرے دن شادیاں دھوم دھام سے شروع ہوئیں۔ شہزادے پلیوگس اور کوزین کی چھوٹی شہزادی کی ان کی رسوم کے تحت شادی ہوئی۔

پھر شہزادی تھیوڈور اور سلطان بروصہ اورخان کا عقد ہوا۔ کنٹا کوزین نے یورپین ساحل پر مشہور قلعہ زنپ کی چابیاں تھیوڈور کے جہیز میں سلطان اورخان کو پیش کیں۔

قیصران اس محفل میں شریک تھا۔ عقد ختم ہوئے۔ مبارک مبارک کی صدائیں بلند ہوئیں۔ سچے موتی اور جواہرات نچھاور کیے گئے۔

قاضی عضدالدین نے سلطان سے اجازت چاہی۔

سلطان نے آہستہ سے کہا۔ "ابھی ہماری دختر کا بھی عقد ہونا ہے۔"

اس وقت ملکہ اینا، دلہن کو سہارا دیے سلطان کے قریب آئی۔ سلطان نے فرمایا۔

"قاضی صاحب! یہ ہے ہماری دلہن بیٹی۔"

قاضی نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا۔ "دلہا کہاں ہے سلطان عالم؟"

سلطان نے قیصران کو آواز دی۔

قیصران اپنے خیالات میں گم تھا۔ سلطان کی آواز [illegible] وہ محفل میں ہوتے ہوئے بھی محفل سے غائب تھا۔

سلطان نے ہاتھ پکڑ کر قیصران کو اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ دلہن زیوروں اور پھولوں میں لدی پھندی سلطان کے دوسری جانب بیٹھ چکی تھی۔

سلطان نے کہا۔ "قیصران! نکاح سے پہلے دلہن کو دیکھ لو۔ بعد میں ہمیں الزام نہ دینا۔"

قیصران بوکھلایا ہوا سلطان کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ اور سلطان کیا چاہتا ہے۔

سلطان کو قیصران کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔ انہوں نے ملکہ اینا سے کہا۔

"ملکہ اینا! ہماری بیٹی کے چہرے سے سہرا ہٹا دو۔"

ملکہ اینا نے دلہن کے چہرے سے سہرا ہٹا دیا۔

ایک بجلی چمکی...... ایک کوندا لپکا...... ایک شعلہ بھڑکا...... قیصران کی آنکھیں حیرت اور مسرت سے پھیل گئیں۔

کیونکہ اس کی دلہن اور سلطان کی بیٹی جوزیفائن جوزی تھی۔

کنٹا کوزین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس نے تو جوزیفائن کو غنڈوں سے خراب کرنے کے لیے بھجوایا تھا مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

سلطان اورخان نے ملکہ تھیوڈور کے رخ سے سہرا ہٹانا چاہا تو عروس نے رونمائی طلب کی۔

سلطان نے منہ مانگی قیمت ادا کرنے کا اعلان کیا۔ تھیوڈور نے رونمائی کی قیمت میں جہیز میں دی "قلعہ زنپ" کی چابیاں واپس مانگیں۔

سلطان نے فوراً رونمائی میں قلعہ زنپ کی چابیاں دلہن کو عطا کر دیں۔

عروس نو کو قلعہ کی چابیاں مل گئیں۔ اس طرح تھیوڈور اپنے باپ کی ہوس اقتدار پر قربان ہوگئی۔ لیکن اس نے قلعہ زنپ کی چابیاں واپس لے کر ترکوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو یورپ میں داخل ہونے سے کچھ دنوں کے لیے ضرور روک لیا تھا۔

فرض شناسی......

حب الوطنی......

یا

حسین انتقام......

یا

تحفہ رونمائی

یہ سب اس رومانی یا تاریخی داستان کے نام ہیں۔

❀❀❀

اس سچے اور دلچسپ تاریخی رومانی داستان (تحفہ رونمائی) کا اختتام ہوا۔ اب ہم آپ کو پھر کتاب کے اصل موضوع یعنی فلسطین (بیت المقدس) کی طرف لیے چلتے ہیں۔

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ۱۵۱۶ء میں ایشیائے کوچک کے ترکان عثمانی نے مصر و فلسطین پر قبضہ کیا تو بیت المقدس بھی ترکی کے زیر اقتدار آ گیا۔ اس وقت سلطان سلیم اول ترکان عثمانی کا قائد تھا۔ پھر کچھ عرصہ تک نپولین بونا پارٹ نے بیت المقدس اپنے قبضے میں رکھا۔ یہ مقدس شہر پہلی جنگ عظیم تک ترک حکومت کے زیر نگیں رہا۔ ترک دورِ حکومت میں بیت المقدس اپنی شان و شوکت کے سلسلے میں پورے عروج پر پہنچ گیا تھا۔

پھر ۱۵۳۶ء میں سلطان سلیمان اعظم نے شہر کی موجودہ فصیل کی تعمیر شروع کرائی۔ یہ فصیل سات سال میں مکمل ہوئی۔ فصیل کی تعمیر چھوٹی اینٹوں سے ہوئی تھی۔ ایک بیان یہ ہے کہ فصیل کی تعمیر دو بھائیوں

کے سپرد تھی جنہوں نے باب الخلیل (یافہ گیٹ) سے مختلف سمتوں کی طرف تعمیر کے کام کا آغاز کیا۔ فصیل کا گھیراؤ ڈھائی میل ہے اور پیمائش وقتی کے لحاظ سے ۱۲۳۵۰ فٹ لمبی ہے۔

ترکی نے جولائی ۱۸۱۷ء میں ایک شاہی فرمان کے ذریعہ "مزار مقدس" فرانس کی تحویل میں دے دیا۔ ۱۸۰۸ء میں اس گرجا میں آتش زدگی کی واردات ہوئی جو بعض مورخین کے مطابق یہودیوں کی سازش کا نتیجہ تھی۔ ۱۸۳۱ء میں برطانوی وزیراعظم لارڈ سرائیلی بیت المقدس میں آیا اور اس کے اس دورہ مشرق وسطیٰ کے بعد ہی اس علاقے میں ان فتنوں نے جنم لیا جو بعد میں خلافت عثمانیہ کی موت کا باعث ہوئے۔

۲۰ دسمبر ۱۸۳۲ء کو خدیو مصر محمد علی پاشا کے بیٹے ابراہیم نے قونیہ میں ترک فوجوں کو شکست دے کر بیت المقدس پر قبضہ کرلیا مگر مئی ۱۸۳۳ء میں ایک صلح نامہ کے ذریعے محمد علی پاشا نے شام، فلسطین اور مصر کی گورنری کے عوض سلاطین ترکی کو خراج ادا کرنا منظور کیا۔

اس کے ایک سال کے بعد فرانس کی شہ پر محمد علی نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کردی لیکن شکست کھا کر شام و فلسطین سے ہاتھ اٹھالیے۔ مگر چند سال بعد لاطینی اور یونانی عیسائیوں میں شدید جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں فرانس نے لاطینیوں کی اور روس نے یونانیوں کی حمایت کی۔ بعض مورخین اس حادثہ کو جنگ کریمیا کا سبب بتاتے ہیں جس کے نتیجے میں روس کو سلطنت عثمانیہ میں مقیم عیسائی رعایا کا محافظ تسلیم کرلیا گیا۔ بالآخر ۱۸۵۶ء میں شاہی فرمان کے ذریعہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کے حقوق برابر کردیے گئے۔ جس سے عیسائیوں اور یہودیوں کو حرم شریف میں آنے کی اجازت دی گئی لیکن مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ میں وہ داخل نہیں ہوسکتے تھے۔

اس اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہودیوں نے اپنی نوآبادیاں قائم کرنا شروع کردیں اور یہ وہی دور ہے جب عالمی صیہونیت نے اپنی سازشوں کا آغاز کیا۔ مسلمانوں کی نیکی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اپنے دور اقتدار میں عیسائیوں اور یہودیوں سے ہمیشہ فراخ دلانہ سلوک کیا لیکن ان اقوام نے اس حسین سلوک کے بدلے میں مسلمانوں کے خلاف سازشیں کیں۔ فلسطین بھی ان کی سازشوں سے محفوظ نہیں رہا۔

۱۸۵۹ء میں سلطان محمود ثانی نے فلسطین کا دورہ کیا تو وہ بیت المقدس بھی آئے اور مقدس مقامات کی زیارت کی اور پھر یہودیوں کی ان شکایات کا جائزہ لیا جو وہ اکثر سلطانی عمال کے بارے میں کرتے تھے مگر یہودیوں کی ان شکایات کا جائزہ لیا تو وہ تمام شکایتیں بے بنیاد اور غلط ثابت ہوئیں۔

پھر ۱۸۶۲ء میں ایڈورڈ ہفتم زیارت کے لیے آیا۔ ۱۸۹۶ء میں بیت المقدس میں امریکی مشن نے اندھوں کا اسکول جاری کیا۔ یہ پہلا غیر ملکی ادارہ تھا۔ اسی دور میں یہودیوں نے سلطان سے پیش کش کی کہ اگر سلطان یہودیوں کو زمین خریدنے کی اجازت دے دے تو وہ ترکی کے قرضے معاف کردیں گے اور انہیں مالی امداد بھی دیں گے لیکن غیرت مند سلطان نے صاف جواب دیا کہ جب تک عثمانی سلطنت کا ایک غیور فرد بھی زندہ ہے ان کا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔

اس جواب کے بعد صیہونیوں نے سلطان مرحوم کے ذاتی دوست قیصر جرمنی کو شیشہ میں اتارنے کی کوشش کی کہ وہ سلطان کو یہودیوں کو زمین خریدنے کی اجازت دلا دے۔ قیصر نے کوشش کی مگر سلطان نے صاف انکار کردیا۔

تیرھویں صلیبی جنگ

سلطان کا منہ توڑ جواب سن کر پیامبر کو پسینہ آگیا اس نے مسلمانوں کو ایک برے اور خوفناک انجام کی دھمکی دی۔ پس اپریل ۱۹۰۹ء میں "انجمن اتحاد و ترقی" نے سلطان عبدالحمید کو معزول کرکے محمد ارشاد کو خلیفہ بنادیا۔

اسی دور میں ترکی خلیفہ نے نیا آئین دیا جس میں شام و فلسطین کی خودمختاری کو تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن اس دوران لارنس آف عریبیہ نے ترکوں اور برطانوی علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ جما لیا۔ اس نے ایک معاہدہ کیا جس میں ترکوں، عربوں اور یہودیوں کو بھی شامل کیا گیا۔ اس گٹھ جوڑ کے خلاف عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کردی اور پہلی جنگ عظیم کے دوران ۸ اور ۹ دسمبر کی درمیانی رات کو ترکوں نے بیت المقدس خالی کردیا۔ دس دسمبر کو جنرل شیا بیت المقدس پہنچا اور ترکوں نے شہر کی چابیاں اس کے حوالے کردیں۔ گیارہ دسمبر کو جنرل ایلن بی مصری اور فلسطینی فوجوں کے ساتھ یافہ گیٹ سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اس طرح سلطان صلاح الدین ایوبی کا بیت المقدس ایک بار پھر عیسائیوں کے قدموں میں آگیا۔

اس موقع پر مصری اور فلسطینی ان کی مدد کررہے تھے۔ برطانوی افسروں نے اسے آخری صلیبی جنگ کا نام دیا ہے اسے تیرھویں صلیبی جنگ بھی کہا جاسکتا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا کے مطابق ایلن بی کے داخلہ یروشلم سے پہلے ۷۲۵ سال تک یروشلم نے کسی عیسائی فاتح یا برطانوی سپاہی کو نہ دیکھا تھا۔

چنانچہ برطانیہ کے وزیراعظم چرچل نے اپنی تاریخ جنگ عظیم میں لکھا ہے۔

۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو ترک بیت المقدس سے دست بردار ہوگئے۔

اس کے چار سو سالہ دور کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف، باشندگان بیت المقدس کے واہ واہ اور مرحبا کے نعروں کی گونج میں شہر میں داخل ہوا۔

مسٹر نکسن بصد انبساط اپنی تاریخ جنگ میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

"آخری صلیبی جنگ اب اپنے عروج پر تھی اور سینٹ لوئیس اور رچرڈ شاہ انگلستان ان جرات افزاء افواج کو دیکھتے تو ان کی روحیں متحیر ہوجاتیں۔ کیونکہ اس کا بہت ہی قلیل حصہ مغربی اقوام (یورپین) پر مشتمل تھا۔ الجیری اور ہندی، مسلمان عرب قبائل، ہندوستان کے ہزار ہا فرقوں کے ماننے والے، افریقی حبشی اور یہودی افواج ان لوگوں میں شامل تھیں جنہوں نے نصاریٰ کے مقدس شہر کو آزاد کرایا۔"

افسوس کہ وہ مسلمان جنہیں بیت المقدس کی حفاظت کرنی تھی وہ نصاریٰ اور یہود سے مل گئے تھے۔ اعداد و شمار کے مطابق جنگ عظیم اول میں شام و عراق اور فلسطین وغیرہ میں مسلمان سپاہی برطانوی فوج کی کل تعداد کا ۲/۵ تھے۔

مسٹر جارج وارنر نے اپنی کتاب گرانڈ ورک آف برٹش ہسٹری میں صفحہ ۷۵۱ء پر لکھا ہے کہ۔

بیت المقدس ۱۱۸۷ء کے بعد پہلی مرتبہ ایک عیسائی ملک کے قبضہ و تصرف میں آیا۔ جنرل ایلن بی بڑے دن (کرسمس) سے پندرہ دن پہلے باضابطہ طور پر بیت المقدس میں داخل ہوا۔"

اسی مصنف نے صفحہ ۷۵۷ پر یہ نوٹ درج کیا ہے۔

"قریب قریب اسی وقت جنرل ایلن بی نے فلسطین میں شاندار پیش قدمی کی اور پیش قدمی کے انصرام اور اہتمام کا سہرا خاص طور سے ہندوستانی افواج کے سر ہے۔"

مسٹر ٹامسن نے اپنی کتاب "عرب میں لارنس"

کے ہمراہ" میں لکھا ہے کہ۔
ایلن بی نے فلسطین کو آزاد کرایا جو یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس سرزمین ہے۔ لارنس نے عرب کو آزادی دلوائی جو لاکھوں مسلمانوں کی مقدس سرزمین ہے۔"

اور برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج پارلیمنٹ میں دہاڑا۔

"آج ہم نے مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا بدلہ لے لیا ہے۔"

جنرل ایل بی کو انعام کے طور پر پچاس ہزار پونڈ کی رقم بھی دی گئی اور جارج پنجم نے ان کی خدمات کا بطور خاص اعتراف کیا۔

ایک روایت کے مطابق بیت المقدس حضرت عمرؓ کی فتح سے ۴۹۱ ہجری تک مسلمانوں کے قبضے میں رہا۔ اس سال عیسائیوں نے اسے فتح کیا اور مسلسل سات روز تک انہوں نے مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا۔ مستند بیان کے مطابق عیسائیوں نے بیت المقدس فتح کرنے کے دن جوش و سرمستی کے عالم میں ستر ہزار مسلمانوں کو شہید کیا۔

صحرا سے سونے اور چاندی کے برتن اور بے شمار مال و دولت جو محفوظ صندوقوں میں بند تھا عیسائی لٹیرے وہ سب لوٹ کر لے گئے۔ لیکن خدائے تعالیٰ نے سلطان صلاح الدین کو بیت المقدس کی آزادی پر مامور کیا۔ کیونکہ سلطان ایوبی سب سے زیادہ جری اور شیر دل سپاہی اور سلطان تھا۔

مگر افسوس کہ بیت المقدس پھر غلام ہو گیا۔ اس کا سقوط ترکی کے زوال میں معاون ثابت ہوا۔ تاریخ شاہد ہے کہ ترکوں کے دور میں بیت المقدس نے زبردست ترقی کی۔ اس مقدس شہر میں مسلمانوں کے دور میں منکرات پر مکمل پابندی عائد رہی۔

یروشلم کا امریکی مصنف جو انیسویں صدی کے آخری سالوں میں یروشلم میں امریکی قونصلیٹ رہ چکا تھا اس نے اس شہر کی عظمت اور ترقی کو اس طرح بیان کیا ہے۔ جس کو پڑھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"قدیم شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے۔ جس میں مسجد بھی شامل ہے۔ شہر کا محل وقوع ہیرود اور اس کے جانشینوں کے دور سے مختلف ہے۔ گلیاں تنگ اور عمارتیں قریب قریب واقع ہیں۔ بعض مقامات پر قدیم محراب اور عمارتیں اب تک قائم ہیں لیکن انسان ان کے قریب سے بے خطر گزر جاتا ہے۔ وہ اہم شاہراہیں جن کا تذکرہ کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک داؤد اسٹریٹ، یافہ گیٹ سے مشرقی جانب چلتی ہوئی شہر کے دوسری طرف سینٹ اسٹیفن گیٹ سے جا ملتی ہے۔ کرسچین اسٹریٹ، داؤد اسٹریٹ سے کلیسائے نشور تک جاتی ہے اور ایک تیسری گلی شمال کے باب دمشق کو جنوب کے صیہون گیٹ سے ملاتی ہے۔ قدیم شہر میں بہت کم زمین خالی نظر آئے گی۔ گو شہر ۱۲۱۰ ایکڑ پر پھیلا ہوا ہے لیکن ۱۳۵ ایکڑ رقبہ مسجد اقصیٰ میں گھرا ہے۔ اتنی ہی جگہ فوجی بیرکوں میں گھری ہوئی ہے۔ اور اس سے دوگنی زمین مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں مساجد، گرجا گھروں اور دوسری عمارتوں نے گھیری ہوئی ہے۔ یہ بطور رہائش گاہ استعمال نہیں ہوتیں اس لیے بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ ۵۵ ہزار آدمی ایک سو ایکڑ زمین پر آباد ہیں۔ اس کے بازاروں میں ہر رنگ و نسل اور ہر زبان و مذہب کے لوگ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔"

بیت المقدس کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ اس شہر میں ہر طرف مینار ہی مینار دکھائی دیتے ہیں۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں جہاں مسجد یا گرجا نہ ہو۔ مسجد اقصیٰ کے

[illegible] ۲ مساجد اور ہیں اور چھوٹے بڑے گرجوں اور راہب خانوں کی تعداد ۲۰ کے قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر گھنٹہ بعد شہر کی فضا عبادت کے لیے بلانے والی گھنٹیوں سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کے بلند میناروں سے دن میں پانچ مرتبہ اللہ اکبر کی صدا مسلمانوں کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہے۔"

شہر کے انتظام کے لیے سلطان ترکی نے "پاشا" کو مقرر کر رکھا ہے جس کی انتظامی کونسل ۹ مسلم، ایک یہودی اور ایک عیسائی رکن پر مشتمل ہے۔ اس شہر میں ہر ملک کے قونصلیٹ موجود ہیں اور وہ تمام امور جن میں فریقین غیر ملکی ہوں، مقدمہ کی سماعت اسی ملک کا قونصلیٹ کرتا ہے لیکن اگر فریق مقدمہ ترک ہو تو مقدمہ کی سماعت مقامی عدالت کرتی ہے۔

پورے شہر میں نہ کوئی اوپیرا ہے اور نہ کسی کھیل یا کنسرٹ کی اجازت ملتی ہے۔ تمام بازار آفتاب غروب ہوتے ہی بند کر دیے جاتے ہیں۔ وہاں کے لوگ جلد سو جاتے ہیں اور صبح کو جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ زمانہ کی تہذیبی ترقیوں کا ابھی اس شہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ قدیم شہر کی دیواروں سے باہر شمال و مغرب میں پچھلے کئی برسوں سے ایک نیا یروشلم عالم وجود میں آ گیا ہے۔ اس نئے یروشلم نے مختصر عرصہ میں بہت ترقی کر لی ہے۔ اس نئے شہر یروشلم میں یہودیوں کی کئی کالونیاں ہیں اور ان میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ اس وقت یہودیوں کی آبادکاری پر پابندی ہے اس کے باوجود وہ مسلسل چلے آ رہے ہیں۔

[illegible] کے مطابق ۱۸۳۸ء میں شہر کی [illegible] ہزار تھی۔ ان میں تین ہزار یہودی تھے۔ [illegible] کے مطابق یہودیوں کی تعداد تین ہزار سے بڑھ کر سات ہزار ہو گئی تھی۔ پھر ۴۵ سال بعد اس کی آبادی میں دس گنا اضافہ ہوا۔ یہودی اپنے آبائی شہر کو پھر سے یہودی شہر بنانے کی فکر میں رات دن لگے رہتے ہیں۔

برطانیہ کے زیر اثر

برطانوی انتداب کے نام سے ویلبس کی کتاب ۱۸۹۸ء میں شائع ہوئی تھی اور اس میں واضح طور پر یہودیوں کے عزائم سامنے آ چکے تھے۔ اس کے باوجود عربوں نے حالات کا رخ نہیں پہچانا اور نہ پروا کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لارنس کا شکار ہو گئے۔ برطانیہ نے عربوں کو مکر و فریب سے اس جنگ میں اپنے ساتھ ملایا اور یہ وعدہ کیا تھا کہ جنگ کے بعد ان کی مرضی کی حکومت قائم ہو گی لیکن ۱۹۲۰ء میں صلح کانفرنس میں فلسطین کو برطانیہ کا زیر اثر علاقہ قرار دے کر سر رابرٹ سیموئیل کو وہاں کا ہائی کمشنر مقرر کر کے اسے بیت المقدس پہنچا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہودی عزائم تکمیل کو پہنچنے لگے۔

ہائی کمشنر سیموئیل یہودی تھا۔ اس نے کھل کر صیہونیت کا ساتھ دیا۔ اس کی اس جانب داری کے بارے میں ایک برطانوی منصف مزاج مصنف نے لکھا ہے۔

"اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ دنیا رابرٹ سیموئیل کو برطانوی ہائی کمشنر کے طور پر بیت المقدس بھیجنے کے پس منظر میں کارفرما سازشوں سے بے خبر ہے۔ تو یہ اس کی حماقت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سیموئیل کی تقرری نے برطانیہ کی حیثیت کو نازک بنا دیا ہے۔"

سیموئیل کے ہائی کمشنر ہوتے ہی فلسطین میں یہودیوں کی آمد میں روز بروز اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور انہوں نے برطانیہ کے زور پر اودھم مچانا شروع کر دیا۔ آخر ۱۹۳۶ء میں عرب ہائی کمیٹی قائم ہوئی

جس کی اپیل پر برطانیہ کے مسلم کش رویہ پر یہودی داخلہ کے خلاف چھ ماہ تک یادگار زمانہ ہڑتال رہی۔ اس کمیٹی کے صدر یروشلم کے مفتی اعظم امین الحسینی آفندی تھے۔ حکومت برطانیہ نے آفندی کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کردیے۔ آپ مسجد اقصیٰ میں معتکف ہوگئے۔ برطانوی سپاہیوں نے مسجد کا محاصرہ کرلیا لیکن مفتی اعظم بھیس بدل کر اس محاصرے سے نکلے اور شام سے ہوتے ہوئے لبنان پہنچے۔ اسی سال یہودی صیہونی ایجنسی قائم کر کے حکومت برطانیہ کے تعاون سے اپنی سازشوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا۔ یہودی فلسطین کو یہودی ریاست بنانا چاہتے تھے۔ پس ملک گیر فسادات شروع ہوگئے۔ بیت المقدس کی گلیاں متعدد بار انسانی خون سے رنگین ہوئیں۔ اس طرح برطانیہ کی حمایت سے یہودی روز بروز زور پکڑتے گئے۔

پھر ۱۹۲۸ء میں یہودیوں کے اور بہت سے نئے نئے محلے بن گئے۔ جبل زیتون پر یہودیوں کی یونیورسٹی کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ انگریزوں نے عربی کے پہلو بہ پہلو عبرانی کو سرکاری زبان کا درجہ دے دیا یہاں تک کہ ریلوے ٹائم ٹیبل بھی عبرانی زبان میں شائع ہونے لگے۔

اسی زمانہ میں قدس کی آبادی دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ اندرونِ شہر فصیل سے محصور ہے۔ جس کے سات دروازے ہیں۔ غربی دروازہ باب الخلیل کہلاتا ہے۔ جنوب کے دو دروازے باب داؤد اور باب المضاربہ، مشرق میں باب الاسباط اور شمال میں تین دروازے باب الساحرہ، باب الصخرہ اور باب الجدید تھے۔ فصیل سے باہر نیا شہر آباد ہے۔ مسجد اقصیٰ اور مسجد عمر کے علاوہ شہر میں شیخ محمد المامیرنی، شیخ قرمی، شیخ المشبت، شیخ بایزید بسطامی، شیخ جلال الدین رومی، شیخ فرید، شیخ حسن کے مزارات زیارت گاہِ عوام ہیں۔ مسجد اقصیٰ کی مشرقی دیوار کے بالمقابل سیدنا شداد بن اولیس انصاری اور عبادہ بن صامت کے مزارات ہیں۔ کوہ طور الزیت کے دامن میں سید محمد علمی کا مزار ہے۔ اس کے متصل قبۃ شہداء، غربی جانب حضرت رابعہ عدویہ اور مشرقی جانب سیدنا عکاشہ، سیدنا قیم اور مسجد کی شمالی فصیل کے قریب غار میں سیدنا سلطان ابراہیم ادھم اور شیخ حسن راہی کے مزارات ہیں۔

(حوالہ: زیارت القدس وشام)

مولانا حفظ الرحمٰن نے ۱۹۳۸ء میں اپنی تصنیف "راہ وفا" میں لکھا ہے۔

"ترکوں نے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے زمینوں کے ٹکڑے وقف کردیے تھے جن پر ان ملکوں کے آنے والے زائرین کے قیام و رہائش کے لیے مسافر خانے تعمیر ہوئے جو اب تک قائم ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا محمد علی جوہر کی تحریک پر ہندوستان کے مخصوص قطعہ اراضی پر خواجہ ناصر حسن انصاری نے "زاویہ ہندی" کے نام سے مسافر خانہ تعمیر کیا۔ قبرستان شہداء میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے شہید ساتھی دفن ہیں۔ صحن حرم میں مولانا محمد علی جوہر مدفون ہیں۔ اقتصادی، انفرادی، سیاسی اور مذہبی شعبوں پر حکومت برطانیہ کا اثر ہے جس کی وجہ سے اس سرزمین قدس پر ہنگامہ دار و گیر برپا ہے اور مسلمانوں کے حقوق ان کی معبدگاہیں، جائیدادیں اور جان و مال خطرے میں ہیں۔ جس وقت سے برطانیہ کا قبضہ ہوا یہودیوں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور حکومت برطانیہ نے چاروں طرف سے یہودیوں کو لا لا کر یہاں آباد کیا۔ مسلمانوں کی زرخیز زمینیں اور آباد محلے آج یہودیوں کے قبضے میں ہیں۔ حالانکہ آج سے ستر سال پہلے الخلیل (حبرون) کو

چھوڑ کر ہوئے قدس سے باہر یہودیوں کی ایک چھوٹی سی آبادی "ما شوڈم" (یعنی سو گھر) تھی۔ قدیم شہر میں [illegible] ملکوں کے لوگ آباد ہیں اور شہر میں مسجد اقصیٰ کے علاوہ ۲۸ مساجد ہیں۔"

یہ خونِ شہیداں

اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو عالمی اہمیت کا علاقہ قرار دیتے ہوئے تقسیم فلسطین کے منصوبے میں بیت المقدس کو بین الاقوامی سرپرستی میں دینے کا فیصلہ کیا۔ یہودیوں نے اس پر خوب بغلیں بجائیں لیکن عربوں نے اس ناانصافی کے خلاف سر جھکانے سے انکار کردیا۔

دوسری جانب تقسیم فلسطین کا اعلان ہوتے ہی یہودیوں نے عربوں کا قتل عام شروع کردیا۔ مفتی اعظم کی مختصری فوج یہودیوں کے مقابلے پر نکلی اور لاکھوں یہودیوں کے سامنے سینہ سپر ہوگئی۔ یہودیوں کو ایک طرف صیہونی ایجنسی کی مدد حاصل تھی اور دوسری طرف بعض ممالک جن میں چیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ اور رومانیہ وغیرہ پیش پیش تھے انہوں نے اسلحہ سے یہودیوں کی مدد شروع کردی۔ سب سے آگے برطانوی حکومت تھی۔ اس نے یہودیوں کو جدید اسلحہ اور خاص کر سنچورین ٹینک فراہم کردیے اور انہیں عرب علاقوں پر قبضے کے لیے اکسایا اور عرب آبادی کو محفوظ مقامات پر پہنچانے کے بہانے شہروں کے شہر مسلمانوں سے خالی کرا لیے۔ پس ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو جب برطانیہ رخصت ہوا تو دیر یاسین، طبریہ، حیفہ، سمغ، سلامہ، بیسان اور بیت المقدس (نیا شہر) عربوں سے بالکل خالی ہوچکے تھے۔

۱۹۴۸ء قتل عام

برطانیہ نے یہودیوں کی ملی بھگت سے اعلان [illegible] فلسطین کو ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء میں خالی کردے گا۔ صرف حیفہ کی بندرگاہ سے افواج اگست میں ہٹیں گی۔ مگر انہوں نے حیفہ کو بھی ۱۴ مئی کو خالی کیا اور ۱۵ مئی کو اسلحہ اور گولہ بارود سے بھرے جہاز حیفہ کی بندرگاہ پر آگئے۔ اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی ایک بڑی فوج کے ساتھ بیت المقدس کا محاصرہ کرلیا۔

اخوان مجاہد گزشتہ چار ماہ سے شہر میں یہودیوں سے نبرد آزما تھے۔ ان کے پاس اسلحہ پرانا اور بہت کم مقدار میں تھا۔ لیکن وہ جوش ایمانی اور شوق شہادت کے جذبات سے سرشار تھے۔ وہ دشمن کا مقابلہ کرتے رہے۔ اس وقت مقامی آبادی کے علاوہ گرد و نواح کے بیس ہزار مسلمان بیت المقدس میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ یہودی چند ہفتے پہلے دیر یاسین میں قتل عام کرچکے تھے اب بیت المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا مطلب یہ تھا کہ یہاں بھی دیر یاسین کا قتل عام دہرایا جائے۔ ادھر اخوان کے پاس گولہ بارود ختم ہو رہا تھا۔ انہوں نے عرب لیجن سے مدد مانگی لیکن جنرل گلب پاشا نے بعض سیاسی اور مذہبی وجوہ کی بناء پر ایک فوجی بنیاد کی آڑ میں شہر کو خالی کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر اس مشورے کو اخوان نے مسترد کردیا۔

اخوان دستوں کے قائد نے کہا۔

"یہودی ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔"

عرب لیجن سے مایوس ہوکر بیت المقدس کی پوری آبادی سر سے کفن باندھ کر گھروں سے نکل آئی۔ رات بھر شدید جنگ ہوتی رہی اور صبح کے وقت یہودی پسپا ہونے لگے۔ اردنی فوج کے ایک ذمہ دار افسر کو اس صورت حال کی خبر ملی تو جنرل گلب بادشاہ کی مخالفت کے باوجود اور یہودیوں کی تازہ دم فوج سے پہلے، پچھلے پہر اردنی فوج شہر میں داخل ہوگئی۔ یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اخوان کے ثبات و

استقلال نے بیت المقدس کو مسلمانوں کے لیے محفوظ کرلیا۔

۸ جولائی کو یہودیوں نے پھر حملہ کیا لیکن شدید جنگ اور زبردست نقصان اٹھانے کے بعد پسپا ہو گئے۔اس مرحلہ پر اقوام متحدہ یہودیوں کی مدد کو آگے بڑھی لیکن اقوام متحدہ کے احترام میں عربوں نے ابھی ہتھیار رکھے ہی تھے کہ ۲۵ جولائی کو یہودیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے بیت المقدس کے چوراسی فیصد رقبہ پر قبضہ کرلیا اور مسلمان صرف قدیم شہر تک محدود ہو کر رہ گئے۔

اس کے بعد ۲۹ اگست ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو غیر مسلح قرار دینے کی قرارداد منظور کی مگر اسے یہودیوں نے مسترد کر دیا اور مطالبہ کیا کہ بیت المقدس کی موجودہ پوزیشن کو برقرار رکھا جائے۔

پھر چند دنوں بعد اقوام متحدہ پر الزام لگا کہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے کی اہلیت نہیں رکھتی اور بیت المقدس سے متعلق اقوام متحدہ کی تمام قراردادوں کو ماننے سے بالکل انکار کر دیا اس کے ساتھ ہی بیت المقدس کو اسرائیلی دارالسلطنت بنانے کی باتیں شروع کردیں۔

ادھر اقوام متحدہ نے ایک اور قرارداد کے ذریعے یہودیوں پر واضح کر دیا کہ بیت المقدس کو دارالسلطنت نہیں بنا سکتے لیکن اسرائیل نے اسے بھی نظر انداز کر دیا اور پارلیمنٹ کی منظوری سے بیت المقدس کو اسرائیل کا مستقل دارالسلطنت قرار دے کر وزارت خارجہ کے سوا اکثر دفاتر نئے بیت المقدس منتقل کردیئے اور جون ۱۹۵۳ء میں وزارت خارجہ بھی بیت المقدس منتقل ہوگئی۔

۹ جولائی ۱۹۵۳ء کو امریکا نے بھی برطانیہ، مشرقی جرمنی، روس، فرانس، اٹلی، جاپان، ترکی، کینیڈا، آسٹریلیا، سوئٹزرلینڈ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ کی طرح اپنا سفارت خانہ تل ابیب سے بیت المقدس منتقل کردینے سے انکار کر دیا لیکن اکثر ممالک کے سفارتی مشن بیت المقدس آ گئے۔

یہاں اس بات کا خیال رہے کہ جون ۶۷ء کی جنگ تک ڈیلی دارالسلطنت تل ابیب تھا۔ یہاں بیت المقدس سے بیرونی فصیل مراد ہے۔

بیت المقدس کا اسرائیل میں انضمام

۷ جون ۱۹۶۷ء کو اسرائیل نے قدیم بیت المقدس پر قبضہ کرلیا اور ۴ جولائی ۱۹۶۷ء کو اقوام متحدہ نے قرارداد نمبر ۲۲۵۳ ای۔ ایس۔ وی کے ذریعے بیت المقدس کو اسرائیل میں مدغم کرنے کے اقدام کو غیر قانونی قرار دیا۔اس قرارداد کے حق میں ۹۹ ووٹ آئے۔ کسی نے مخالفت نہیں کی البتہ امریکا اور اسرائیل غیر حاضر رہے۔

پھر ۱۴ جولائی ۶۷ء کو جنرل اسمبلی نے اس قرارداد کی توثیق کی۔

۲۱ مئی ۱۹۶۸ء کو سلامتی کونسل نے اسرائیل کے رویئے کی مذمت کی اور ۴ اور ۱۴ جولائی کی قراردادوں پر اصرار کرتے ہوئے اسرائیلی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور رائے عامہ کے منافی قرار دیا۔مگر اسرائیل نے اقوام متحدہ کی قرارداد اس کے منہ پر دے ماری۔

اور آج بیت المقدس اسرائیلی ظلم و استبداد کا شکار ہے۔ بے گناہ عوام ہی نہیں خواتین اور بچوں کو بھی یہودی اپنی سنگینوں اور رائفلوں کا شکار بنا رہے ہیں اور مسلمان منتظر ہیں ایک نئے صلاح الدین ایوبی کے جو انہیں یہودیوں اور ان کے حلیفوں برطانیہ اور امریکا کی ستم رانیوں سے نجات دلائے۔ (آمین)

بیت المقدس کی شہر پناہ

کتاب مقدس میں اس شہر کی دیواروں اور دروں کا

ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ آنے والی نسلیں اس پر فخر کریں گی اور اس شہر پناہ کو دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتاب مقدس کے عہد کا وہ شہر آج ناپید ہے۔ اور اس کی جگہ جو شہر کھڑا ہے اس کے متعلق آثار قدیمہ کے ماہرین کا یہ خیال کہ یہ اس مقام پر نہیں جہاں شہر داؤد اور سلیمان تھا۔ بلکہ اس کی جگہ اور مقام کسی حد تک تبدیل ہو چکے ہیں۔

''یروشلم مقدس'' کا امریکی مصنف ایڈون کہتا ہے کہ یہ شہر اس جگہ نہیں جہاں ہیرود اور اس کے جانشینوں کے عہد میں واقع تھا۔ بلکہ اس دور کا شہر موجودہ شہر سے تین گنا بڑا تھا اور مکانات آج کل کے مکانات سے زیادہ قریب اور تنگ تھے۔ البتہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ شہر کی موجودہ عمارات قدیم کھنڈرات کے ملبے سے تعمیر ہوئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اکثر عمارتوں پر عہد ہیرود کی باقیات ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

اس شہر کی معلوم تاریخ میں یہ کئی بار اجڑا اور از سر نو تعمیر ہوا اور اس دوران اس کی شہر پناہ بھی کئی بار تعمیر ہوئی۔ پہلے عہد داؤدؑ میں تعمیر ہوا اور پھر حضرت سلیمانؑ نے اس کی مرمت کرائی۔ کتاب سلاطین میں ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے اپنے باپ داؤدؑ کے شہر کے گرد فصیل تعمیر کرائی تو ''یربعام'' افرائیمی نے مخالفت کی۔ اس بات پر حضرت سلیمانؑ نے اسے بنی یوسف پر حاکم بنا کر شہر سے باہر بھیج دیا لیکن حضرت سلیمانؑ کے چار سو سال بعد یہ شہر پناہ بابل کے بخت نصر کے ہاتھوں تباہ ہوئی جس نے فصیل شہر کو گرا کر ہل چلوا دیے۔

دوسری فصیل کی تعمیر کا کام بابل کی قید سے واپسی پر (۴۴۵ ق۔م) کے لگ بھگ شروع ہوا۔ یہ شہر پناہ یہود کے قبائل نے آپس میں تقسیم کار کے اصول پر بنائی اور اس کی تعمیر میں مقامی لوگوں کے علاوہ اہل فارس، رومیوں، شامیوں اور مصریوں نے مداخلت کی مگر تعمیر کا کام جاری رہا اور اسے مکمل کیا گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شہر پناہ پہلی فصیل کے کھنڈرات ہی پر اٹھائی گئی تھی اس لیے شہر کے محل وقوع میں کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ ڈاکٹر رابنسن کے اندازے کے مطابق اس شہر پناہ کی تعمیر شہر کے شمالی حصے سے شروع ہوئی۔ اس کی مغربی حد موجودہ باب دمشق کی جگہ تھی۔ یہاں سے وہ جنوب کو مڑ گئی تھی۔ لیکن یہ شہر پناہ حملہ آوروں کی ستم رانیوں کا شکار رہی۔

بعض مورخین کا خیال ہے کہ شہر پناہ کی تیسری تعمیر ہیرود کے جانشین ہیرود اغریپا نے حضرت عیسیٰؑ کی پیغمبری کے ۱۲ سال بعد شروع کی۔ ہیرود اغریپا کا تعمیراتی کام اتنا عظیم اور شاندار تھا کہ شام کے رومی حکمران کے ذہن میں شک پیدا ہو گیا کہ یہ سب کچھ ایک نئی بغاوت کی تیاری ہے۔ چنانچہ اس نے ''کلاڈیس سیزر'' کے نام ایک خط میں اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ جس کے نتیجے میں کلاڈیس نے اغریپا کو مزید تعمیر سے روک دیا۔ مگر بعد میں یہودیوں نے اپنے روایتی حربوں سے کام لیتے ہوئے اس کی جزوی تعمیر کا اجازت نامہ حاصل کر لیا۔

جوسیفس نے اس شہر کی بہت تعریف کی ہے۔ اس کی دیواروں میں ۲۰ ہاتھ لمبے اور دس ہاتھ چوڑے پتھر لگائے گئے تھے جن کا اٹھانا اور بلند کرنا انسانی طاقت سے بالاتر نظر آتا تھا۔ یہ فصیل ۷۱ء میں طیطس رومی کے حملے کا شکار ہو گئی اور ۶۱۴ء کے بعد تو قطعاً ملبے کا ڈھیر بن گئی تھی۔

موجودہ فصیل ترکان عثمانی کے دوسرے حکمران سلیمان اعظم نے تعمیر کرائی۔ سلطان اعظم کے والد سلطان سلیم نے ۱۵۱۷ء میں اس شہر کو اپنی سلطنت

میں شامل کر لیا تھا۔ سلیمان اعظم نے تعمیر کی نگرانی دو بھائیوں کو سونپی تھی جنہوں نے ۱۵۳۶ء میں یافہ گیٹ سے مخالف سمتوں میں کام کا آغاز کیا اور وہ اس کی تکمیل تک ایک دوسرے سے نہ مل سکے۔ سات سال بعد ۱۵۴۲ء میں موجودہ سینٹ اسٹیفن گیٹ پر ان کی ملاقات ہوئی۔ اس خوشی میں انہوں نے دروازے پر چار شیر بنائے۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شہر پناہ کی ہر تعمیر کے ساتھ اس کے دروازوں کے ناموں میں کچھ نہ کچھ ردوبدل ہوتا رہا۔ بیشتر عرب جغرافیہ دانوں نے ان دروازوں کا ذکر ضمناً کیا اور صرف دو عرب مصنف اس کا تفصیلی حال بیان کرتے ہیں۔ یعنی مقدسی ۹۸۵ء میں اور مجیر الدین ۱۴۹۶ء میں۔ ان تاریخوں کے درمیان یہ شہر تقریباً ایک صدی تک صلیبیوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ مقدسی اور مجیر الدین کے بیان کردہ نام مختلف ہیں۔ البتہ مجیر الدین نے جن دروازوں کا ذکر کیا ہے وہ آج تک کھلے ہوئے اور زیر استعمال ہیں۔

مقدسی نے بالا حصار کے آٹھ دروازے بتائے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔

باب صیہون، باب البقہ (دشت)، باب البلاط (محل یا دریا)، باب ارمیہ (حضرت ارمیہ کا گڑھا)، باب سلوان یا صلوان، باب اریحا باب ملعمود (ستون)، باب محراب داؤد۔

اس آخری دروازے یعنی باب محراب داؤد کو آج کل یافہ گیٹ بھی کہتے ہیں۔ مقامی لوگ اسے باب الخلیل یا باب حبرون کہتے ہیں۔ کیونکہ خلیل اللہ کے شہر حبرون جانے والے زائر اسی راستے سے جاتے ہیں۔ مقدسی نے اس سلسلے میں بالا حصار کا ذکر کیا ہے۔ وہ اس دروازے سے ذرا دور پرے کے رخ اب تک موجود ہے اور اس میں وہ محراب بھی سلامت ہے جس سے یہ دروازہ منسوب کیا جاتا ہے۔

مقدسی کا باب صیہون جنوبی دیوار میں باب حبرون کے بعد دوسرا دروازہ ہے جسے آج کل باب النبی داؤدؑ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ مجیر الدین نے اسے ''باب مارۃ الیہود'' کہتا ہے۔ اس کے قریب ہی حضرت داؤد علیہ السلام کا مزار ہے۔

باب اریحا وہ ہے جسے چودھویں صدی سے سینٹ اسٹیفن گیٹ کا نام دیا گیا ہے۔ یہ دروازہ دسویں صدی عیسوی میں ''جریکو گیٹ'' کہلاتا تھا۔ اسے باب الاسباط یا مریم متی کا دروازہ بھی کہتے ہیں۔ برکتہ اسرائیل اس دروازے کے باہر ہے جو نہایت قدیم تالاب ہے۔

باب جب ارمیہ شمال کا چھوٹا دروازہ باب الساھرہ ہے اور قدیم زمانہ میں ہیرود گیٹ کہلاتا تھا۔ اس کے قریب ہی وہ میدان ہے جہاں بعض روایات کے مطابق روز محشر ساری مخلوق جمع ہو گی اور ایک خندق بھی ہے جس کے بارے میں عام روایت ہے کہ اسے سلطان صلاح الدین ایوبی نے کھدوایا تھا لیکن مقدسی اسے ''گڑھا'' کا دروازہ کہتا ہے جس کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ یہ خندق قدیم دور سے ہے۔ البتہ اتنا ضرور ممکن ہے کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اسے مزید مستحکم اور استوار کیا ہو۔

مقدسی کا باب عمود آج بھی اسی نام سے شمالی دیوار کے وسط میں واقع ہے۔ اسے باب دمشق بھی کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہاں سے ایک سڑک نابلس اور دمشق کو جاتی ہے۔ عیسائی روایات کے مطابق قبول مسیحیت کے بعد سینٹ پال اسی راستے سے شہر مقدس میں داخل ہوئے تھے۔ محاربات صلیب کے وقت یہ دروازہ سینٹ اسٹیفن سے منسوب تھا کیونکہ وہ جگہ جہاں یہود نے سینٹ اسٹیفن کو سنگسار کیا وہ اسی

دروازے کے باہر چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر تھیوڈوسیس ثانی کی ملکہ اُدوسیا نے ۴۵۵ء میں ایک گرجا بنادیا تھا۔ ملکہ اس گرجا میں مدفون ہے۔ اس گرجا سے کچھ فاصلے پر بادشاہوں کے مقبرے ہیں جو شرقی میسوپوٹمیا کے لیے تعمیر ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ دین موسیٰ قبول کرنے کے بعد ملکہ اپنے بیٹے ازیتیس کے ہمراہ شہر قدس آئی اور ازیتیس کے بیس بیٹے اس شہر میں آباد ہوگئے۔ ملکہ اور ازیتیس ان قبروں میں دفن ہیں۔ ان سے کچھ فاصلہ پر مسلمانوں کا قبرستان اور حضرت سلیمانؑ کی بھٹیاں ہیں۔

مقدسی کا باب التیہ اور باب صلوان آج کل معدوم ہے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ باب التیہ مجیر الدین کا باب السرب (چوردروازہ) ہے جو کبھی باب صیہون اور باب حبرون کے درمیان ارمنی خانقاہ کے قریب کھلتا تھا لیکن آج کل بند ہے۔

باب صلوان، مشرقی دیوار میں آج کا باب المغاربہ ہے جسے فرنگیوں نے کوٹھڑی دروازے کا نام دیا تھا۔ باب البلاط غالباً مجیر الدین کے باب الرحمیہ (الرمیہ) کا قدیم نام تھا جو کبھی باب حبرون کے شمال میں شہر پناہ کے پہلو پر تھا لیکن پچھلی صدی میں اسے بند کردیا گیا۔ ادریسی ۱۱۵۴ء میں باب الرحمہ کا ذکر بھی کرتا ہے جسے مسیحی گولڈن گیٹ کہتے ہیں۔ ادریسی لکھتا ہے۔

”یہ دروازہ شہر کے مشرقی پہلو پر ہے مگر عام طور پر بند رہتا ہے اور صرف شاخِ زیتون کے میلے کے دن کھولا جاتا ہے۔“

اوایچ پیری اپنی ”کتابِ زیارات یروشلم“ مطبوعہ ۱۱۹۲ میں اس دروازے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

”یہ معبد سلیمانی کے مشرقی دروازے کی جگہ قائم ہے۔ حضرت عیسیٰ پام سنڈے کو اسی دروازے سے ہیکل میں داخل ہوئے۔ یہ دروازہ ۶۲۹ء میں مقدس صلیب ملنے کی یادگار کے طور پر ہرکولیس نے تعمیر کرایا تھا۔ عہد صلیبی میں یہ دروازہ دو مرتبہ کھلتا تھا۔ ایک مرتبہ پام سنڈے کے جشن کے لیے اور دوسری مرتبہ ۱۴ ستمبر کو مقدس صلیب ملنے کے روز۔ ترکوں نے اسے دوبارہ تعمیر کرایا لیکن کبھی استعمال نہیں کیا۔

اس سے باہر ایک محراب بنی ہوئی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حضرت مہدی آخر الزماں بعثت کے بعد اسی جگہ تشریف لائیں گے۔

پیری مزید لکھتا ہے کہ اس دیوار کا جو حصہ مسجد اقصیٰ سے ملحق ہے۔ اس جگہ واقع ایک مینار سے سینٹ جیمز کو گرا کر ہلاک کیا گیا تھا۔

مجیر الدین کے باب الداعیہ (موری دروازہ) کی آج کل نشاندہی ممکن نہیں ہے۔ البتہ قیاس کہتا ہے کہ یہ باب ہیرود سے کسی قدر مغرب میں ہوگا۔

قصر جلوہ۔ باب الحمید

پیری شمالی دیوار کے مغربی کونے میں قصر جلوہ (گولایتھ کا محل) سے متصل باب الحمید کا ذکر کرتا ہے۔ جو ۱۸۸۹ء میں تعمیر ہوا۔ وہ لکھتا ہے کہ نیا یروشلم اسی دروازے سے باہر ہے۔ پیری مزید بتاتا ہے کہ عہد ہیرود میں تھیٹر، سرکس اور جمناسٹک کے مقابلے مغربی دیوار سے باہر میدان میں ہوتے تھے۔ اس کے مطابق مغربی دیوار میں قدیم نکوپلس گیٹ کی جگہ آج کل باب السلسلہ ہے۔ مجیر الدین نے خانقاہ شیخ ابن عبداللہ کے قریب باب الزاویہ اور شہر کے مشرقی گوشہ پر ”باب خارہ طور“ کا ہونا بیان کیا ہے لیکن آج کل ان کا کوئی نشان نہیں ملتا۔

وادیاں

بیت المقدس کو بجا طور پر پہاڑیوں اور وادیوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ اس کے تین اطراف میں پھیلی ہوئی وادیوں نے اسے ایک عظیم اور منفرد شہر بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص کر ”ہنوم اور کیدرون“ کی وادیاں خاص طور سے بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر ان وادیوں کا رخ کسی اور سمت ہوتا تو بیت المقدس کبھی اس جگہ آباد نہ ہوسکتا۔ کیونکہ موریا اور زیتون کی پہاڑیوں اور کیدرون، ہنوم اور ان کی درمیانی وادی کے بغیر اس شہر کا تصور ہی ممکن نہ تھا۔

وادی ہنوم

کتابِ مقدس کے مطابق اپنے پہلے معلوم مالک ہیک گائی یا گائی بن ہنوم سے منسوب ہے۔ ہیرد بن ہنوم نے اس جگہ اپنے ڈیرے ڈالے اور یہیں سے آگے بڑھ کر شہر پر قابض ہوگیا۔ یہ وادی شہر پناہ کے شمال مغربی کونے سے شمال میں نصف میل کے فاصلے پر شروع ہوتی ہے۔ پہلے جنوب مغربی سمت، پھر جنوب کا رخ کرتی ہے۔ اس جگہ یہ مقابلتاً ہموار ہے۔ وہاں مسلمانوں کا ایک قبرستان ہے جس کے وسط میں جیہون کا بالائی تالاب جسے اب برکتہ المیلہ کہا جاتا ہے واقع ہے۔ اس تالاب سے قدرے جنوب میں اترائی تیز ہوجاتی ہے اور تقریباً ڈھائی میل کے فاصلے پر جیہون کا زیریں تالاب (برکتہ السلطان) واقع ہے۔

وادی میں دائیں سمت اونچی ڈھلوان چٹانیں ہیں جن میں پتھر تراش کر مزارات بنائے گئے۔ جنہیں بادشاہوں کے مقبرے کہا جاتا ہے۔ آج کل ان عمارتوں کو ملازمین کی رہائش کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ جگہ باغِ دمشق سے ایک تہائی میل کے فاصلے پر ہے۔ اس جگہ سے آگے پہاڑی راستے پر بلند ہوکر ہل آف ایول کونسل تک چلی گئی ہے۔ اس کی بائیں جانب جیہون کی ڈھلوانیں ہیں۔

یہ وادی قدرے تنگ ہے۔ وہاں زیتون کے درخت ہیں۔ اس کے بعد اچانک مشرق کی طرف مڑتی اور وسیع ہوکر ایک مستطیل شکل میں بدل جاتی ہے۔ وادی کے اس حصے کو پہلے ”ٹوفٹ“ کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس میں چھوٹے چھوٹے خداؤں کے بت نصب کردیے گئے اور ان کے سامنے قربانیاں دی جانے لگیں لیکن ان کے جانشین پاک باز ”جوسیاہ“ نے یہ روایت ختم کردی۔ اسے وادی ”المس“ بھی کہا جاتا ہے۔ یہودی ربیوں کے مطابق یہ وادی جہنم کے دروازے پر ہے۔ اس وادی میں ہمیشہ بے تحاشا خون بہا ہے۔ کنعانی، یہودی، فارسی، شامی، رومی، فرانسیسی اور مسلمان خون۔

ذرا آگے بڑھیں۔ تقریباً پانچ سو گز تو ہم وادی کیدون اور وادی ہنوم کے نقطہ اتصال پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور یہاں تمیں ایکڑ تک کا رقبہ ہموار اور مسطح ہے۔ یہ جگہ کوہ موریا یا مسجد اقصیٰ کے فرش سے تین سو فٹ نیچی ہے۔ اسی مسطح ٹکڑے کے جنوبی کونے میں بیرایوب ہے جس کے بارے میں واضح طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں کہ یہ کب سے ہے؟ اسلامی قبضہ کے فوراً بعد اس کا موجود ہونا کتابوں سے ثابت ہے اور مسلمانوں نے ہی اسے ”بیرایوب“ کا نام دیا۔

کیدون اور ہنوم کے ملنے سے جو وادی بنتی ہے اسے ”وادی نار“ کہا جاتا ہے۔

شہر کے مشرق میں وادی کیدرون ہے۔ کیدرون بائبل کا دیا ہوا نام ہے۔ عام طور پر اسے چوتھی صدی عیسوی سے ”جیوشیفٹ“ کی وادی کہا جاتا ہے۔ مقامی لوگ اسے ”مریم سیتی“ کی وادی کہتے ہیں۔ یہ وادی فصیل سے ایک میل تک چلی گئی ہے۔ آدھے راستے تک اس کا رخ جنوبی ہے اور خوب کاشت ہوتی ہے۔ وادی کے سرے پر پتھروں کو کاٹ کر بنائے گئے مکانات کی کثرت ہے جو کبھی مزارات

تھے مگر آج کل کسانوں کی رہائش گاہیں بنے ہوئے ہیں۔ جنوبی رخ کے بعد قدرے جھکاؤ کے ساتھ چوتھائی میل تک مشرق کی طرف چلی جاتی ہے۔ پھر جنوب کا رخ اختیار کرتی ہے۔ یہاں تک کہ بحیرۂ مردار میں جا کر گم ہوجاتی ہے۔

اس وادی کے آخری موڑ پر "شمعون" کا مزار ہے۔ اس کے علاوہ فصیل شہر سے متصل اس وادی میں مسلمانوں کے مزارات، ابی سلوم کی لاٹ، سینٹ جیمز اور زکریا کے مزارات اور ان سے ذرا ہٹ کے جیسن مین باغ واقع ہے۔ بائیں طرف حضرت مریم کا گرجا ہے جہاں روایات کے مطابق مریمؑ، ان کا خاوند جوزف اور والدین دفن ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سینٹ میری کا گرجا ملکہ "ہیلینا" نے تلاش کیا تھا۔

اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد ہے۔ یہاں سیاح حضرت مریمؑ کے مقبرہ کی زیارت کے بعد نوافل ادا کرتے ہیں۔ قاضی مجیر الدین نے لکھا ہے۔

"حضرت عمرؓ جب سینٹ میری کے گرجا کے قریب سے گزرے تو انہوں نے دو رکعت نفل ادا کیے اور اس جگہ بعد میں مسجد تعمیر کردی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ محاربات صلیب کے دوران صلیبیوں نے اس مسجد کو شہید کردیا تھا۔"

جیس سن کے باغ سے دو سو گز کے فاصلہ پر چار مزارات ہیں۔ جن کی اصل حقیقت مشکوک ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ ابی سلوم بن سلیمان، زکریا، جیوشیفٹ اور سینٹ جیمز کے یہ مقبرے ہیں۔ ان مزارات کے قریب ہی پتھریلے ستونوں پر ایک پل بنا ہوا ہے۔ جس کی تعمیر کی تاریخ اب تک معلوم نہ ہوسکی۔ اس سے پانچ سو گز کے فاصلے پر "کنواری کا چشمہ" ہے۔ چشمہ ایک غار میں وادی کی سطح سے کم از کم بیس فٹ نیچے ہے اور وہاں تک سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا ہے۔ مقامی لوگ اسے "عین الدراج" کہتے ہیں۔ قریب ہی حزقیاہ کا تعمیر کردہ تالاب ہے۔

اس چشمے سے نیچے وادی ایک وسیع منظر پیش کرتی ہوئی وادی الوعد میں جا ملتی ہے۔ وادی الوعد کی سطح وادی کیدرون سے تیس فٹ اونچی ہے۔

وادی کیدرون کے بارے میں مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں عام تاثر یہ ہے کہ "میدان حشر" یہیں ہوگا۔

وادی الوعد جسے سینس، چیز موگرز کی وادی اور ٹائروبین کا نام دیتا ہے۔ شہر کو تقسیم کرتی ہوئی باب دمشق میں سلوم تک چلی گئی ہے۔ کوہ زیتون اس کے مغرب میں اور کوہ موریا مشرق میں ہے۔ سلوم کا تالاب شمالی دیوار کے چھوٹے دروازے کے قریب ۵۰ فٹ لمبا، دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ گہرا چشمہ ہے جسے صلاح الدین ایوبی نے دوبارہ تعمیر کرایا تھا۔

پہاڑیاں

یہ مقدس شہر موریہ اور صیہون کی پہاڑیوں پر واقع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کو پہاڑیاں کہنا مبالغہ ہے کیونکہ صیہون بحیرۂ روم سے صرف ۲۶۰۰ فٹ اور موریہ سے ۲۵۰۰ فٹ بلند ہے۔ ان کی اہمیت محض اس لیے ہے کہ انہیں اس شہر کے لیے منتخب کیا گیا۔ ایسا کیوں ہوا۔ بعض جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ شہر کے لیے موجودہ مقام کا تعین اس کی دفاعی پوزیشن کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شہر موجودہ مقام سے جنوب مغرب کی طرف ایک میل کے فاصلہ پر "ریفائیم" کے میدان یا شمال کی وسیع سطح مرتفع میں تعمیر ہوتا۔

یہ شہر موریہ اور صیہون کی پہاڑی پر واقع ہے اور ان دونوں پہاڑیوں کو وادی الوعد الگ کرتی ہے۔ مشرقی پہاڑی پر پانچ ٹیلے نمایاں ہیں۔ ان

میں جو انتہائی شمال میں ہے۔ آج کل وہ شہر سے باہر ہے۔ اس ٹیلے اور شہر کو ایک مصنوعی کھائی کے ذریعے الگ کیا گیا ہے۔ مسجد صخرہ بھی اس پہاڑی کے ایک ٹیلے پر واقع ہے اور یہ موریہ کی پہاڑی ہے۔ مغربی پہاڑی یعنی صیہون کی چڑھائی بتدریج اور مسلسل ہے اور اس پہاڑی کے جنوبی حصہ پر رومن دور میں بالائی شہر آباد ہے۔ آج کل ارمنی محلہ ہے۔ کلیسائے نشور اس پہاڑی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔

ان کے علاوہ نواح شہر میں کچھ اور پہاڑیاں بھی ہیں۔ ان میں ایک پہاڑی زیتون کی ہے جو بالا حصار سے باہر شہر کے مشرق میں ہے۔ یہ بھی ان دونوں پہاڑیوں کی طرح اہم ہیں۔ سامنے پھیلے ہوئے صحرا میں سال میں صرف دو ماہ کے لیے ہریالی نظر آتی ہے۔ یا پھر چشمے کے کنارے سبزہ نظر آتا ہے۔ سردیوں اور سخت گرمیوں میں ان ابھرے ہوئے ٹیلوں پر لگڑ بھگے اور دوسرے وحشی جانور بسیرا کرتے ہیں۔ وادی اردن جسے "غوز" بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے پرے زرد پہاڑیاں اس طرح نظر آتی ہیں جیسے آسمان کے سامنے کسی نے دیوار تان دی ہو۔

پہاڑ کی تین چوٹیاں ہیں۔ بڑی چوٹی کو لاطینیوں اور یونانیوں نے مقدس عمارات کے لیے منتخب کیا مگر ان عمارات کی وجہ سے یہاں کی زرخیزی ختم ہوگئی۔ مشہور ہے کہ اس چوٹی سے حضرت عیسیٰ نے شہر دیکھا اور رو دیئے۔ اس جگہ وہ اپنے حواریوں کو نئی شریعت کا سبق پڑھاتے رہے اور اسی پہاڑی سے ایک بادل میں گم ہو کر لوگوں کی نظروں سے گم ہوگئے۔ ان کے صعود کی جگہ جو گرجا تعمیر ہے اس میں ایک پتھر پر قدم ہے۔ ان کو حضرت عیسیٰ کے زمین پر آخری نقش پا کی سعادت حاصل ہے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ اس پہاڑی سے مختلف ادوار میں یہود نے تین ہزار انبیاء کرام کو گرا کر شہید کیا تھا اور ستر ہزار انبیاء بھوک سے ہلاک ہوئے تھے۔ اسی پہاڑی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو توریت دی گئی تھی۔

کلام پاک میں اس آیت "والتین والزیتون" کی تفسیر بعض مفسرین یہ کرتے ہیں کہ اللہ نے چار مبارک پہاڑیوں کی قسم کھائی ہے۔ تفسیر اس طرح ہے۔

"والتین" یہ دمشق کی ایک پہاڑی کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت داؤد کو زبور ملی تھی۔

"زیتون" سے بھی یہی پہاڑی مقصود ہے۔

"طور سینین" سے صحرائے سینا مراد ہے۔ جہاں حضرت موسیٰ کو توریت عطا ہوئی۔

"بلد امین" کا اشارہ مکہ معظمہ ہے جو پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ اور جہاں قرآن کا ایک حصہ نازل ہوا۔

اس پہاڑی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں روایت مشہور ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں زیتون کے درخت تھے جو امتداد زمانہ میں ناپید ہوگئے۔ البتہ انجیر کے درخت آج بھی موجود ہیں۔ جدید یروشلم کے جنوب میں "جرم کی پہاڑی" ہے جسے جبل ہارون، طور ہارون اور کوہ طور بھی کہا جاتا ہے۔

مقدسی لکھتا ہے۔

"یہ مقدس پہاڑ یروشلم کے جنوب میں واقع ہے۔ ہارون اس پر اپنے بھائی کے ساتھ چڑھے تھے مگر واپس نہ آئے۔ تب یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تہمت لگائی کہ انہوں نے بھائی کو مار ڈالا۔ مگر انہوں نے پہاڑ کی سطح چوٹی پر وہ جنازہ لوگوں کو دکھایا جو ہارون کا تھا۔

لیکن مورخ مسعودی اس واقعہ کو جبل مآب سے منسوب کرتا ہے اور صحیح یہی ہے۔

جنوب مغرب میں Hill of Evil

Council ہے۔ جسے ہنوم کی گہری وادی صیہون سے الگ کرتی ہے۔ صلیبی محاربات میں یہ پہاڑی انسانی حملوں کی زد میں تھی اور اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس جگہ قبرستان تھا۔ ان ایوانوں کے پچھلے حصہ میں ''مردے'' کی لاش رکھ دی جاتی اور بالائی منزل پر ان کے لواحقین رہتے۔

اس پہاڑی پر باب یافہ سے مغرب میں ایک جگہ ایک یونانی مقبرہ دریافت ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہیرود کی شہزادی مریم دفن ہے۔ جسے ہیرود نے ہلاک کر دیا تھا۔

بیت المقدس کا انتظام

اسلامی دور حکومت سے پہلے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے عہد میں یروشلم اپنی سلطنت کا صدر مقام تھا لیکن عہد اسلامی میں اس کی یہ کیفیت اور حیثیت ختم کر دی گئی تھی۔ حضرت عمرؓ نے جب ملک شام کی انتظامی تقسیم کی تو بیت المقدس، جند فلسطین کا حصہ بنا۔ فلسطین، شام کا ایک صوبہ تھا لیکن اہل شام ''جند'' کو فوجی فوجی اضلاع کے معنی میں استعمال کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں جند فلسطین میں میدان عکہ کے جنوب میں خلیج اردن اور بحر لوط تک کا سارا علاقہ شامل تھا۔ اس جند کی مغربی سرحد پر سمندر، جنوب میں دشت تیہ اور مصر کا راستہ حد بندی کرتا تھا۔ اموی دورِ حکومت میں جند فلسطین کی حدود میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ عہدِ سلیمان بن عبدالملک میں اس کا دارالحکومت ''رہا'' سے ''رملہ'' منتقل کر دیا گیا۔ رملہ، سلمان نے ہی بسایا تھا۔ عہد عباسیہ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوئی مگر جب صلیبی قابض ہوئے تو یروشلم ایک بار پھر سیاسی حیثیت اور اہمیت اختیار کر گیا اور اسے یروشلم کی ریاست کا دارالحکومت بنایا گیا۔

فرنگیوں کا قبضہ ختم ہونے کے بعد چودھویں صدی عیسوی میں ابوالفداء نے جند فلسطین کے ماتحت اضلاع کا ذکر کرتے ہوئے الجبار اور تیہ کے اضلاع کو بھی اس کے ماتحت اضلاع بیان کیا ہے۔ یعقوبی نویں صدی عیسوی میں بیان کرتا ہے کہ فلسطین کی ولایت میں شام کا مغربی حصہ شامل ہے۔ رفغ سے الجون تک اس کی لمبائی ایک سوار دو روز میں طے کرتا ہے اور اس کی چوڑائی یافہ سے اریحا تک طے کرنے کے لیے بھی اتنا ہی عرصہ درکار ہے۔

وہ مزید لکھتا ہے۔

''جند فلسطین میں زغر اور دیار قوم لوط، الجبال اور الشراہ تک کا علاقہ شامل ہے۔''

اصطخری کے مطابق ولایت شام اور فلسطین سب سے زرخیز ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں یاقوت نے یروشلم کو ولایت فلسطین کا دارالحکومت لکھا ہے۔

سیوطی کا بیان ہے:۔

فلسطین کا صدر مقام ایلیا (بیت المقدس) رام الکہ سے اٹھارہ میل پر واقع ہے۔

ترکمانِ عثمانی کے دور میں ولایت فلسطین کے پاشا (لیفٹیننٹ گورنر) کے اکثر دفاتر یہیں تھے اور جب اسے برطانیہ کا انقلابی علاقہ قرار دیا گیا تو برطانیہ نے اس کے انتظام کے لیے کمشنر مقرر کیا۔

۱۹۴۸ء کی جنگ کے بعد یہ شہر اور فلسطین کے بعض دوسرے علاقے مملکت ہاشمیہ اردن کا حصہ بنے۔

بیت المقدس کی شرعی حیثیت

کلام اللہ میں بیت المقدس یا یروشلم وغیرہ کے الفاظ کے ساتھ تو بیت المقدس کا کہیں ذکر نہیں۔ البتہ اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

ترجمہ:۔

''پاک ہے وہ رب جو لے گیا اپنے بندے کو رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف کہ جس کے گرداگرد ہم نے برکت نازل کی ہے تاکہ ہم اپنی نشانیاں دکھائیں۔ تحقیق وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔''

آیئے اب ہم دیکھتے ہیں کہ اقوام متحدہ میں فلسطین (بیت المقدس) کا کیا فیصلہ ہوا؟

تقسیم فلسطین کی قرارداد کو منظور کرنے کے لیے دو تہائی ووٹوں کی ضرورت تھی۔ دو مرتبہ یہ مرحلہ آیا لیکن دونوں مرتبہ اسے ملتوی کر دیا گیا کیونکہ اس کے دونوں محرکوں (امریکا، روس) کو کامیابی کی امید نہ تھی۔ اس کے دوران ہی امریکا کی طرف سے واشنگٹن میں اعلیٰ سطح پر ان تین چھوٹی اقوام پر زبردست دباؤ ڈالا گیا اور ۲۹ نومبر کو تینوں فیصلہ کن ووٹ ہیٹی، لائبیریا اور فلپائن نے جو ووٹ فیصلہ کن ووٹ تھے ان تین ووٹوں نے دو تہائی اکثریت کو ممکن بنا دیا حالانکہ اس سے قبل یہ تینوں ملک اس کے خلاف تھے۔

امریکن کالم نگار نے لکھا ہے۔

اس کی حمایت میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے کئی لوگوں نے اپنا اثر ورسوخ اور دباؤ استعمال کیا۔ لائبیریا میں ربر کے باغات کے مالک ہاروے فائر سٹون نے لائبیریا کی حکومت کو مجبور کر دیا کہ اڈلف بیرل نے جو صدر کے مشیر تھے۔ ہیٹی کا ووٹ ڈلوا دیا اور بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ وائٹ ہاؤس میں کیا ہوا۔ صدر ٹرومین نے قائم مقام وزیر خارجہ لووٹ کو بدھ پھر جمعرات کے دن وارننگ دی کہ اگر امریکا کے روایتی ساتھیوں نے اس مسئلہ پر امریکا کا ساتھ نہ دیا تو وزیر خارجہ سے جواب طلبی کی جائے۔

نائب وزیر خارجہ نے تائید کی ہے کہ وہائٹ ہاؤس نے ان ووٹوں کے لیے براہ راست یا بالواسطہ طور پر دباؤ ڈالا اور ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔''

اور پھر وہی ہوا جو یہودی چاہتے تھے۔ کیوں نہ ہو۔ نیویارک کا ایک وکیل اپنی کتاب ''یہودی دنیا پر حکمران ہیں'' میں لکھتا ہے کہ:۔

''اقوام متحدہ بجائے خود وہ عالمی مملکت ہے جس کا خواب یہود کے عظیم رہنماؤں نے پروٹوکول میں دیکھا تھا۔''

قرارداد کا اعلان ہوتے ہی مسلح یہودیوں نے مسلمانوں کا قتل عام وسیع پیمانے پر شروع کر دیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ علاقے پر قابض ہونا چاہتے تھے۔

پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی لکھتے ہیں۔

''عربوں پر جو مظالم کیے گئے وہ کسی طرح ان مظالم سے کم نہ تھے جو نازیوں نے یہودیوں پر کیے تھے۔''

''دیریاسین'' میں ۹ اپریل ۱۹۴۸ء کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے۔

''عرب عورتوں اور لڑکیوں کا برہنہ جلوس نکالا گیا اور یہودی موٹروں پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر جگہ جگہ اعلان کرتے پھرے کہ ''ہم نے دیریاسین کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔ اگر تم نہیں چاہتے کہ تمہارے ساتھ یہی کچھ ہو تو یہاں سے نکل جاؤ۔''

یہودیوں کی اس دہشت گردی کے نتیجے میں ۷۰۰۰ عرب شہید اور تین لاکھ عرب بے گھر ہو گئے تھے اور اس مرحلہ پر سلامتی کونسل میں اقوام متحدہ کی خصوصی کمیٹی کی رپورٹ زیر بحث تھی جس میں تقسیم فلسطین کو ناقابل عمل قرار دیا گیا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس مرحلہ پر امریکہ، عرب ممالک میں اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر غیر جانب دار تھا اور اس نے تقسیم کے منصوبہ کو ناقابل عمل قرار دے دیا تھا کہ روسی نمائندہ گرومیکو نے تقسیم فلسطین کی حمایت میں زبردست تقریر کی اس صورت حال سے امریکا گھبرا گیا۔ اسے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر اس نے حمایت نہ کی تو یہودی جن کے سرمایہ پر امریکی معیشت کا انحصار ہے۔ اس سے بدظن ہو جائیں گے۔ چنانچہ وہ بھی

روس کے ساتھ اسی کشتی میں سوار ہوگیا۔ ابھی جنرل اسمبلی میں بحث جاری تھی کہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ کو برطانیہ نے واشنگٹن ٹائم کے مطابق شام کے چھ بجے فلسطین سے دست کش ہونے کا اعلان کردیا۔ چھ بج کر ایک منٹ پر یہودیوں نے تل ابیب میں اسرائیل اور اسرائیلی حکومت کے قیام کا اعلان کردیا۔ دس منٹ بعد امریکا نے اور پندرہ منٹ بعد روس نے اسے تسلیم کرلیا۔ حالانکہ اس وقت تک اقوام متحدہ نے یہودیوں کو فلسطین میں اپنی قومی حکومت قائم کرنے کا مجاز نہ کیا تھا۔

اس اعلان کے وقت تک چھ لاکھ سے زیادہ عرب بے گھر ہو چکے تھے اور اسرائیل اقوام متحدہ کی تجویز کے بالکل خلاف بیت المقدس کے آدھے سے زیادہ حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ اس نے عرب ریاست میں قزاز، سلامہ، سارس، بیار اور عمواس کے دیہاتوں پر قبضہ کرلیا تھا۔

پھر ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو عربوں پر یہودی حملوں میں اضافہ ہوگیا اور گرد و پیش کی عرب ریاستوں نے بے سہارا عرب آبادی کو مار دھاڑ سے بچانے کے لیے مداخلت کرتے ہوئے اپنی فوجیں فلسطین میں داخل کردی تھیں۔ اس جنگ میں مقامی عیسائی عربوں نے غزہ کی پٹی، بیر سبع، ذوالکرم، نابلس ان سے خالی کرالیے اور بیت المقدس کے قدیم حصہ پر قبضہ کرکے تل ابیب (اسرائیلی دارالحکومت) تک پہنچ گئے۔ یہودیوں کی ناکامی پر بڑی طاقتوں نے مجلس اقوام متحدہ کو جنگ بند کرنے پر مجبور کیا اور عرب لیگ نے گیارہ جون کو بین الاقوامی رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے عارضی صلح کے طور پر چار ہفتوں کے لیے جنگ بند کردینے کا فیصلہ کیا۔ یہ عارضی صلح عربوں کے لیے زہر قاتل تھی جس نے عربوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔

اس صلح سے یہ طے پایا کہ باہر سے کوئی یہودی فلسطین میں داخل نہ ہوگا۔ فریقین اپنے اپنے علاقوں پر قابض رہیں گے۔ باہر سے نہ کوئی اسلحہ آئے گا اور نہ کوئی جنگی اقدام کیا جائے گا۔ لیکن یہودیوں نے یہ صلح صرف دم لینے اور تیاری کی تکمیل کے لیے کی تھی۔ انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور چیکوسلواکیہ سے دھڑا دھڑ اسلحہ آنے لگا۔

ایک یہودی مصنف نے لکھا ہے۔

"اس عظیم تر اسرائیل میں پورا شام، پورا لبنان، اردن اور عراق کا بڑا حصہ، صحرائے سینا، بالائی نجد اور مدینہ منورہ تک شامل ہے۔ کیونکہ سرور کائنات کے زمانہ میں یہاں یہود مدینہ میں آباد تھے۔"

بن گوریان نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

"یہودیوں کے لیے الگ سلطنت کا قیام صیہونیت کا واحد مقصد نہیں ہے۔ بلکہ اسرائیل کے قیام کے بعد ہمیں اپنی تحریک کو آگے بڑھانا ہے۔ اسرائیل کی حکومت صرف ایک وسیلہ ہے۔ منزل نہیں۔"

اور مسٹر بیگن نے اسرائیلی پارلیمنٹ میں پہلے پہلے کہا تھا۔

"اسرائیل کے لوگوں اور خود اسرائیل کی اس وقت کوئی اہمیت نہیں جب تک ہم اپنا پورا علاقہ بغیر امن کے صلح ناموں پر دستخط کرکے آزاد نہ کرالیں۔"

جون ۱۹۶۷ء میں جو جنگ ہوئی۔ اسرائیل اس جنگ کے لیے مدت سے تیاری کررہا تھا۔ جبکہ عرب اس کے برخلاف اس پیمانہ کی تیاری نہ کرسکے۔ قیام اسرائیل کے بعد سے یہودیوں کا ہر قدم یہودی قوم کو ایک جنگجو فوج میں بدلنے کے لیے ہوتا ہے۔

۱۹۵۱ء میں ایک یہودی صنعت کار نے ایک صنعتی رسالہ میں لکھا تھا۔

ہر معاشی قدم اور ہر ترقیاتی پروگرام فوجی نقطہ نظر سے بنایا جاتا ہے۔ چنانچہ اسرائیل کی مختلف شعبوں میں تعمیر و ترقی کی منصوبہ بندی، فوجی ضروریات کے مطابق کچھ اس انداز میں ہوتی ہے کہ اسے کسی بھی وقت فوجی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔"

مسٹر شیرٹ جو پرانے وزیر خارجہ تھے، انہوں نے یروشلم میں ہجانہ کے ایک اجلاس میں کہا تھا۔

"میں اسرائیل کے لوگوں سے کہتا ہوں کہ وہ خود کو مضبوط اور طاقت ور بنائیں۔ تمام اسرائیل کو جنگ کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اس نے اپنی کتاب "میدان جنگ" میں لکھا ہے۔

"تنہا فوج فتح کی ضمانت نہیں دے سکتی۔ بلکہ پوری قوم کو اس کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

اسرائیل میں جس قدر جنگی تیاریاں ہو رہی تھیں اس نے ایک یہودی جرنلسٹ کو بھی اس نئے رجحان کی مذمت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں ایک کتاب لکھی۔ جس پر اس کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن ہوا اور اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ چنانچہ اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا۔

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسرائیل میں اولیت انتہائی مشدد یہودیوں کی نئی نسل پیدا کرنے کو حاصل ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ جوانوں کو کس طرح جنگی پیمانے پر تربیت دی جاتی ہے اور فوجی کارروائیوں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ بالکل وہی ہے جو نازیوں اور فاشسٹوں نے اپنایا تھا۔ انہیں بالکل ان جارحانہ اصولوں پر تعلیم دی جاتی تھی۔ جو فوجی طاقتیں اپنے جوانوں کی تربیت کے لیے اختیار کرتی ہیں۔ بچوں کی پرورش خالصتاً جنگی لائنوں پر ہوتی ہے۔ اسرائیل کی فضا میں جارحیت اور حملہ آوری کا جذبہ طاری ہے اور میں نے سارے اسرائیل میں ایک ہی پکار سنی ہے..... جنگ کی پکار اور یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کا سالانہ جنگی بجٹ ۱۹۴۸ء سے اب تک کبھی بھی تین کروڑ ڈالر سے کم نہیں ہوا۔"

جون ۶۷ء کی جنگ سے پہلے امریکی فوجی ماہرین نے اس کی جنگی تیاریوں کے پیش نظر واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ صرف چار پانچ یوم میں اپنے گرد و پیش کی عرب ریاستوں کو پیٹ ڈالے گا۔ سیاسی حیثیت سے ہر موقع پر امریکا اور اس کے ساتھی اس کی پشت پناہی کرتے رہے ہیں اور انہی کی حمایت کی وجہ سے اقوام متحدہ اس کی پے در پے زیادتیوں کا تدارک نہ کر سکی۔ نومبر ۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۷ء تک اقوام متحدہ کی ۲۸ ریزولیشنز وہ مسترد کر چکا تھا۔

نومبر ۱۹۶۶ء تک اقوام متحدہ نے اس کے خلاف گیارہ مرتبہ قرارداد مذمت پاس کی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کی جرأت و بے باکی کا اندازہ آپ اس سے کر لیجیے کہ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے والا تھا۔ اسرائیل کے وزیر اعظم لیوی اشکول نے علی الاعلان کہا۔

"اگر اقوام متحدہ کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی فیصلہ دے دیں اور تنہا اسرائیل کا اپنا ووٹ ہو اور وہ ہمارے حق میں رہ جائے تب بھی ہم اپنے علاقوں سے نہیں نکلیں گے۔"

اور یہ سب کیوں؟ اس لیے کہ اسرائیل کو تمام بڑی طاقتوں کی حمایت حاصل ہے۔ کفر، اسلام کے خلاف متحد ہے۔ جنگ شروع ہونے سے قبل امریکا اس قدر مضطرب تھا کہ امریکا کے ایک خاص فوجی وفد نے اسرائیلی انتظامات کا معائنہ کیا اور جنگ سے ایک ہفتہ قبل امریکی فوج کے جوائنٹ چیف آف اسٹاف کے صدر جنرل ویلر نے صدر جانسن کو رپورٹ دی کہ اگر اسرائیل پہل کر کے ایک کامیاب ہوائی حملہ کر دے تو تین چار دن کے اندر عربوں کو مار لے گا۔

اس کے بعد جانسن نے روس سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ وہ جنگ میں عملاً کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ اس پر بھی چھٹا امریکی بحری بیڑہ مصر اور اسرائیل کے سواحل کے نزدیک مستعد کھڑا رہا۔ اس کے ساتھ ہی برطانیہ کا ایک طیارہ بردار جہاز مالٹا میں، دوسرا عدن میں اسرائیل کے ایک منٹ کے نوٹس پر مدد کے لیے تیار کھڑا تھا۔ "لندن ٹائمز" نے جنگ کے بعد جون ۱۹۶۷ء کی مقدس جنگ کے نام سے جو کتاب شائع کی ہے وہ واضح طور پر ثابت کرتی ہے کہ اسرائیل کے ساتھ فرنگی ہمدردی کے پس منظر میں صلیبی جذبہ کارفرما تھا۔ چنانچہ اس کتاب کے جس باب میں "بیت المقدس پر یہودی قبضہ" کا بیان ہے اس کا عنوان (Back After 896 years) ہے اور یہ ظاہر ہے کہ ۸۹۶ برس پہلے بیت المقدس پر سے صلیبی عیسائیوں کا قبضہ ختم ہوا تھا۔ نہ کہ یہودیوں کا۔ جنگ میں روس نے جو کردار ادا کیا اس پر یوگوسلاویہ کے ایک ڈپلومیٹ کا یہ تبصرہ بہترین ہے کہ۔

"ایک بڑی طاقت جب تمہارا ساتھ چھوڑتی ہے تو وہ تم کو پیراشوٹ کے بغیر ہوائی جہاز سے گرا دیتی ہے۔"

بہر حال، یہودی منصوبے کا تیسرا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ فلسطین اور جزیرہ نمائے سینائی پر اسے تسلط حاصل ہو گیا ہے۔ اب وہ اس منصوبے کے آخری مرحلہ کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس مرحلے کے دو اجزاء اہم ترین ہیں۔

ایک یہ کہ مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو منہدم کر کے ان کی جگہ ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اسرائیل اپنی میراث کے ملک پر قبضہ کر لے۔

خیال رہے کہ مسجد اقصیٰ میں آتش زدگی کا واقعہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا اور اگر وہ اس مرحلہ میں کامیاب ہو گیا تو پھر اس کا دوسرا وار زمین بطحا پر ہوگا کیونکہ اس کی میراث کا ملک "نیل سے فرات تک" ہے اور اس میں دریائے نیل تک مصر، پورا اردن، پورا شام، پورا لبنان، عراق کا بڑا حصہ، ترکی کا جنوبی حصہ اور مدینہ منورہ تک حجاز کا پورا بالائی علاقہ شامل ہے۔

دیگر زیارتیں

مہد مسیح

حرم کے احاطہ میں جنوب مشرقی گوشے میں ایک چھوٹی سی زمین دوز مسجد ہے جو مہد مسیح کے نام سے مشہور ہے۔ ابن عبدربہ نے محراب مریم بنت عمران اور مقدسی نے محراب مریم و زکریا کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے۔ محراب مریم میں فرشتے حضرت مریم کے واسطے گرمیوں میں سردی اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل لایا کرتے تھے۔ محراب زکریا اس کے قریب ہی ہے جہاں فرشتوں نے انہیں ولادت کی بشارت دی تھی۔ مہد مسیح میں قدیم زمانہ سے حضرت مسیح کا جھولا رکھا ہے۔ یہ جھولا پتھر کا اور اتنا چوڑا ہے کہ ایک آدمی اس میں نماز پڑھ سکتا ہے۔ یہ زمین میں گڑا ہوا ہے۔ حضرت مسیح اسی میں لٹائے گئے تھے اور انہوں نے عالم شیر خوارگی میں لوگوں سے گفتگو فرمائی تھی۔ اس کو مسجد کی محراب بنا دیا گیا ہے۔ محراب زکریا اور محراب مریم اس کی مشرقی جانب ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔

یہاں ایک ستون پر انگلیوں کے نشان ہیں جن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت مریم نے دردزہ کی شدت میں اس پتھر کو زور سے پکڑا تھا اور یہ ان کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ ناصر خسرو کے الفاظ

میں اس میں چاندی اور پیتل کے فانوس لٹکے ہوئے ہیں جنہیں ہر شب روشن کیا جاتا تھا۔

صلیبیوں نے اپنے دور میں حرم شریف کے ان زمین دوز مقامات سے اصطبل کا کام لیا۔ آج یہ اصطبل مہد عیسیٰ کے مغرب میں ہے اور ان دونوں کے درمیان ایک دروازہ کھلتا ہے۔ صلیبیوں کے قبضہ سے قبل حرم شریف کے شمالی پہلو میں واقع محراب داؤد ختم ہوگئی۔ البتہ اس کے قریب "کرسی سلیمان" جو قد آدم بلند چٹان ہے باقی ہے۔ لوگوں کا بیان ہے کہ حضرت سلیمانؑ ہیکل کی تعمیر کے زمانہ میں اس پر بیٹھتے تھے۔ سیوطی لکھتا ہے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد حضرت سلیمانؑ نے اس جگہ تین ہزار بچھیاں اور سات ہزار بھیڑیں قربان کی تھیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ محراب داؤدؑ قلعہ بیت المقدس کے اندر ہے۔ جب وہ حرم میں تشریف لاتے تو محراب کلاں میں نماز ادا کرتے اور حضرت عمرؓ نے حضرت داؤدؑ کی پیروی میں یہاں نماز ادا کی تھی اور اسی روز سے یہ "محراب عمرؓ" مشہور ہوگئی۔

منبر داؤدؑ جسے مجیر الدین قبہ سلیمان کہتا ہے حرم شریف کی جنوبی دیوار میں دربستہ محراب ہے اور باب العلم کے سامنے اور اس دروازے کے قریب ہی جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ناصر خسرو نے حرم شریف کے شمالی حصہ میں منبر داؤدؑ کے علاوہ دو اور گنبدوں (۱) قبہ یعقوب (۲) محراب زکریا کا ذکر کیا ہے۔ قبہ یعقوب سے غالباً وہ گنبد مراد ہے جو آج کل قبہ سلیمان کہلاتا ہے اور محراب زکریا کا کوئی اثر آثار باقی نہیں۔

مجیر الدین لکھتا ہے کہ باب السلسلہ کے مقابل قبہ موسیٰ بنا ہوا ہے لیکن اس کو حضرت موسیٰؑ سے کوئی نسبت نہیں۔ یہ ۶۴۹ھ (۱۲۵۱ء) میں از سر نو تعمیر ہوا اور اس سے پہلے قبۃ الشجرہ کہلاتا تھا۔ مجیر الدین کے الفاظ میں حرم شریف کے چاروں مینار اسی مقام پر قائم ہیں جہاں عبدالملک کے زمانہ میں تھے۔

حضرت سلیمانؑ کا مصلیٰ یا کرسی

باب حطہ میں داخل ہو کر داہنی طرف مسجد کے شمالی دروازہ شرف الانبیاء پر نظر پڑتی ہے۔ باب الحطہ اور اس باب کے درمیان چار ستونوں پر قبلہ قائم ہے جس میں قبلہ رُو محراب بنی ہوئی ہے۔ اسے حضرت سلیمانؑ کا مصلیٰ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت سلیمان معبد کی تعمیر کے وقت یہیں بیٹھ کر فیصلہ دیا کرتے تھے۔

روضہ سلیمانؑ

یہ روضہ حرم شریف میں مسجد صخرہ کی جانب مشرق میں تین سو قدم کے فاصلے پر بیرونی دیوار سے متصل ایک مقفل کمرے میں واقع ہے۔ کمرے کے دونوں جانب جالی دار کھڑکیاں لگی ہوئی ہیں جن سے قبر دیکھی جاسکتی ہے۔ قبر کی لمبائی سات گز ہوگی۔ قبر شمالاً جنوباً ہے اور کمرے کے متصل حبس سلیمانؑ (قید خانہ) ہے جہاں شریر جنات کو قید و بند میں رکھا جاتا ہے۔ اصطبل یہاں سے ذرا فاصلہ پر ہے۔

دیوار براق

یہ وہ جگہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات براق کو یہاں باندھا تھا۔ اس کے علاوہ حرم میں خواتین کے لیے ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہے جس میں ظہر، عصر اور مغرب کی نماز ایک اندھا امام عورتوں کو پڑھاتا ہے۔

مزار محمد علی جوہر

مولانا محمد علی جوہر کا مزار مسجد صخرہ کے بالمقابل جانب مغرب ایک بند کمرے میں ہے۔ کتبہ پر عربی عبارت لکھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

اللہ تعالیٰ مومنوں کو ان کے جان و مال کے صدقے جنت دے گا۔ یہ مجاہد عظیم مولانا محمد علی جوہر ہندی کی قبر ہے۔ (اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے) انہوں نے پندرہ شعبان کو لندن میں وفات پائی اور جمعہ کے دن پانچ رمضان ۱۳۴۹ ہجری کو قدس میں دفن کیے گئے۔

دیوار گریہ

حرم شریف کی مغربی دیوار میں پچاس فٹ کے ایک ٹکڑے کے بارے میں یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ یہ ہیکل سلیمانی کی باقیات میں سے ہے۔ چنانچہ وہ اس مقام پر آتے اور گریہ وزاری کرتے ہیں اور اسی نسبت سے اس کا نام دیوار گریہ پڑ گیا۔ اس مقام کو مسلمان "البراق" کہتے ہیں کیونکہ شب معراج کو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ براق سے اترے اور براق کو باندھا اور مسجد میں تشریف لے گئے۔ اس جگہ کی نشاندہی کرنے کے لیے یہاں ایک گول کڑا لگا ہوا ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب حضرت عمرؓ بیت المقدس میں داخل ہوئے اس وقت دیوار گریہ کا کوئی وجود نہ تھا۔ حضرت سلیمان کے بعد معبد کو تباہ ہوئے صدیاں بیت چکی تھیں اور ہیرود نے اس کی جگہ جو عمارت تعمیر کرائی تھی اسے بھی ۷۰ء میں طیطس رومی مکمل طور پر تباہ کرچکا تھا اور اس کے جو آثار باقی رہ گئے تھے اسے ملکہ ہیلنا نے مٹا دیا تھا۔ خلیفہ عبدالملک نے قبۃ الصخرہ اور خلیفہ ولید بن عبدالملک نے مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرائی۔ حرم شریف کی موجودہ چار دیواری ترکان عثمانی کے دور میں تعمیر ہوئی جو بعض قدیم آثار پر اٹھائی گئی تھی۔ سر رابرٹ نے اپنی کتاب "مشرق وسطیٰ میں طوفانی مرکز" میں لکھا ہے کہ:

"فتح بیت المقدس کے بعد جب سلطان سلیم اول مسجد اقصیٰ میں زیارت کے لیے آیا تو اس نے مسجد کے نواح ہی میں قیام کیا۔ ایک صبح اس نے اس مقام پر جہاں آج کل دیوار گریہ ہے ایک عیسائی خاتون کو غلاظت پھینکتے دیکھا اور اس کی طبیعت پر یہ ڈھیر گراں گزرا۔ دریافت حال پر معلوم ہوا کہ عیسائی اکثر کوڑا کرکٹ اسی مقام پر ڈالتے ہیں۔ اس پر سلطان سلیم نے مسجد کے قریب کوڑا کرکٹ پھینکنے کی مکمل ممانعت کردی اور سلیمان اعظم کے دور میں شہر کی فصیل کے ساتھ حرم شریف کی چار دیواری بھی ۱۵۴۲ء میں مکمل ہوئی۔"

اس کے علاوہ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ شاہ ہیڈرین نے ۱۳۵ء میں یہودیوں کو بیت المقدس سے نکالا تو صدیوں ان کا شہر میں داخلہ بند رہا۔ البتہ ایک یہودی مصنف کے مطابق ۶۱۰ء میں وہ عیسائی حکمرانوں سے اجازت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے کہ وہ نواحی پہاڑیوں سے بیت المقدس کو دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت عمرؓ جب فاتح بن کر آئے اور عیسائیوں سے معاہدۂ صلح ہوا اس میں عیسائیوں نے خاص طور پر مسلمانوں کو پابند کیا تھا کہ یہودی ان کے ساتھ شہر میں آباد نہیں ہوسکیں گے۔ گو بعد میں اس معاہدہ کی بہت کم پابندی ہوسکی مگر اس کے باوجود شہر بیت المقدس میں یہودی کبھی آباد نہیں ہوئے۔ البتہ جب تحریک صیہون شروع ہوئی تو انہیں ہیکل کا خیال آیا اور صیہونی رہنماؤں نے انہیں دیوار گریہ کی زیارت کے لیے اکسایا۔ یہ انیسویں صدی کی بات ہے جب یہودی ربیوں نے ترکوں سے درخواست کی کہ ان کا مذہب انہیں حرم کے باہر گریہ وزاری کرنے کا حکم دیتا ہے تو فراخ دل ترکوں نے ان کے مذہبی احساسات کا احترام کرتے ہوئے انہیں مغربی دیوار کے باہر اس کی

اجازت دے دی لیکن حکم دیا کہ وہ دیوار سے تین فٹ
پیچھے رہیں۔ یہ اجازت حاصل کرنے کے لیے
یہودیوں نے انتہائی مکروہ فریب سے کام لیا اور طویل
جدوجہد کی۔ یہ اجازت انہیں کب ملی؟ تاریخ اس
بارے میں قطعاً خاموش ہے۔ البتہ تاریخ سے اتنا
معلوم ہوا ہے کہ انیسویں صدی تک مقدس مقامات
کے خادموں اور سربراہوں کے سوا کسی غیر مسلم کو شہر کی
فصیل کے اندر قیام کی اجازت نہیں تھی۔

اس سلسلے میں اس قدر سختی برتی گئی تھی کہ کوئی
سفارتی نمائندہ بھی فصیل کے اندر نہیں رہ سکتا تھا۔
البتہ سال کے ایک مقررہ وقت میں سیاحوں اور
زائرین کو اندر جانے کی اجازت تھی مگر انیسویں صدی
کے اوائل میں پہلے اسپین پھر مشرقی یورپ کے یہودی
مہاجرین کو اس پابندی سے مستثنیٰ قرار دے دیا گیا تھا
جو انتہائی بے بسی اور افسوس کی حالت میں یہاں پہنچے
اور اپنے یہودی رشتہ داروں کی خیرات پر گزارہ کرتے
تھے لیکن جب ۱۸۳۱ء میں فلسطین اور شام پر حاکم مصر
قابض ہو گیا تو قدیم بیت المقدس کی ہیئت میں تبدیلی
کی رفتار کسی قدر تیز ہو گئی۔ ملک میں ابتری پھیل گئی اور
فلسطین کے دروازے یہودی تاجروں، مشنریوں اور
سیاحوں پر کھول دیے گئے۔ مصری انتظامیہ نے
یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں خاص فراخدلی
کا مظاہرہ کیا اور بیت المقدس میں پہلا برطانوی
قونصلیٹ قائم ہوا جس کا ایک حق یہودی کی نگرانی اور
حفاظت تھا۔ برطانیہ نے یہودیوں کو عیسائی بنانے
کے لیے ایک خفیہ بشپ کا تقرر کیا اور مصری انتظامیہ پر
زبردست دباؤ ڈال کر شہر میں نئے پروٹسٹنٹ چرچ کی
تعمیر کی اجازت حاصل کر لی۔

یہ عہد اسلامی میں غیر مسلموں کا پہلا نیا معبد تھا جو
شہر کے اندر تعمیر ہوا۔ مصر کے دور اقتدار میں بیت
المقدس میں یہودیوں کے دو گروہ تھے جو ایک
دوسرے کے دشمن تھے۔ سفارڈم جن کی اکثریت
اسپین سے آنے والوں پر مشتمل تھی، جو عثمانی کنیوں کی
رعایا تھے جنہوں نے نہایت محتاط انداز میں اور عیاری
سے متصل عمارتوں کو چار کنیوں میں تبدیل کر دیا تھا
لیکن ان کی چھت ایک ہی تھی۔ ترک حکام نے ان
کی نمائندگی کے لیے ایک حال ہی میں پروشیا،
آسٹریا، پولینڈ اور روس سے آئے تھے اور جن کی
حفاظت اور نگرانی برطانوی قونصلیٹ کے ذمہ تھی۔
انہوں نے چونکہ اپنی غیر ملکی شہریت برقرار رکھی تھی اس
لیے "کنیے" کی تعمیر اور مقدس مسلم جائیداد پر قبضہ
کرنے اور خرید زمین کی اجازت حاصل کرنے کی
کوشش شروع کر دی۔ عثمانی قوانین کے تحت کسی غیر
ملکی کو فلسطین میں جائیداد خریدنے کا کوئی حق نہ تھا اور
مصری انتظامیہ نے عثمانیوں سے بغاوت کے باوجود
ان قوانین کو نہیں بدلا تھا۔ اس لیے علی پاشا نے انہیں
اجازت دینے میں کوئی مشکل محسوس نہ کی۔ البتہ جب
کہ مسجد اقصیٰ کے ضمن میں آ چکا ہے انہوں نے
برطانوی قونصلیٹ کی وساطت سے مصری کمانڈر
ابراہیم پاشا کو انہیں اجازت دینے پر رضامند کر لیا
لیکن شہر کی مشاورتی کونسل اور شیخ المغاربہ کی مخالفت
نے ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ باب المغاربہ کے
باہر کی زمین کو جس میں "مقام گریہ" کی جگہ بھی شامل
تھی، سلطان صلاح الدین کے بیٹے الافضل نے مسلم
اوقاف قرار دے کر اسے شمالی افریقہ کے زائرین، علماء
اور صوفیا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں اس
جگہ زائرین کے لیے ایک زاویہ تعمیر ہوا۔ بعد ازاں
۷۲۰ھ میں شعیب ابومدین غربی نے اس وقت میں
شمالی اور مغربی افریقہ کے زائرین اور طلباء کے زاویہ
کے پاس رہائشی مکانات تعمیر کیے۔ افریقی مسلمانوں کی مسجد
اقصیٰ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ سلطان مراکش علی
بن عثمان نے ۱۳۵۲ھ میں اپنا کتابت کردہ قرآن مجید
اقصیٰ کے لیے بھجوایا اور ۱۶۳۰ء میں ابومدین کی نگرانی
میں باب المغاربہ کے باہر کی تمام زمین از سر نو رجسٹر
کرائی گئی۔ اس طرح ۱۸۳۹ء میں جب انہیں یہودی
عیاری کا سامنا کرنا پڑا، شمالی افریقہ کے مسلمان اس
زمین پر تہرا استحقاق رکھتے تھے۔ زاویہ ابومدین کے
شیخ نے افریقی مسلمانوں کی طرف سے لکھا کہ ان
کے مقبوضات دیوار حرم سے متصل ہیں اور یہی وہ
دیوار حرم ہے جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم
شب معراج براق سے اترے اور جہاں براق باندھا
گیا۔ اس نے اس پر افسوس ظاہر کیا کہ یہود کو بلاجواز
ان کے علاقے میں دخل کا حق دیا گیا لیکن یہ اجازت
اس سے مشروط تھی کہ وہ کوئی شور نہیں کریں گے۔
اس میں شک نہیں کہ پچھلے چند سالوں سے ان کی
تعداد میں قدرے اضافہ ہو گیا ہے اور وہ اپنی آواز کو
اس طرح بلند کرتے ہیں جیسے وہ کنیا میں ہوں لیکن
اس کے باوجود انہیں مقام گریہ پختہ کرنے یا اس تک
پختہ سڑک بنانے کی اجازت نہیں۔ یوں معلوم ہوتا
ہے کہ یہ ان کے کسی انتہائی مقصد کی ابتداء ہے۔

مشاورتی کونسل نے اس بیان میں یہ اضافہ کیا کہ
مقام گریہ زاویہ کے ساتھ ساتھ ایک تنگ گلی ہے۔ یہ
گلی اور نواحی مکانات ابومدین کے وقف میں شامل
ہیں۔ یہ معاملہ بالآخر محمد علی پاشا کے سامنے پیش ہوا۔
اس نے ۲۶ مئی ۱۸۴۰ء مطابق ۲۴ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ
گورنر بیت المقدس کو لکھا کہ:

مشاورتی کونسل کی رپورٹ سے واضح ہے کہ یہود
اسے پختہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ حرم شریف
سے ملحق ہے اور وہ جگہ ہے جہاں سرور کائنات صلی
اللہ علیہ وسلم نے براق کو باندھا تھا۔ اس کے علاوہ ابو
مدین کا وقف ہے۔ نیز اس سے قبل یہود نے کبھی اس
جگہ کی مرمت نہیں کی۔ مزید برآں شرع اسلامی کے
تحت بھی ان کی درخواست قابل قبول نہیں۔ اس لیے
یہود کو اس جگہ کو پختہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔
انہیں اس جگہ شور مچانے یا اپنی آوازیں بلند کرنے کی
بھی سرزنش کی جائے اور واضح کر دیا جائے کہ انہیں
صرف اس جگہ کی زیارت کی اجازت ہے۔

یہ دیوار گریہ پر یہود کی حاضری کا پہلا مستند تذکرہ
ہے۔ انہیں کسی تسلیم مقدس مقام کی عقیدت کے طور
سے زیارت کی اجازت دی گئی۔ جہاں تک کہ
انیسویں صدی کے باقی سالوں کا تعلق ہے اس میں
تارکین وطن یہود نے دو مرتبہ شاہی حکم سے فائدہ
اٹھایا۔ ۱۸۵۴ء میں انہوں نے برطانوی قونصلیٹ کی
مدد سے ایک تباہ شدہ عمارت کی جگہ معبد تعمیر کرنے کی
اجازت حاصل کر لی کہ یہاں بھی معبد تھا۔ حالانکہ
کسی قدیم میکی، یہودی یا اسلامی مصنف نے اس
مقام پر کسی "معبد" کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا۔ اس
کے علاوہ انہوں نے جو دستاویزات پیش کیں وہ جعلی
تھیں اور ان کی زبان بذات خود مشکوک تھی لیکن
برطانوی سفیر نے اپنا پورا اثر و رسوخ استعمال کر کے
یہود کو "قدیم معبد" کی تعمیر نو کی اجازت دلوا دی اور
یوں شہر قدس میں یہود کے دو معبد بن گئے۔

اس وقت یہود کی تعداد کتنی تھی؟ اس بارے میں
ترک ریکارڈ خاموش ہے کیونکہ خود یہود نے ممتاز
یہودی مصنف سر موس مونٹ فوئر کے مطابق ۱۸۴۹ء
میں مردم شماری حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک یہود
کی فلسطین میں آمد انتہائی بے کسی کے عالم میں تھی۔
صرف معمر یہودی اپنی زندگی کے آخری دن اس
سرزمین موعود میں گزارنے کے لیے آتے تھے لیکن

۱۸۸۱ء میں جب روس سے یہودیوں کا انخلاء شروع ہوا تو یہود کی آمد نے سیاسی رنگ اختیار کرلیا۔ آخر اپنی تمام فراخ دلی اور انسانیت کے باوجود عثمانی خلافت کو ۱۸۸۷ء میں ایک حکم جاری کرنا پڑا۔ جس کے تحت یورپی یہودیوں کی فلسطین میں آبادکاری اور زمین حاصل کرنے پر پابندی لگانا پڑی لیکن ناقص انتظامیہ کی وجہ سے بیرونی یہود کی آمد فلسطین و بیت المقدس میں جائیداد کی خریداری اور آبادکاری بدستور جاری رہی۔ حتیٰ کہ دس سال کے مختصر عرصہ میں یہود نے بیت المقدس میں سخت معاشی بحران پیدا کردیا جس سے مسلمان بری طرح متاثر ہوئے۔ مسلمانوں نے ۱۸۸۱ء میں وزیراعظم سے زبردست احتجاج کیا۔ اس کے باوجود آئندہ بیس سال میں کوئی مؤثر کارروائی نہ ہوئی اور اس کا ثبوت ایوانِ نائبین کی کارروائی سے ملتا ہے جہاں ۱۹۱۱ء میں صیہونیت کے طوفان پر شدید بحث ہوئی۔

۱۹۱۱ء بیت المقدس کی تاریخ میں اس لحاظ سے نہایت اہمیت رکھتا ہے کہ یہود نے دیوارِ گریہ کی زیارت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس تک جانے والے راستہ پر قبضہ جمانے کا ایک نیا طریقہ اختیار کیا اور وہ مقامِ گریہ پر کرسیاں ساتھ لے جانے لگے۔ اس پر ابومدین وقف کے نگراں نے احتجاج کیا لیکن ترک حکام کی ممانعت کے باوجود یہود کی روش میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ آخر حکومت نے ۱۸۴۰ء کی طرح ایک نیا حکم جاری کیا۔ ۱۲ نومبر ۱۹۱۱ء کو انتظامی کونسل نے بیت المقدس کے گورنر کو حسب ذیل مسودہ برائے حکم پیش کیا:

شعیب ابومدین (خدا اس کی یاد ہمیشہ باقی رکھے) کے وقف کے نگراں نے شکایت کی ہے کہ یہود جو حرم شریف کی دیوار البراق کے مغربی حصہ کی زیارت کے عادی ہیں بشرطیکہ وہ زیارت کے دوران کھڑے رہیں انہوں نے اب اس روایت کے برعکس زیارت کے دوران بیٹھنے کے لیے کرسیاں لانا شروع کردی ہیں چونکہ یہ جگہ اس وقف کی ملکیت اور بند گلی ہے اس لیے نگراں نے درخواست کی ہے کہ یہود کو اس سے روکا جائے۔ کہیں وہ مستقبل میں اس پر ملکیت کا دعویٰ نہ جتادیں۔ نگراں کی درخواست پر قابل احترام مفتی اعظم مذہبی اوقات کے محکمہ اور دینی عدالتوں نے غور کیا ہے اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جگہ ان رہائشی مکانات سے متعلق ہے جو مسجد اقصیٰ سے متصل مغربی جانب ہیں۔ یہ ایک بند کوچہ ہے جو کہ ابومدین وقف کی ملکیت ہے اور اسلامی قوانین کے تحت اس جگہ یہود کا کرسیاں رکھنا، پردے لگانا یا کوئی ایسی شے لانا یا کوئی ایسی ایجاد کرنا جو بالآخر اقصیٰ کی مبارک مسجد کی دیوار پر ملکیت کا باعث بنے، غیر قانونی ہے۔ اس لیے یہود کو ان اختراعات سے روکنے کے لیے مناسب اقدام کیے جائیں۔

انتظامی کونسل نے تفصیلی غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ کسی ایسی شے کو اس جگہ رکھنے کی اجازت نہ دی جائے جو اس جگہ یا مسجد اقصیٰ کی دیوار پر ملکیت کا حق جتانے کا باعث بنے۔ لہٰذا حکم دیا جاتا ہے کہ اس قسم کی اختراع کا کوئی موقع نہ دیا جائے بلکہ قدیم روایت ہی کو برقرار رکھا جائے۔

پہلی جنگ عظیم کے آغاز میں جو فلسطین پر مسلمانوں کے صدیوں پرانے دورِ حکومت کے خاتمہ اور برطانوی قبضہ کے باعث بنی، یہ پوزیشن تھی۔ لیکن ۱۹۱۴ء میں صورت حال بالکل بدل گئی۔ عرب، ترکوں سے باغی ہوگئے اور برطانیہ نے آزادی کا کچھ ایسا فریب دیا کہ بیت المقدس میں ترک کمانڈر جمال پاشا کی ہر اپیل بےکار ثابت ہوئی جو اس نے اس شہر کے مقامات کو عیسائی قبضہ سے بچانے کے لیے تمام مسلمانوں سے مشترکہ دفاع کے لیے کی۔ جنرل ایلن بی شہر میں داخل ہوگیا اور اس نے اعلان کیا کہ:

”تینوں مذاہب کی ہر مقدس عبارت، یادگار اور عبادت کی روایتی جگہ کو خواہ وہ کسی صورت میں بھی ہو اس مذہب کے پیروکاروں کے موجودہ عقائد کے مطابق برقرار رکھا جائے گا۔“

لیکن نصف فلسطین پر ابھی ترک قابض تھے اور برطانیہ کی قطعی فتح میں ایک سال باقی تھا کہ صیہونیوں نے اس اعلان کی خلاف ورزی شروع کردی اور ۳۰ مارچ ۱۹۱۸ء کو صرف اجتماعی طور پر آہ و بکا کی بلکہ شور و ہنگامہ مچایا اور دس دن بعد ویزمن کے صیہونی کمیشن نے اس حرکت کو دہرایا۔ صیہونی کمیشن کی آمد نے مسلمانوں اور عربوں میں سخت خوف و ہراس پیدا کردیا تھا۔ ایک طرف مصر کے حاکم نے برطانوی حکام کو مسلمانوں کے خوف سے آگاہ کیا تو دوسری طرف لبنان کے مسیحی عرب مصنف ڈاکٹر فارس نمیر نے کمیشن کے برطانوی رابطہ افسر کو عیسائیوں کے خوف و ہراس سے باخبر کیا۔ مگر اسے یہود دشمن پروپیگنڈے کا اثر قرار دے کر نظرانداز کردیا۔ آخر ۳۰ مئی ۱۹۱۸ء کو خود ویزمن نے لارڈ بالفور کے نام اپنے خط میں انکشاف کردیا۔ اس نے لکھا:

”دیوارِ گریہ فوراً حوالے کردی جائے۔ فلسطین میں یوں تو ہمارے کئی مقدس مقامات ہیں لیکن دیوارِ گریہ ہمارے قدیم ہیکل کا حصہ ہے جس سے ہمارا تعلق اب تک باقی ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام مقامات عیسائیوں اور مسلمانوں کے قبضے میں ہیں۔ ... گرد بھی انتہائی غیر صحت مندانہ ماحول ہے جو ... لیے ذلت اور ندامت کا باعث ہے۔ ... ترین شہر میں ہماری مقدس ترین یادگار ایک مشکوک مذہبی فرقہ کے تصرف میں ہے۔ ہم اسے اس کے معاوضہ میں گرانقدر رقم دینے کے لیے تیار ہیں کیونکہ اس جگہ کو ہم صاف ستھرا، باوقار اور قابل احترام بنانا چاہتے ہیں۔“

اس پر بیت المقدس کے فوجی گورنر نے مفتی اعظم کو محتاط انداز سے مغربی دیوار سے متصل مکانات کی خریداری کے لیے رابطہ کیا لیکن ان کا جواب صرف ایک ہی تھا کہ کسی مسلم اوقاف کی کوئی جگہ کسی قیمت پر فروخت نہیں کی جاسکتی۔ مسلمان اس قدر مقدس مقام کو کسی قیمت پر فروخت کرنے کی اجازت نہ دیں گے۔

مگر یہودی کل بھی فتنہ پرور اور بے ایمان تھے اور آج بھی ان کا وہی رویہ ہے۔

فلسطین ختم ہوگیا۔ مسلمانوں کو جو کچھ بھی ملا اس سے یہودی بدظن ہیں اور اپنے حمایتی برطانیہ اور امریکہ سے ہمہ وقت آس لگائے بیٹھے کہ وہ بیت المقدس کا وہ حصہ بھی مسلمانوں سے چھین کر پورے فلسطین پر یہودیوں کو قابض کرادے۔ مگر ہم بھی مسلمان ہیں۔ ان شاء اللہ نہ صرف مسلمان بیت المقدس کے اپنے حصے کی پوری پوری حفاظت کریں گے بلکہ مقبوضہ بیت المقدس کو بھی یہودیوں سے آزاد کرائیں گے۔

آمین ثم آمین

فریب

اسرار احمد

عورت کو اللہ تعالیٰ نے جہاں بے شمار خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہاں اس کے دل میں انتہا درجہ کینہ بھی پیدا کیا ہے۔

ایک خوبصورت لڑکی کی روداد جو ناگن بن گئی تھی

رات تقریباً آدھی گزر چکی تھی اور میرا خیال ہے کہ اگر اب میں نے اس کہانی کے لکھنے کا آغاز نہیں کیا تو شاید میں اسے کبھی نہ لکھ سکوں۔ پچھلی شام سے میں یہیں بیٹھا بیٹھا مسلسل یہ سوچتا رہا ہوں کہ اس کہانی کو کس طرح شروع کروں لیکن میں اس کے بارے میں جتنا سوچتا ہوں اتنی ہی مجھ پر مایوسی اور شرمندگی مسلط ہوتی جاتی ہے اور میں اپنی ہی نظروں میں اپنے آپ کو حقیر محسوس کرنے لگتا ہوں۔

سارہ کے ساتھ میرا جو بھی رویہ رہا اس کے لیے میرے پاس میرے خیال میں بہت معقول وجہ تھی لیکن پھر بھی میں اپنے عمل پر شرمندہ تھا میں نے خود کو اور اپنے دوستوں کو بہت اچھی طرح احمق بنایا تھا میں سارہ کی مخالفت میں اتنا آگے نکل گیا کہ میں نے اپنے دوستوں کو بھی کھودیا۔ ایسے دوستوں کو جو مجھ جیسے ادھیڑ عمر اور شاہ خرچ رئیس کی دوستی پر فخر کرتے تھے۔ ایسے شخص کی دوستی پر جس کی زندگی میں کوئی عورت' کبھی محبوبہ کا درجہ نہیں پاسکتی تھی جس کی زندگی میں ایک چاہنے والی ہستی کی ہمیشہ کمی رہی۔ ایسی چاہنے والی ہستی کی کمی جو بغیر کسی لالچ اور غرض کے محبت کرتی ہو۔

جو کچھ ہوا اس کی ساری ذمہ داری مجھ ہی پر نہیں آتی بلکہ اس کی کچھ ذمہ داریاں فرح پر بھی آتی ہیں جس نے اس ہنگامے کا آغاز کیا تھا اب سے کوئی چھ ماہ پہلے کی بات ہے میں ایک تقریب کے اختتام پر فرح کو چھوڑنے اس کے گھر تک گیا راستے میں اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں' بہت سے لوگوں کے متعلق عام اور ذاتی باتیں اور اسی دوران اس نے سارہ کے بارے میں بھی بات کی جس کی بدولت میں اس ناگوار واقعے کا سبب بنا۔

فرح شکل وصورت کے اعتبار سے خوش قسمت ضرور تھی لیکن اس کا قد خاصا چھوٹا تھا اور کچھ عرصے پہلے اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی وہ عمر میں مجھ سے چند سال چھوٹی تھی اب سے تیس سال پہلے وہ یقیناً ایک دل موہ لینے والی چیز رہی ہوگی لیکن اب اس میں کوئی کشش نہیں تھی۔

میں اسے اس کے گھر کے دروازے پر چھوڑ کر رخصت ہونا ہی چاہتا تھا کہ اس نے مجھے اندر آنے کی دعوت دی اور میں چند لمحے ٹھہرنے کے خیال سے اس دعوت کو قبول کر بیٹھا۔

''دیکھو احمد! میری تصویر کیسی ہے؟'' اس نے اپنے ڈرائنگ روم میں لگی اپنی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''اچھی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ نوید خان ایک ذہین مصور ہے اور تم بھی یہ تصویر دیکھ کر اس کے بارے میں یہی کہو گے ہے نا احمد۔'' فرح نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہوں...... شاید۔'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''کیوں لگتا ہے کہ تم میری ہاں میں ہاں ملا رہے ہو لیکن تمہیں میری بات سے اتفاق نہیں ہے۔'' فرح نے برا ماننے والے انداز میں اٹھلا کر کہا۔

''ہاں دیکھو نا' جب تک میں خود اس کا تجربہ نہ کرلوں کہ واقعی وہ ذہین ہے اس کی داد کیسے دے سکتا ہوں۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو لیکن کیا تمہیں معلوم ہے وہ اس وقت کا سب سے مہنگا مصور ہے۔''

''واقعی؟''

''ہاں اور ہر کسی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کی تصویر بنائے۔'' فرح نے کہا۔

''اچھا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا فرح چونک کر میری جانب دیکھنے لگی یوں جیسے اچانک اس کے ذہن میں کوئی اور خیال آیا ہو۔

''احمد! میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''لیکن شاید میں تمہارے راز کو راز نہ رکھ سکوں۔'' میں نے واپسی کے لیے اٹھتے ہوئے بے دلی سے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ تم میری بات دھیان سے سنو گے کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ تم بھی مصوری سے خاصی دلچسپی رکھتے ہو۔''

''اچھا بتاؤ!'' میں نے نیم دلی سے واپس بیٹھتے ہوئے کہا میں اس کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا۔

''سب سے پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم کسی کو بھی اس راز کے بارے میں نہیں بتاؤ گے۔''

''اوہ خدایا!'' میں نے اکتا کر کہا۔

''دیکھو احمد!'' اس نے پھر برا مانتے ہوئے کہا۔

''اچھا بھئی میں وعدہ کرتا ہوں۔''

''اب ٹھیک ہے' سنو!'' فرح میرے قریب کھسک آئی۔

''میرا خیال ہے تم جانتے ہو کہ نوید خان صرف بیٹھی خواتین کی تصاویر بناتا ہے؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں' میں نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ جو تصویریں بناتا ہے وہ سب قدِ آدم ہوتی ہیں' خواہ وہ بیٹھی ہوئی خواتین کی ہوں یا کھڑی ہوئی جیسی کہ تم نے میری بھی تصویر دیکھی ہے تم اسے غور سے دیکھو کیا تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس باکمال مصور نے لباس کو کس طرح پینٹ کیا ہے؟''

''ہوں۔'' میں نے قریب سے تصویر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''ذرا اور قریب سے دیکھو۔'' فرح نے کہا اور میں بغور تصویر کا جائزہ لینے لگا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے یہ محسوس کیا کہ تصویر میں موجود لباس تصویر کے باقی خدوخال سے زیادہ گہرا اور ابھرا ہوا تھا یہ مصور کی ایک چال تھی جس نے تصویر کو زیادہ پرکشش بنادیا تھا لیکن میرے خیال میں یہ کوئی مشکل ترکیب نہیں تھی۔

''تم نے کچھ محسوس کیا۔'' فرح نے پوچھا۔

''جہاں لباس دکھایا گیا ہے وہاں پر تصویر موٹی ہے' ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''لیکن اس تصویر میں اس کے علاوہ ایک اور خاص بات ہے اور وہ بات میں تمہیں اس طرح زیادہ اچھی طرح سمجھا سکتی ہوں کہ میں اس تصویر کے بنوانے کے لیے جب پہلی بار نوید خان سے ملی اس نے مجھے بتایا کہ اس کا تصاویر بنانے کا طریقہ کیا ہے اس کے بعد چند روز تک جب تصویر کا رنگ سوکھ جاتا ہے وہ انتظار کرتا ہے پھر لباس پینٹ کرتا ہے۔''

''کیا یہ درست ہے؟''

''ہاں یہ صحیح ہے اور یہ راز اس کے ماڈل اور اس کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔''

"اوہ خدایا!" میں نے حیرت سے کہا۔
"مجھے حیرت ہے کہ اس کے دماغ میں یہ اختراع کہاں سے آئی۔" فرح نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اختراع کہاں سے آئے گی اس کا ذہن ہی شیطانی خیالات کی آماجگاہ ہوگا۔" میں نے ناگواری سے کہا اور وہ ہنسنے لگی۔
"ارے ایک بات تو بتاؤ آج کل تمہاری سارہ سے دوستی کا کیا حال ہے؟" اس نے مجھے چھیڑا۔
"فرح اب بس کرو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔
"بھئی اس میں چڑنے کی کیا بات ہے میں تو سارہ کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے تمہارا وہ دوسرا بوڑھا دوست اس کو اڑا لے جائے گا۔" فرح ڈھٹائی سے ہنسی۔
"فرح خدا کے لیے! سارہ ایک اچھی لڑکی ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔
"لڑکی!" فرح طنزیہ انداز میں ہنسی۔ "تم جانتے ہو احمد بعض اوقات تمہاری اچھی لڑکی کیسی باتیں کرتی ہے؟" اس نے پوچھا۔
"کیسی باتیں کرتی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"وہ باتیں کرتی ہے، بہت سے لوگوں کے بارے میں، تمہارے بارے میں۔"
"وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔
"کچھ خاص نہیں احمد! اور میرا خیال ہے کہ تم ایسی باتوں میں دلچسپی بھی نہیں رکھتے۔" اس نے میرے صبر سے کھیلنا شروع کیا۔
"وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟" میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔
"وہ ایسی باتیں نہیں جنہیں دہرایا جائے۔"
"فرح اس نے کیا کہا؟" میں نے غصے سے پوچھا۔" میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھے بے تحاشا پسینہ آ رہا ہے اور میں غصے سے کانپ رہا ہوں اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ سارہ نے میرے بارے میں اچھی باتیں نہیں کی ہیں۔"
"دیکھو احمد! ہوسکتا ہے کہ یہ باتیں اس نے محض مذاق میں کی ہوں میری ہمت نہیں ہو رہی کہ میں تمہیں یہ سب بتاؤں یوں سمجھ لو کہ وہ تمہیں بہت بور انسان سمجھتی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"میرا مطلب ہے وہ تمہارے ساتھ گھومنے پھرنے کو، تمہیں اور تمہاری دوستی کو پسند نہیں کرتی۔"
"کیا اس نے یہ سب کہا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں اور اس کے علاوہ......" فرح کہتے کہتے رک گئی اور مسکرا کر میری جانب دیکھنے لگی۔
"اس کے علاوہ اس نے اور کیا کہا؟"
"اس نے کہا کہ مجھے اس بوڑھے خرانٹ احمد کے ساتھ کھانے پر جانا ہے میں اس کے ساتھ بور ہو جاتی ہوں۔" فرح نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔
"سارہ نے یہ کہا ہے؟"
"ہاں پیارے۔"
"اور کیا کہا ہے؟"
"بس اتنا ہی کافی سمجھو اس کے علاوہ میں اور کچھ نہیں بتا سکتی۔" اس نے انجان بن کر کہا۔
"خدا کے لیے فرح! اب بتاؤ بھی۔" میں نے زور سے کہا۔
"جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے جو کچھ کہا ہے یوں تھا کہ جب مجھے احمد کے ساتھ گھومنے جانا ہوتا ہے تو میں پہلے سے بتا سکتی ہوں کہ پروگرام کیسے شروع ہوگا اور کیسے انجام کو پہنچے گا وہ مجھے میرے گھر سے لے گا اور قریب ہی ریسٹورنٹ میں لے جائے

گا وہ بیٹھ وہیں جاتا ہے پھر وہاں وہ کچھ دیر تک [illegible]روں کے بارے میں باتیں کرتا رہے گا پھر ہم کھانا کھائیں گے اور وہ ٹیکسی میں مجھے میرے گھر تک چھوڑنے آئے گا راستے میں وہ خواہش ظاہر کرے گا کہ کاش وہ بیس سال کا جوان ہوتا وہ اپنے ماضی کے قصے چھیڑ دے گا اور میرے قریب ہو کر میرا ہاتھ تھام لے گا پھر میرا گھر آ جائے گا میں ٹیکسی سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھ جاؤں گی اور احمد سے کہوں گی کہ وہ واپس چلا جائے لیکن وہ بالکل بہرہ بن جائے گا اور ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دے کر چلتا کر دے گا پھر جب میں دروازہ کھول کر سیدھی کھڑی ہوں گی تو وہ میرے پیچھے آ موجود ہوگا، میں تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو جاؤں گی اور اس سے پہلے کہ احمد اندر آئے میں اسے شب بخیر کہہ کر دروازہ بند کرلوں گی......" فرح بات کرتے کرتے رک گئی اور میری طرف غور سے دیکھنے لگی۔
"کیا بات ہے تم کچھ بیمار بیمار سے نظر آ رہے ہو؟" اس نے مجھ سے پوچھا لیکن میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور تیزی سے اس کے گھر سے نکل گیا۔
میں اس بارے میں ساری رات سوچتا رہا اور فرح کی بتائی ہوئی باتوں کے ساتھ ساتھ میرے دل میں سارہ کے لیے نفرت نے سر ابھارا اور پھر چند ہی منٹ بعد مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں اس سے بے تحاشا نفرت کرتا ہوں اور اس سے کسی نہ کسی طرح اپنی اس بے عزتی کا بدلہ اور بے وفائی کی سزا دینا چاہتا تھا پھر میں کافی دیر تک ایسے طریقوں کے بارے میں سوچتا رہا جن پر عمل کر کے میں سارہ کو کیفر کردار تک پہنچا سکوں لیکن وہ سارے طریقے نہایت فرسودہ تھے میں ان پر عمل نہیں کرنا چاہتا تھا پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک اور ترکیب آئی اور میں خوشی سے اچھل پڑا، میں نے قریب رکھی ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔
"ہیلو مسٹر نوید خان!" میں نے ماؤتھ پیس میں کہا۔
"میں بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔
"مسٹر خان! میں احمد بول رہا ہوں۔" میں نے اپنا تعارف کرایا، سوسائٹی میں ایک امیر اور مصوری کے دلدادہ کی حیثیت سے اتنا جانا جاتا تھا کہ خان نے فوراً ہی مجھے پہچان لیا۔
"اوہ! میرے لائق کوئی خدمت؟"
"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں آج ہی۔" میں نے کہا۔
"میں چند گھنٹوں بعد فارغ ہوں گا آپ اپنا پتا مجھے بتا دیں، میں حاضر ہو جاؤں گا۔" خان نے کہا اور میں نے اسے پتا لکھوا کر فون بند کر دیا۔
مقررہ وقت پر نوید میرے گھر آ گیا اور میں نے اس سے اپنی لائبریری میں ملاقات کی، وہ ایک محنتی سا انسان تھا۔
"اتنی عجلت میں یہاں بلانے پر میں معافی چاہتا ہوں نوید!" میں نے کہا۔
"کوئی بات نہیں جناب!" اس نے جواب دیا۔
"دراصل میں تمہارے کام سے بہت متاثر ہوں اور میں تم سے ایک تصویر بنوانا چاہتا ہوں۔" میں نے براہ راست مطلب کی بات کی۔
"جی فرمائیے؟" اس نے میرے اشارے پر ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"میں جو کام تم سے لینا چاہتا ہوں وہ نہایت ذاتی نوعیت کا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ تم میرے اس کام کو نہایت رازداری سے انجام دو گے۔"
"آپ مجھ پر پورا اعتماد کر سکتے ہیں۔" اس نے فرماں برداری کا مظاہرہ کیا۔
"ٹھیک ہے، میں اس شہر میں موجود ایک خاتون

کی تصویر تم سے بنوانا چاہتا ہوں' میں چاہتا ہوں کہ یہ کام تم خاص توجہ سے کرو لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس خاتون کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کی یہ تصویر میں بنوا رہا ہوں۔"

"یعنی آپ سامنے نہیں آنا چاہتے دوسرے لفظوں میں آپ اسے سرپرائز دینا چاہتے ہیں۔"

"ہاں تم ٹھیک سمجھے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں امید کرتا ہوں کہ تم میری توقعات پر پورے اترو گے۔" میری بات پر خان نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟ دیکھو نا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی خاتون میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتا ہو اور اس کے علم میں لائے بغیر وہ اس کی تصویر بنوانا چاہتا ہو تا کہ اسے حیران کر سکے۔"

"بالکل ممکن ہے مسٹر احمد!" نوید نے کہا۔

"بعض اوقات کوئی شخص اپنی قریبی ہستی کو کوئی تحفہ دینا چاہتا ہے لیکن کسی مناسب وقت کا منتظر رہتا ہے۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گیا جناب!"

"ٹھیک ہے نوید! میرا خیال ہے کہ تم میری بات اچھی طرح سمجھ گئے ہو۔ سنو! اس شہر میں ایسی ایک خودسر موجود ہے جسے میں رام کرنا چاہتا ہوں اس کا نام سارہ ہے۔" میں نے کہا اور پھر اسے سارہ کا پتا سمجھایا۔

"ٹھیک ہے آپ کا کام ہو جائے گا۔" گفتگو کے آخر میں اس نے مجھ سے کہا۔

"تم ایسا کرنا خان کہ کسی تقریب میں اس سے دوستی گانٹھ لینا اور پھر اسے بتانا کہ وہ تمہاری تصویروں کا ماڈل بننے کے لیے بہترین ہے تم اسے اپنا ماڈل بنانا چاہتے ہو' مجھے امید ہے سارہ بخوشی تمہاری درخواست مان جائے گی پھر تم اس کی تصویر بنانا اور نمائش کے بعد مجھے وہ دے دینا۔ تمہارے علاوہ یہ حقیقت کوئی نہیں جان پائے گا کہ یہ تصویر تم سے میں نے خریدی ہے۔"

"لیکن جناب......!"

"تم فکر مت کرو' تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' تمہیں تو ایک عاشق مزاج بوڑھے کی طرف سے ایک معقول رقم کا نذرانہ بہرحال مل ہی جائے گا۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں جانتا ہوں احمد صاحب!"

"میں تمہاری فیس سے دُگنی اُجرت تمہیں دوں گا۔" میں نے کہا تو اس کا چہرہ دمک اٹھا۔

"ٹھیک ہے لیکن میں یہ بتا دوں کہ اس طرح کا کام کرنا میرا طریقہ نہیں ہے لیکن اتنی رومانٹک پیشکش کو ٹھکرانا بھی تو اچھی بات نہیں ہے۔"

"ہوں......" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے قدِ آدم تصویر ہی چاہیے جو تم ایک بڑے کینوس پر بناؤ گے۔"

"میں ساٹھ ضرب تیس کے سائز کی تصویر بنا دوں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تصویر میں اسے کھڑے ہوئے دکھایا گیا ہو اس کا یہ انداز پُرکشش ہوگا۔"

"میں بالکل سمجھ گیا جناب!"

"ٹھیک ہے تو پھر میں یہ معاملہ اب تم پر چھوڑتا ہوں۔" میں نے مطمئن ہونے کے بعد کہا۔ "بس یہ یاد رکھنا کہ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ایک راز ہے جس کی خبر کسی تیسرے شخص کو نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا اور کچھ دیر بعد نوید خان رخصت ہو گیا۔

میں خوشی سے بے قابو ہو کر چیخ پڑا' میں جانتا تھا کہ میرے پلان کا پہلا حصہ کامیابی سے مکمل ہو چکا ہے۔ اب مجھے صرف انتظار کرنا تھا کیونکہ خان کے [illegible] کرنے کا طریقہ دیر طلب ہی تھا۔ ممکن تھا کہ اسے اس کام میں کئی ماہ لگ جائیں لیکن مجھے صبر سے انتظار کرنا تھا اور بس۔

اسی شام میں نے سارہ کو ایک خط لکھ کر اطلاع دی کہ میں اس کے ساتھ رات کے کھانے کی دعوت منسوخ کر رہا ہوں کیونکہ مجھے اپنے کام کے سلسلے میں دوسرے شہر جانا ہے۔ اس کے بعد میں دوسرے ہی دن روانہ بھی ہو گیا اور جب چار ماہ بعد میں آرٹ اکیڈمی کی افتتاحی تقریب کے بعد واپس آیا تو وہاں تصاویر کی نمائش میں سارہ کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔

جب اکیڈمی کی نمائش ختم ہوئی تو نوید نے وعدے کے مطابق وہ تصویر میرے گھر پہنچا دی اور میں نے اس کا معاوضہ اسے ادا کر دیا پھر میں اس تصویر کو فوراً ہی اپنے خاص کمرے میں لے گیا تھا جہاں میں بھی شوقیہ تصویریں بنانے کا کام کرتا تھا پھر میں نے اس تصویر کا قریب سے بغور جائزہ لیا تھا نوید نے سارہ کو شام کے سیاہ لباس میں پینٹ کیا تھا وہ کھڑی ہوئی تھی اس کے پیچھے سرخ صوفہ سیٹ رکھا تھا اس کا ایک ہاتھ کرسی کی پشت پر رکھا تھا میں اس کی وہ تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا میں نے کبھی اسے اتنا خوب صورت نہیں دیکھا۔ میں نے تصویر پر انگلیاں پھیر کر دیکھا اور میری خوشی کی انتہا نہ رہی' ہاں وہ تصویر کچھ خاص حصوں پر سے موٹی تھی میں نے اپنا کوٹ اتار کر پھینک دیا اور اپنے کام کا آغاز کر دیا۔

تارپین میں چند قطرے الکحل کے ملائے اور روئی اس میں بھگو کر بڑی آہستگی کے ساتھ دائروں میں ہاتھ چلاتے ہوئے اس روئی کو تصویر میں موجود لباس پر پھیرنے لگا' میں تھوڑی دیر بعد [illegible] میں الکحل کے ایک ایک قطرے کا اضافہ کرتا [illegible] یہاں تک یہ محلول خاصا تیز اثر ہو گیا تھا۔

معلومات

(1) صوبہ پنجاب کے صدر مقام لاہور کا مشہور شاہی قلعہ مغل شہنشاہ محمد جلال الدین اکبر نے تعمیر کرایا۔

(2) سرسید احمد خان بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے دہلی کی پرانی عمارات پر ایک کتاب "آثار الصنادید" لکھی تھی۔

(3) انڈیا کے مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النساء شاعرہ تھیں۔

(4) مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی ملکہ ممتاز محل کا اصل نام ارجمند بانو تھا۔ جو ہندوستان کے صوبے یوپی کے مشہور شہر آگرہ کے مقبرے تاج محل میں دفن ہیں۔

(5) مسدس اس نظم کو کہتے ہیں جس میں چھ مصرعے ہوتے ہیں۔

(6) مولانا الطاف حسین حالی کا انتقال 1914ء میں ہوا تھا۔

مسلسل ایک گھنٹے کی محنت کے بعد سیاہ لباس کی تہہ سے گلابی رنگ کا ایک نقطہ ابھرا جو آہستہ آہستہ ایک انچ قطر میں پھیل گیا اور مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ سیاہ لباس کو نچلی سطح پر موجود خدوخال سے جنہیں پہلے پینٹ کیا تھا آسانی سے چھڑایا جا سکتا ہے۔

میں کئی روز تک اس تصویر پر کام کرتا رہا تھا اور جب میرا کام مکمل ہوا تو میں نے اس کمرے میں اس تصویر کے ساتھ ٹھہرنے کو گستاخی سمجھتے ہوئے کمرے سے نکل کر کمرہ لاک کر دیا' میرے پلان کا ایک اور حصہ مکمل ہو چکا تھا اس رات میں سو نہیں سکا لیکن اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اپنے پلان کے اگلے حصے پر عمل کر رہا تھا میں نے شہر کے پچیس منتخب افراد کو جن میں امیر ترین شخصیات اور سارہ کے جاننے والے شامل

تھے دعوت نامے لکھے تھے اوران سے اپنے گھر ہونے والی ایک دعوت میں شرکت کی درخواست کی تھی۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ سارہ سے انتقام لینے کا میرا منصوبہ مکمل ہو چکا تھا' اب آخری کارروائی کی ضرورت تھی اور اس کے لیے مجھے اس دن کا انتظار تھا جب تمام مہمان میرے گھر جمع ہونے والے تھے۔

مقررہ تاریخ اور وقت پر میرا گھر مہمانوں سے بھر گیا تھا' ہال میں لوگ ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ فضا میں قہقہے بکھر رہے تھے۔ سارہ بھی میری دعوت پر آئی اس نے وہی سیاہ لباس پہنا ہوا تھا جو تصویر میں پہنا تھا میرا دل خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ میرے منصوبے کے مکمل ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

ڈنر کی تیاری کا اعلان ہوتے ہی میں بھی دوسرے مہمانوں کے ساتھ ڈائننگ ہال میں داخل ہوا اور وہاں موجود اندھیرے میں بہت سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' جن میں دبی دبی چیخیں بھی تھیں۔

''میرے خدا یہاں کتنا اندھیرا ہے۔'' ایک آواز سنائی دی۔

''یہاں تو بہت چھوٹی اور کم موم بتیاں جلائی گئی ہیں۔'' کسی نے کہا۔

''لیکن یہ سب کتنا رومانٹک لگ رہا ہے۔''

کمرے میں موجود کھانے کی میز پر دو فٹ کا فاصلہ چھوڑ کر چند موم بتیاں روشن تھیں' جن سے میز پر تو کچھ روشنی تھی لیکن باقی کمرہ مکمل اندھیرے میں تھا یہ طریقہ میں نے اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے منتخب کیا تھا جلد ہی مہمان اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تھے اور کھانے کا آغاز ہو گیا تھا۔

اندھیرے میں مہمانوں کی آوازیں عام حالات کے مقابلے میں تیز محسوس ہو رہی تھیں' ان سب آوازوں میں سارہ کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی' وہ اپنے قریب بیٹھے کنور مسعود سے باتیں کر رہی تھی' وہ اسے بتا رہی تھی کہ پچھلے ہفتے اس نے کسی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا تھا اور وہ وقت کس قدر بور گزرا تھا۔

میں خاموشی سے موم بتیوں کو دیکھ رہا تھا میں خاصا نروس بھی تھا لیکن اس تاریک کمرے میں ادھر آوازوں کے درمیان جب بھی مجھے سارہ کی آواز سنائی دے جاتی یا اس کے چہرے کی کوئی جھلک نظر آ جاتی تو میرے دل میں گدگدیاں ہونے لگتیں۔

پھر جب تقریباً تمام مہمان کھانا کھا چکے تو میں نے اپنے انتقام کو انجام تک پہنچانے کے منصوبے پر عمل کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب لائٹیں آن کر دی جائیں کیونکہ موم بتیاں ختم ہی ہونے والی ہیں۔'' میں نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا اور ایک مہمان کو آواز دی جو سوئچ بورڈ کے قریب بیٹھی تھی۔

''تم ذرا سوئچ آن کر دو۔''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کمرہ روشنی میں نہا گیا۔ کمرے میں موجود لوگ بار بار اپنی آنکھوں کو جھپکانے لگے تاکہ وہ تیز روشنی میں دیکھنے کی عادی ہو جائیں۔

اسی لمحے میں اپنی کرسی سے اٹھا اور چپکے سے کمرے سے نکل گیا' کمرے سے نکلتے نکلتے میری نظر نے ایک ایسا منظر دیکھا جسے میں ساری زندگی بھلا نہیں سکوں گا۔ وہ سارہ تھی اس کے دونوں ہاتھ خلا میں رکے ہوئے تھے وہ ساکت تھی اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔

پھر میں ہال کے درمیان ہی پہنچا تھا کہ مجھے خواتین کی شرم میں ڈوبی چیخیں سنائی دیں کچھ مرد غصے اور ناگواری کا اظہار بھی کر رہے تھے پھر وہ آوازیں شور

میں تبدیل ہو گئی تھیں اور کچھ ہی دیر بعد مجھے کنور مسعود کی آواز سنائی دی تھی۔

''ارے کوئی ہے' جلدی کرو سارہ کو تھوڑا پانی دو۔'' میں اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ اپنی تصویر قدرتی لباس میں دیکھ کر بے ہوش ہو گئی تھی' میں تیزی سے گھر سے نکلا اور باہر کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا' میرا ڈرائیور مجھے وہاں سے کئی میل دور واقع میرے دوسرے گھر میں لے گیا تھا۔

اگلے دو دن میں نے اس تصور سے لطف اندوز ہونے میں گزارے تھے کہ میں سارہ سے اپنی بے عزتی اور اس کی بے وفائی کا بدلہ لے چکا تھا' میں خوشی سے سرشار تھا کہ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فرح نے مجھے فون کیا اور اس فون کو ریسیو کرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں نے جو کچھ کیا تھا وہ کوئی کارنامہ نہیں تھا اور نہ ہی میں کوئی ہیرو بن گیا تھا' میرے تمام دوست مجھ سے ناراض ہو گئے تھے اور میری برائیاں کرتے پھر رہے تھے' ان سب نے مجھ سے کبھی نہ ملنے کا عہد کر لیا تھا لیکن سارہ خاموش تھی اور فرح کے کہنے کے مطابق وہ مجھ سے مل کر اپنی بے وفائی کی معافی مانگنا چاہتی تھی اور یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔

میں کئی دن سے اس موضوع پر سوچ رہا تھا کہ آج دوپہر ایک اور حیرت ناک بات ہوئی۔ دوپہر کی ڈاک سے مجھے ایک خط ملا جسے پڑھ کر میں پانی پانی ہو گیا۔ سارہ نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس نے میری حرکت کو بھلا دیا تھا اور لکھا تھا کہ وہ سمجھتی ہے کہ یہ ساری حرکت میری طرف سے کیا جانے والا مذاق تھا' اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ دوسرے لوگ میرے متعلق جو زہر اگلتے پھر رہے ہیں' میں اس پر دھیان نہ دوں اور وہ اب بھی مجھ سے پہلے کی طرح محبت کرتی ہے۔

یہ سب کچھ پڑھ کر میں اپنے آپ کو بہت کم تر اور ذلیل محسوس کر رہا ہوں' اسی خط کے ساتھ سارہ نے مجھے ایک پارسل بھی بھیجا ہے' یہ ایک آدھا کلو کا جار ہے' جس میں میرا پسندیدہ سیب کا مربہ رکھا ہے اور میں کسی حالت میں بھی سیب کے مربے سے نظر نہیں چرا سکتا' یہ میری پسندیدہ ڈش ہے اور میری سب سے بڑی کمزوری بھی ہے' میں نے سب باتوں کو بھلا کر سیب کا وہ مربہ کھانا شروع کر دیا ہے' جو بہت لذیذ اور شیریں ہے' لیکن پتا نہیں کیوں یہ مربہ کھاتے کھاتے میں کچھ گرانی سی محسوس کرنے لگا ہوں لیکن اس گرانی کا بھی علاج ہو جائے گا' میں سوڈا بائی کاربونیٹ کی خوراک لے لوں گا مگر یہ مربہ تو بہت ہی لذیذ ہے...... لیکن نہیں میں یہ بعد میں کھا لوں گا میں...... یہ خوراک لینے بھی نہ جا سکوں...... اوہ' مجھے کیا ہو رہا ہے...... میں کھڑا بھی نہیں ہو سکتا...... یہ میرے ہاتھ سے مربے کا جار بھی چھوٹ گیا ہے اور سارا مربہ فرش پر بکھر گیا ہے...... میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں...... اور......اور...... سارہ...... سارہ......کھڑی مسکرا رہی ہے۔

آہ! سارہ تم نے اپنی بے عزتی کا اچھا بدلہ لیا میں اسی قابل تھا۔

محافظ

صبا احمد

اک ننھی روح کا کمال، اس نے پالنے میں رہتے ہوئے اپنے باپ کی رہنمائی کی تھی

مغربی کہانیاں پسند کرنے والوں کے لیے ایک مختصر مگر بڑی کہانی

وہ آدھا دروازہ کھولے ان دونوں کو دیکھتا رہا۔

"ڈیمن!" ان میں سے ایک نے کہا۔ "کیا تم اپنے پرانے دوستوں کو بھی بھول گئے ہو۔"

"جو تم سے ملنے آئے ہیں۔" دوسرے نے کہا۔ "تمہارے یار ہیں۔"

ڈیمن نے نفی میں سر ہلایا۔ "دو بدمعاشوں کا اکٹھے آنا بے مقصد نہیں ہوسکتا۔" ڈیمن نے کہا۔

"مقصد صرف تم سے ملنا تھا۔" دونوں ایک زبان ہو کر بولے۔ وہ دونوں اب تک اس سے ڈرتے تھے۔ ڈیمن مسکرایا۔

"اب تک تمہیں میری یاد کیوں نہیں آئی۔ خیر اندر آؤ۔" اس نے دروازہ پورا کھول دیا۔ ڈیمن کا قد ان دونوں سے زیادہ تھا۔ جسمانی طور پر پہلے بھی وہ ان سے کہیں زیادہ صحت مند اور مضبوط تھا لیکن اب اس کی صحت گزشتہ چند برسوں میں اور بہتر ہوگئی تھی۔ فراغت خوف اور اندیشوں سے بے نیاز زندگی کے علاوہ گھر کی آسائش کا اس میں آب و ہوا سے زیادہ دخل تھا۔ جیل کی روٹیوں میں اور بیوی کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ انہوں نے سنا تھا کہ ڈیمن نے شادی کرلی ہے۔

وہ دونوں کمزور تو خیر نہیں تھے مگر ابھی ابھی جیل سے رہا ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کی صحت ڈیمن کو پہلے سے خراب لگی۔

"تم دونوں نے ابھی تک اپنے کرتوت نہیں چھوڑے۔" ڈیمن جیل سے رہا ہونے والے کو پہچان لیتا تھا۔ وہ دونوں چپ رہے۔ ڈیمن نے بھی بھدی قسم کی دو کرسیاں برآمدے میں گھسیٹ لیں۔ "بیٹھو!" وہ پیر پھیلا کر بیٹھ گئے اور غور سے گھر کا جائزہ لینے لگے۔ یہ دو کمروں کا چھوٹا سا اپارٹمنٹ تھا۔ صاف ستھرا جیسے کہ گھر ہوتے ہیں' ایک کمرے میں دو بیڈ لگے ہوئے تھے اور کھلے دروازے سے وہ دوسرے فرنیچر کو بھی دیکھ سکتے تھے۔ کونے میں ٹی وی رکھا تھا۔ دوسرے کمرے میں کھانے کی میز بھی اور کپڑوں کی الماری۔ درمیان میں غسل خانہ تھا۔ انہیں ڈیمن کی زندگی پر رشک آیا۔ ڈیمن انہیں گھر کا جائزہ لیتے دیکھتا رہا۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے؟" آنے والوں میں سے ایک بولا۔

"ہم اس سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔" دوسرا بولا۔

"سوری! وہ آج رات گھر سے باہر رہے گی۔ کل اس کی بہن کی شادی ہے۔ وہ انتظامات میں مصروف ہے۔" ڈیمن نے کہا۔

"خیر پھر سہی۔ خوب صورت تو ہوگی؟" پہلے نے پوچھا۔

"ہاں!" ڈیمن نے اثبات میں سر ہلایا۔ "مگر ٹیلر! مجھے یہ بتاؤ کہ تم چاہتے کیا ہو؟" ڈیمن نے دونوں کی جانب دیکھ کر کہا۔

"میں......؟" ٹیلر نے کہا۔ "ایک کپ کافی بلیک۔ دو اور ڈپ!"

"میں بھوکا بھی ہوں۔ کھانے کے لیے جو بھی مل جائے۔" ڈپ نے سادگی سے جواب دیا۔ ڈیمن ان دونوں کی فطرت سے واقف تھا۔ محض یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ ایک گھر کا مالک ہے جہاں ہر وقت ہر چیز مل سکتی ہے۔ جیل کی کوٹھڑی نہیں جہاں اپنی مرضی نہیں چلتی۔ وہ باورچی خانے میں گھس گیا۔ "میں دیکھتا ہوں ریفریجریٹر میں کیا ہے؟" پھر اس نے کیتلی میں پانی ابلنے کے لیے رکھا اور ریفریجریٹر میں سے انڈے نکال کر چھیلنے لگا۔ وہ اسے خالص شوہروں کی طرح کام کرتے دیکھتے رہے۔

"ڈپ! یہ بچہ کس کا ہے؟" ڈیمن نے ٹیلر کی آواز سنی۔

"احمق! ڈیمن کے سوا کس کا ہوسکتا ہے۔" ڈپ نے کہا۔ "تمہارا یا میرا......؟"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ کسی کا بچہ اٹھا لایا ہو۔ وہ ابھی خاصی بڑی بچیاں اٹھاتا رہا ہے۔" ٹیلر بولا۔

"شٹ اپ!" ڈیمن نے سر نکال کر کہا۔ "یہ میرا بچہ ہے اس کی شکل دیکھو۔" وہ پھر انڈے چھیلنے لگا۔

"وہ تو ٹھیک ہے ڈپ! بچہ بالکل ڈیمن کی طرح ہے۔" ٹیلر نے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے بدصورت۔" ڈپ نے پوچھا۔

"شٹ اپ!" ڈیمن نے پھر باورچی خانے کے دروازے میں سے کہا۔ "بچے کبھی بدصورت نہیں ہوتے۔"

"لیکن تم تو بدصورت ہو۔" ڈپ نے کہا۔ "کیا میں نے غلط کہا ہے۔"

"نہیں! میں نے بہت جرم کیے ہیں اس لیے میں بدصورت ہوں۔ بچے نے کوئی جرم نہیں کیا۔" ڈیمن نے جواب دیا۔

"تمہاری بیوی تم سے ڈرتی ہے؟" ٹیلر نے سوال کیا۔

"نہیں! میں بیوی سے ڈرتا ہوں۔" ڈیمن ٹرے اٹھائے نکلا۔ وہ دونوں ایک ساتھ قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔

"تم اچھی کافی بناتے ہو۔ بیوی سے سیکھا ہوگا۔" ٹیلر نے ندیدوں کی طرح منہ چلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں! میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا ہے۔" ڈیمن بولا۔ دونوں نے افسوس سے سر ہلایا۔

"تم نے بھی اسے کچھ سکھایا مثلاً تجوری کھولنا......" ڈپ نے پوچھا اور انگلیوں کو سر سے صاف کیا۔ وہ پھر ایک ساتھ ہنسے۔

"تم اس فن کو بھولے تو نہیں ہوگے۔ تم اس فن کے ماہر ہو۔" ٹیلر نے کہا۔

"میں سب کچھ بھول چکا ہوں۔" ڈیمن نے درشتی سے کہا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں نے بیس سال سے سائیکل نہیں چلائی لیکن میں سائیکل چلانا نہیں بھولا۔" ڈپ نے کہا۔

"سائیکل چلانے اور تجوری کھولنے میں بڑا فرق ہے۔" ڈیمن نے فلسفیانہ انداز میں بتایا۔

"بے شک!" دونوں نے تائید میں سر ہلایا اور ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا۔

"تم دونوں کا پیٹ بھر گیا؟ اب یہ بتاؤ جیل سے کب رہا ہوئے ہو؟ آج؟ ڈیمن نے کہا۔ دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہم دونوں ایک سال بعد چھوٹے ہیں۔" ٹیلر بولا۔

ڈیمن مسکرایا۔ "سنگ سنگ جیل سے یا کہیں اور سے؟"

"سنگ سنگ سے۔ دوسری جیلوں میں ہمارے

معیار کے لوگ نہیں ملتے۔" ڈپ نے کہا۔

"جرم کیا تھا؟" ڈیمن نے بچے کو اخبار سے پنکھا جھلنا شروع کیا۔ اسے مچھر پریشان کررہے تھے۔

"کچھ نہیں! ایک بنک کو لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ صرف کوشش!" ٹیلر نے کہا۔

"یہ نظام ہی غلط ہے۔ سزا جرم مکمل ہونے کے بعد ملنی چاہیے۔ جرم ہوا نہیں مگر سزا مل گئی۔" ڈپ نے مایوسی سے کہا۔ "ایسے ہی ایک بار ہم نے، تمہیں یاد ہوگا ڈیمن! کیلی فورنیا میں ہم نے ایک چوری کی تھی اور مالک جاگ اٹھا تھا اور تم نے شور مچانے پر اس کا گلا کاٹ دیا تھا۔"

"اور وہ مرا بھی نہیں تھا، زخم بھی ٹھیک ہو گئے تھے مگر تم پانچ سال تک اندر رہے تھے۔" ٹیلر بولا۔

"میں نہیں، ہم...... تم بھی میرے ساتھ تھے۔" ڈیمن نے کہا۔ "میں اس کے بعد جیل نہیں گیا۔"

"ہم بھی اب تیسری بار رہا ہوئے ہیں۔" ڈپ نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے اب قانون کیا ہے؟" ڈیمن بولا۔ "جو چوتھی بار سنگ سنگ گیا باہر نہیں نکلے گا۔"

"تم اسی لیے تائب ہو گئے ہو، ڈر کر؟" ڈپ نے بچے کے گال پر بیٹھے ہوئے مچھر کو مارا۔ ڈیمن نے ڈپ کو گالی دی۔

"میں نے شادی کرلی ہے۔ آدمی یا شادی کرسکتا ہے یا جرم۔ مچھر مارو، بچے کو مت مارو۔"

"کیا شادی جرم نہیں ہے؟" ٹیلر نے سوچتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اپنے باپ سے پوچھنا چاہیے یہ سوال۔ آخر تمہارے آنے کا اور ان پرانی باتوں کو یاد دلانے کا مقصد کیا ہے؟" ڈیمن بولا۔

"ڈپ! تم بتاؤ۔" ٹیلر نے کہا۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اوکے، ہمیں ایک تجوری کھلوانی ہے۔" ڈپ نے کہا۔

ڈیمن کھڑا ہو گیا۔ "گیٹ آؤٹ......!" مگر وہ دونوں بیٹھے رہے۔ "سنا نہیں تم نے۔" ڈیمن بولا۔

"پہلے ہماری پوری بات سن لو۔" ڈپ نے کہا۔ "آگے تمہاری مرضی۔"

"میں اس قسم کی بات بھی سننا پسند نہیں کرتا۔ میں جرائم کی زندگی کو خیرباد کہہ چکا ہوں۔ میرا ایک کیفے ہے، صرف کیفے۔ میری ایک بیوی ہے اور ایک بچہ۔" ڈیمن نے کہا۔ "میں باقی زندگی سنگ سنگ میں نہیں گزارنا چاہتا۔"

"معاملہ بیس ہزار ڈالر کا ہے۔ سنگ سنگ جانے کا ایک فیصد امکان بھی نہیں۔" ڈپ نے کہا۔

"میں بیس لاکھ ڈالر میں بھی یہ کام کرنے کو تیار نہیں۔ بات اصول کی ہے۔" ڈیمن نے کہا۔ "میں نے شریفانہ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔"

"ہم تمہیں چالیس فیصد دینے کے خیال سے آئے تھے، آٹھ ہزار ڈالر۔" ٹیلر نے کہا۔ "صرف ایک گھنٹے کا کام ہے۔"

"اور اتنا آسان جتنا اپنے گھر کی تجوری سے پیسے نکالنا۔" ڈپ نے تائید کی۔

"گھر کی تجوری کو آدمی چابی سے کھولتا ہے اور یہ چوری نہیں کہلاتی۔" ڈیمن نے کہا۔

"تمہارے لیے سب برابر ہے۔ تم بغیر چابی کے بھی اتنی ہی سہولت کے ساتھ کھول سکتے ہو۔"

"تم احمق ہو۔" ڈیمن نے کہا۔ "آج کل بڑے مضبوط سیف بن رہے ہیں۔ پہلے والی بات نہیں ہے۔ نئے نئے الارم ایجاد ہو گئے ہیں جو نظر نہیں آتے اور پولیس اسٹیشن پر سوتوں کو جگا دیتے ہیں۔ کرنٹ ہوتا ہے

چار سو چالیس وولٹ کا۔ ہاتھ لگاتے ہی آدمی لیٹ جاتا ہے، نمبروں کے الٹ پھیر والے تالے ہیں۔"

وہ دونوں ہنسے۔ "تمہاری معلومات خاصی وسیع ہے۔ گفتگو سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تم نے سب کچھ تجربے سے معلوم کیا ہے۔ مگر خیر ہمارا یہ مطلب نہیں کہ تم اب بھی یہ کام کررہے ہو اور ہم سے جھوٹ بول رہے ہو۔ ہمیں معلوم ہے تم شریفانہ زندگی بسر کررہے ہو مگر یہ تجوری ایسی نہیں ہے۔ اس قسم کی درجنوں تجوریاں تم نے چٹکی بجاتے کھولی ہیں۔ تمہارے پاس اوزار تو ہوں گے ابھی؟" ٹیلر نے پوچھا۔

"اوزار ہیں مگر میں یہ کام نہیں کروں گا۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔" ڈیمن نے کہا۔

"ڈیمن! یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔ وہاں نہ چوکیدار ہے نہ کوئی حفاظتی انتظام۔" ڈپ نے کہا۔

"بیس ہزار ڈالر ایسے ہی رکھے ہیں؟ تمہارا دماغ خراب ہے کیا؟"

"دماغ خراب نہیں ہے۔ صرف آج کی رات وہاں بیس ہزار ڈالر آئے ہیں۔ ہر روز وہ تجوری خالی پڑی رہتی ہے۔ پیسہ بینک میں رہتا ہے۔" ٹیلر نے بتایا۔ "ایک چھوٹی سی کمپنی ہے۔"

"یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" ڈیمن نے حیرت سے کہا۔ "تم تو آج ہی جیل سے رہا ہوئے ہو۔"

"میرا سالا وہاں کیشئر ہے۔ وہ جیل میں مجھ سے ملنے آتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ آج تنخواہ کی رقم لے آئے گا۔ وہ ہمیشہ سائیکل پر بینک جاتا ہے اور رقم لے آتا ہے۔ کئی سال سے یہی ہو رہا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ دوپہر کو اگر ہم چاہیں تو ریلوے کراسنگ پر اسے لوٹ سکتے ہیں۔ وہ ٹھیک اس وقت وہاں پہنچے گا۔ جب ٹرین کے آنے کا وقت ہوگا۔ گیٹ اس وقت بند ہوگا اور وہ ٹرین کے لیے وہاں کھڑا ہوگا۔ وہاں زیادہ لوگ بھی

نہیں ہوتے۔ اگر ہم ہوائی فائر کریں گے تو سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگیں گے۔ اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ہم اس کی ران میں یا بازو میں چاقو وا قو ماردیں اور سائیکل لے جائیں۔ پولیس اسٹیشن ایک میل دور ہے۔ اسے کچھ رقم انشورنس کمپنی سے ملنے کی بھی امید ہے زخمی ہونے کے بعد۔"

"پھر......؟"

"پھر یہ کہ گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔ اسے رکنے کا موقع نہیں ملا۔" ڈپ نے مایوسی سے کہا۔

ڈیمن ہنس دیا۔

"اب تمہیں کیا امید ہے کہ اس نے ساری رقم تمہارے لیے تجوری میں رکھ دی ہوگی کسی کو تنخواہ نہیں دی ہوگی؟"

"نہیں! وہ عقل مند آدمی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ اگر ہم لیٹ ہو گئے تو وہ کسی گاڑی سے ٹکرا جائے گا۔ کسی کار سے جس کی رفتار زیادہ نہ ہو۔" ڈپ نے کہا۔

"اچھا......؟" ڈیمن نے کہا۔ "بہادر آدمی ہے، مرنے سے نہیں ڈرتا۔"

"مرنے سے تو ڈرتا ہے مگر مرنے کا امکان نہیں۔ زیادہ سے زیادہ زخمی ہونے کا ڈر تھا۔ اسے عین وقت پر چھلانگ لگا کر الگ ہونا تھا۔ ایسے وقت میں ڈرائیور گھبرا جاتا۔" ڈپ نے کہا۔ "اور اگر سائیکل سوار کا جان بچانے کی کوشش کرنا غیر فطری نہیں لگتا۔"

"زخمی ہونے کی صورت میں پھر انشورنس کا پیسہ ملنے کی امید تھی۔ اوپر سے سائیکل کے ٹوٹ پھوٹ جانے اور اس کے معمولی زخمی ہونے کے بعد پولیس اسٹیشن جاکے رپورٹ لکھانے اور فرسٹ ایڈ یا مرہم پٹی کے لیے اسپتال جانے میں دیر ہونی لازمی تھی۔ چنانچہ تنخواہ کے تقسیم ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ چھٹی کے بعد پہنچا ہوگا ساری بات ڈائریکٹر کو معلوم ہوگی، انہوں

نے تصدیق کی ہوگی۔ گواہ بہت تھے سب نے سنا ہوگا کہ وہ بیس ہزار ڈالر لے کر جارہا تھا۔ اس نے عمداً بار بار اعلان کیا ہوگا۔"

"کیوں؟" ڈیمن نے دلچسپی سے پوچھا۔

"گواہوں میں کون سے چور یا ڈاکو ہوتے ہیں۔ تماش بین ہوتے ہیں عام راہ گیر لیکن رات کو ڈاکا پڑ جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ کسی نے بات سن لی۔ رات کو رقم لے کر گھر جانے کا سوال ہی نہیں۔ کس کے گھر میں تجوری ہوتی ہے۔ چنانچہ کمپنی کی تجوری میں رقم رکھ دی گئی ہوگی کہ کل صبح تقسیم ہوجائے' کیشئر رات اسپتال میں رہے گا' گھر پہنچ کر وہ بیوی سے کہے گا کہ اسے تکلیف ہورہی ہے۔ زخم بگڑنے کا ڈر ہے۔ چوٹ درد کر رہی ہے وغیرہ وغیرہ۔ بیوی اسے اسپتال لے جائے گی۔ وہ خود اور سارا عملہ گواہ ہوگا کہ وہ رات کو کہیں نہیں گیا۔"

"بہت خوب!" ڈیمن نے کہا۔ "پلان تو بہت اچھا ہے۔"

"تو پھر تم تیار ہو؟" ٹیلر نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مجھے معلوم تھا۔"

"کیا معلوم تھا؟" ڈیمن بگڑ کر بولا۔ "یہ میں نے کب کہا ہے کہ میں تیار ہوں۔"

"آخر تم اتنا ڈرنے کیوں لگے ہو؟" ڈپ نے پوچھا۔ "تمہارا باپ سو رہا ہے۔" اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے سونے دو صرف ایک گھنٹے کی بات ہے۔" ٹیلر بولا۔

"بکواس مت کرو۔ بچے کو گھر میں اکیلا چھوڑ جاؤں؟ اس کی ماں آ گئی تو......؟ کیا کہوں گا اس سے میں؟" ڈیمن نے کہا۔ "یہ کہوں گا کہ میں بڑا اچھا باپ ہوں' جو چھ ماہ کے بچے کو سوتا چھوڑ کر ڈاکا ڈالنے نکل گیا۔"

"تم بیوی سے بھی بہت ڈرتے ہو؟ بڑے رنج کی بات ہے۔" ڈپ نے کہا۔ ڈیمن کا پارہ چڑھ گیا۔

"یہ ڈر نہیں ہے سور کے بچے! تم شادی کر کے دیکھو پھر معلوم ہوگا۔"

"اگر یہ رقم مجھے مل جائے تو میں بھی شادی کرلوں گا۔" ڈپ نے کہا۔ "میری ماں کی بڑی خواہش ہے۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ تین سال پہلے میں نے جس لڑکی سے وعدہ کیا تھا وہ اب بھی میری منتظر ہے۔" ٹیلر نے کہا۔

"اچھا......!" ڈیمن ذرا نرم پڑا۔ "تم دونوں جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو۔ میں صرف تمہاری ماں کی خواہش پوری کرنے کے لیے اور اس لڑکی کے لیے جو تین سال سے تمہاری منتظر ہے تمہارا ساتھ دوں گا۔ میں چاہتا ہوں تم یہ دھندے چھوڑ دو اب' اگر یہ جھوٹ ہوا؟"

"تم سے پہلے کبھی جھوٹ بولا ہے ہم نے۔" ڈپ نے ٹیلر کو آنکھ ماری۔ شادی ڈیمن کی کمزوری بن گئی تھی۔

"بچے کا کیا ہوگا؟" ڈیمن سوچتے ہوئے بولا۔ "میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

"بچے کے پاس کوئی بیٹھنے والا نہیں مل جائے گا؟" ڈپ نے کہا۔

"اتنی رات کو؟" ڈیمن بولا۔ "سب لوگ سو چکے ہیں۔"

"اس کی ماں کہاں ہے؟" ٹیلر نے پوچھا۔ "اسے دے آئیں چل کر۔" ڈیمن نے پھر نفی میں سر ہلایا۔

"وہ مجھ سے پوچھے گی کہ تم کہاں جارہے ہو؟ اسے ہمیشہ ڈر رہتا ہے کہ میں پھر پرانی زندگی اختیار کرلوں گا۔ اسے مطمئن کرنا مشکل ہوجائے گا اور میرا خیال ہے وہاں بھی سب سو رہے ہوں گے۔"

"خاصا مسئلہ ہے۔" ڈپ نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "آدھی رات تو ہوگئی ہے۔" ڈیمن بچے کو دیکھتا رہا اور اخبار سے پنکھا جھلنے لگا۔ ٹیلر سگریٹ کے کش لیتا رہا اور چھت پر نظریں جمائے رکھیں' ڈپ اونگھنے لگا۔

"ڈیمن!" ڈپ اچانک آنکھیں کھول کر بولا۔ "ہم بچے کو ساتھ لے چلتے ہیں۔"

کیا؟" ڈیمن نے کہا' ٹیلر بھی سیدھا ہوگیا۔

"ہم بچے کو ساتھ لے جاتے ہیں' کیا ہرج ہے وہ سو رہا ہے' سوتا رہے گا۔" ڈپ نے جوش سے کہا۔

"رائٹ!" ڈیمن بولا۔ "میں اپنے اوزار لے آؤں۔" اندر سے وہ ایک باکس لے کر آیا جوان کا جانا پہچانا تھا۔ پھر اس نے بچے کو ننھی سی ٹوکری میں بستر لگا کر لٹایا۔ اس کے کپڑے بدلے کیونکہ اس نے پیشاب کردیا تھا۔ "اسے تم اٹھالو ذرا احتیاط سے۔" ڈیمن نے ڈپ سے کہا۔ "ڈپ نے اسے یوں اٹھایا جیسے جھٹکے سے اس کے بکھر جانے کا ڈر ہے۔

"یہ تم لے لو۔" اس نے ایک ہینڈ بیگ جیسی ٹوکری ٹیلر کو پکڑائی۔ "اس میں بچے کی ضروریات کا سامان ہے۔" خود اس نے اوزار اٹھالیے۔ باکس ایک لفافے کے اندر کتاب کی طرح لگتا تھا۔ وہ سڑک پر آ گئے۔

"بچہ بہت ہلکا ہے۔" ڈپ نے خوشی سے کہا۔ "کیا ہر وقت سوتا رہتا ہے؟"

"دن میں کھیلتا ہے رات کو صرف ایک بار جاگتا ہے' جب اسے بھوک لگتی ہے۔" ڈیمن بولا۔

"دانت نکلے ہیں اس کے؟" ٹیلر نے کہا۔ "کچھ بولنے لگا ہے۔"

ڈیمن ہنسا۔ "ابھی نہیں' ابھی اس نے صرف بیٹھنا سیکھا ہے۔"

"اچھا؟ بیٹھ جاتا ہے؟ کمال ہے۔" ڈپ بولا۔

"اس میں کیا کمال ہے۔ سب بچے پہلے بیٹھنا سیکھتے ہیں۔ پھر گھٹنوں کے بل چلنا پھر دونوں پیروں پر بندر کی طرح لڑکھڑا کے چلتے ہیں' پھر دوڑنے لگتے ہیں۔" ڈیمن نے کہا۔

"پھر بڑے ہوجاتے ہیں' اسکول نہیں جاتے' گلیوں میں آوارہ پھرتے ہی' پھر سگرٹیں پینا سیکھ لیتے ہیں پھر جیب کاٹنا' پھر چوریاں کرتے ہیں اور ڈاکے ڈالنے لگتے ہیں اور سنگ سنگ......" ڈپ نے کہا۔

"شٹ اپ! ایک لفظ اور کہا تو میں تمہارے دانت توڑ دوں گا۔" ڈیمن نے سخت سرد لہجے میں کہا۔

"میں اپنی بات کر رہا تھا۔ ٹیلر کی اور اپنی۔" ڈپ ڈر گیا۔ ڈیمن رک گیا تھا اور اسے گھور رہا تھا۔

"یہ نہ ٹیلر ہے نہ ڈیمن' نہ ڈپ! یہ اسکول جائے گا' ڈاکٹر بنے گا۔" وہ پھر چل پڑے۔

"ہمارے خنجر سے کٹے ہوئے گلوں اور گولیوں سے چھلنی جسموں کا اور ٹوٹے ہوئے جبڑوں کا علاج کرے گا۔" ٹیلر ہنسا۔

"ابھی تو یہ سیف توڑ کر ڈاکا ڈالنے جارہا ہے۔" ڈپ بولا۔ ڈیمن پھر رک گیا۔ "ہمارا ساتھی ہے۔"

"ہاں! یہ ہمارا ساتھی ہے' اس کا بھی حصہ ہوگا' دس فیصد!" ڈیمن نے کہا۔

"ڈیمن!" ان دونوں نے احتجاج کیا۔ "یہ زیادتی ہے' تم دونوں مل کر آدھا مال لینا چاہتے ہو۔"

"تمہاری مرضی! بچہ مجھے دے دو' میں تمہاری خاطر اپنا اصول توڑ رہا ہوں' عمر قید کا خطرہ مول لے رہا ہوں' اپنے بچے کو چھ ماہ کی عمر میں اپنے ساتھ کہاں لے جارہا ہوں' یہ بھی تو دیکھو۔" ڈیمن نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' اس ننھے منے ساتھی کے دس فیصد ہماری طرف سے تحفہ!" ٹیلر نے بچے کے گالوں کو اپنی انگلی سے چھوا۔ "دنیا کا سب سے کم عمر ڈاکو' سلیپنگ پارٹنر!"

❁.....☆.....❁

کمرے کے اندر بالکل اندھیرا تھا۔ سیف ایک کونے میں سیمنٹ کے چبوترے پر نصب تھا۔ خستہ حال فرنیچر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کمپنی کی مالی حالت اچھی نہیں اور جو کمپنی فرنیچر نہ بدل سکے وہ پرانی تجوری کی جگہ جدید قسم کے خودکار الارم والی مہنگی تجوری کہاں لگائے گی جب کہ اسے تجوری کی ضرورت بھی نہ پڑتی ہو۔ میزوں پر رکھے ہوئے ٹائپ رائٹر بھی پرانے تھے۔ دیواروں کا رنگ بھی پرانا تھا۔ صرف ایک کھڑکی سڑک کی طرف تھی مگر باہر کی طرف لوہے کی سلاخیں تھیں اور کھڑکی بند تھی۔ کبھی کبھی کسی کار کی ہیڈ لائٹس کھڑکی کے شیشوں پر پڑتی تھیں تو اندر پل بھر کے لیے اجالا پھیل جاتا تھا۔ ڈیمن نے تجوری کو غور سے دیکھا۔ خاصی پرانی زنگ خوردہ تجوری تھی۔ کہیں اردگرد کسی بجلی کے تار کا وجود نہ تھا۔ دیواروں کے اندر سے بھی کسی تار کے آنے کا امکان تھا اس لیے ڈیمن نے کرنٹ کو ٹیسٹ کیا۔ کرنٹ نہیں تھا' اس نے ایک انگلی سے تجوری کو چھوا۔ کوئی آواز نہیں۔

"الارم نہیں ہے۔" اس نے کہا اور اوزاروں کا بکس کھولا۔ بچہ ایک ٹائپ رائٹر کے قریب میز پر رکھی ہوئی ٹوکری میں سو رہا تھا۔ اس کا سامان بھی اسی میز پر رکھا تھا۔ ٹیلر نے مین سوئچ آف کر دیا تھا۔ "ڈپ! تجوری کے سامنے کوئی چیز کر دو۔ باہر سے روشنی پڑتی ہے۔" ڈیمن نے کہا۔ ڈپ نے ایک میز گھسیٹ کر دونوں طرف کرسی رکھ دی۔ ڈیمن اس کی اوٹ میں اوزار لے کر بیٹھ گیا۔ ڈپ اور ٹیلر کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ آدھا گھنٹہ گزر گیا۔

"اندر کون ہے؟" اچانک کسی نے کہا۔ وہ تینوں اچھل پڑے۔ اندر آنے والے نے بجلی جلانے کی کوشش کی۔ وہ تینوں دیوار سے چپکے کھڑے رہے۔ "میں گولی مار دوں گا۔" وہ بولا پھر وہ اندر آ گیا۔ "پھر لائٹ غائب!" آنے والا بڑبڑایا۔ وہ خالی ہاتھ تھا لیکن وردی سے چوکیدار ہی لگتا تھا۔ درمیانے جسم کا نوجوان آدمی پھر اس کی نظر میز پر پڑی۔ باہر سے منعکس ہونے والی روشنی میں اس نے بچے کو دیکھا۔ سرہانے رکھی ہوئی باسکٹ میں سے سامان نکال کر دیکھا' وہ سخت حیرت زدہ تھا۔

"تو یہ بات ہے۔" اس نے کہا۔ "اس گناہ کی پوٹ کو یہاں......" اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ڈیمن نے پیچھے سے اس کا گلا دبا دیا۔ وہ بے بس ہو گیا۔ اس کے گلے سے کوئی آواز نہ نکلی۔ ڈپ نے فوراً اس کی آنکھوں پر اپنا رومال باندھا اور ٹیلر نے اپنا رومال اس کے منہ میں ٹھونس دیا پھر وہ اسے گھسیٹ کر باتھ روم میں لے گئے۔ دروازہ باہر سے بند کرنے سے پہلے انہوں نے چوکیدار کو ٹائپ رائٹر کے ربن سے باندھ دیا۔

"تم نے جھوٹ بولا مجھ سے؟" ڈیمن نے خونخوار نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خدا کی قسم...... ڈیمن' اس گدھے کے بچے نے ہمیں کچھ نہیں بتایا تھا چوکیدار کے بارے میں۔" ڈپ پیچھے ہٹ کر بولا۔

"جب ہم آئے تو دروازہ کھلا تھا' وہ یہیں رہتا ہے۔" ڈیمن نے کہا۔

"ضرور رہتا ہوگا لیکن میں سمجھا کیشئر نے عمداً کھلا چھوڑا ہے اس نے صاف کہا تھا کہ چوکیدار نہیں ہے۔" ٹیلر بولا۔

"اس کا مطلب ہے بیٹے اب پولیس بھی آنے والی ہے۔" ڈیمن بولا۔ "وہ گھر سے فون کر دے گا۔ رقم اس کے پاس پہلے سے موجود ہوگی۔ پکڑے ہم جائیں گے' چلو!" اس نے بچے کو اٹھا لیا۔

"ٹھہرو! اگر اس نے ایسا کیا تو آدھے گھنٹے میں معلوم ہو جائے گا' صبح میں اسے قتل کر دوں گا۔ میرا اندازہ!" ڈپ بولا۔ "ہم باہر کسی جگہ سے آدھے گھنٹے تک دروازے کی نگرانی کریں گے۔ پولیس آئی تو بھاگ لیں گے۔"

آدھے گھنٹے تک وہ دروازے سے کافی دور بیٹھے رہے۔ دور کسی گھڑی نے دو بجائے۔ ان کی نگاہیں دروازے پر جمی رہیں پھر تین بج گئے۔ وہ چونک کر ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

ڈیمن نے اپنا کام پھر شروع کیا۔ انہیں بالکل پتا نہ چلا بچہ کب اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اچانک چیخ ماری تو وہ پھر اچھل پڑے۔ ڈیمن بچے کی طرف دوڑا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔

"اس کے دودھ کا وقت ہو گیا ہے۔" ڈیمن نے باسکٹ میں سے ایک برتن نکالا۔ "پانی لاؤ اس میں باتھ روم سے۔" ڈیمن نے حکم دیا۔ ٹیلر کچھ برتن اٹھائے کھڑا رہا۔

"وہ اندر تو......"

"تم نے اسے باندھ دیا تھا۔" ڈیمن بولا۔ ٹیلر برتن لے کر اندر گیا پھر ہنگامے کی آواز آئی۔ وہ اندر کی طرف لپکے۔ مگر اتنی دیر میں ٹیلر پانی لے کر نکل آیا۔

"اس نے سر سے ٹکر ماری تھی۔ میں نے بھی یہی برتن اس کے سر پر مارا۔"

"مرا تو نہیں۔" ڈیمن تشویش سے بولا۔ اس نے روتے ہوئے بچے کو تھپکا۔

"نہیں! بے ہوش ہوا ہے۔ میرا خیال ہے دو گھنٹے تک نہیں اٹھ سکتا۔" ٹیلر بولا۔

"پانی ابالو!" ڈیمن نے کہا۔ "جلدی کرو۔" بچہ مستقل رو رہا تھا۔

"کیسے؟" ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"کاغذ جلانے سے روشنی ہوگی۔"

"باتھ روم میں جاؤ۔" ڈیمن نے پانی میں بوتل اور نپل ڈال دی۔ وہ مجبوراً پھر اندر گئے۔ دروازہ بند کر کے کاغذ جلائے اور پانی ابالا۔ شعلوں کی روشنی میں انہوں نے الٹے پڑے ہوئے آدمی کو دیکھا۔ ڈپ نے کاغذ سے برتن کو تھام رکھا تھا اور ٹیلر لائٹر سے کاغذ جلا جلا کر نیچے رکھ رہا تھا۔ باتھ روم میں دھواں بھرتا جا رہا تھا۔ کمپنی کے کیش واؤچر دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ پانچ منٹ بعد پانی ابلنے لگا وہ دروازہ بند کر کے باہر آ گئے۔ بچے کے رونے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی لیکن اس کی آواز کے باہر جانے کا امکان کم تھا۔

"جلدی کرو بچہ بھوک سے بے حال ہے۔" ڈیمن نے ڈانٹ کر کہا۔ "باسکٹ میں ڈبہ ہے' دودھ اس بوتل میں بھرو اور نپل لگاؤ۔ خیال سے' نپل کے اوپر ہاتھ مت لگانا اور بوتل کے منہ پر بھی۔ بوتل کا خیال رکھنا' پھسل کر گر نہ جائے۔" ڈپ اور ٹیلر کی اس وقت یہی خواہش تھی کہ بوتل اٹھا کر بچے کے سر پر مار دیں۔ صرف بیس ہزار ڈالر نے انہیں چھ ماہ کے بچے کا نوکر بنا دیا تھا۔ وہ بچہ جو مال غنیمت میں بھی شریک تھا۔

"بوتل منہ میں لیتے ہی بچہ چپ ہو گیا اور دودھ پیتے پیتے سو گیا۔ ڈپ اور ٹیلر نے سکون کا سانس لیا۔ گھڑی نے چار بجائے۔ مشکل سے دو گھنٹے باقی تھے۔ ڈیمن اپنے کام میں لگ گیا۔ وہ دونوں بے قراری سے اٹھتے بیٹھتے چکر لگاتے رہے۔ ڈپ نے ایک بار باتھ روم میں جا کر دیکھا' وہ شخص سیدھا بیٹھا تھا۔ ڈپ نے ایک ڈنڈا اٹھایا اور وہ واپس غسل خانے میں پہنچا تو وہ منت کے طور پر سر ہلانے لگا مگر ڈپ نے اس کے سر پر پھر احتیاط سے ایک ضرب لگائی اور وہ لڑھک گیا۔

"تم الو کے پٹھے ہو' تمہیں خاک پتا نہیں تجوری کسے کہتے ہیں۔ یہ کھلنے والی تجوری نہیں ہے۔" ڈیمن نے کہا۔

"مگر یہ پرانے طرز کی تجوری ہے۔" ڈپ نے کہا۔

"پرانے زمانے میں بھی مضبوط تجوریاں بنتی تھیں اور تمہیں مجھ سے زیادہ دعویٰ ہے تو آؤ۔" ڈیمن نے مشتعل ہوکر کہا۔

"ڈپ کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ اب کیا کریں' تجوری کے بیس ہزار ڈالر تو بہر حال نکالنے ہیں۔ ساری رات کی محنت کے بعد خالی ہاتھ لوٹنا ویسے بھی ہمارے اصول کے خلاف ہے۔" ٹیلر نے کہا۔

"میں اس کو اڑا رہا ہوں۔" ڈیمن نے کہا۔

"اڑا رہے ہو۔ اس سے تو بڑا دھماکا ہوگا۔"

"ظاہر ہے' ڈپ تم بچے کو اٹھا کر باہر نکلو۔ سامان بھی اسی ٹوکری میں رکھ لو۔ بچے کے اوپر نہیں احمق! پیروں کی طرف جگہ بناؤ۔ ہاں ٹیلر! میرے ساتھ رہے گا۔ میں تالے میں بارود بھر کر فلیتہ لگاتا ہوں۔" ڈیمن نے باکس کھولا۔

"چھت تو نہیں گر پڑے گی؟" ٹیلر نے کہا۔

"پہلے کبھی گری ہے چھت! صرف تالا ٹوٹے گا۔ میں لائٹر سے فلیتے میں آگ لگاؤں گا۔ اس وقت تم باتھ روم کی طرف چلے جانا۔ سمجھے؟ پھر میں بچے کو لے کر چلا جاؤں گا اور اگر پولیس جو گشت پر ہوتی ہے کہیں اِدھر آتی ملی تو انہیں باتوں میں لگاؤں گا۔ تم رقم لے کر نکل جانا اور گھوم کر میرے گھر آجانا' ٹھیک؟" ان دونوں نے تائید میں سر ہلایا۔ ڈیمن نے بارود بھرا اور فلیتہ لگانے لگا۔ آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ ٹیلر اور ڈپ کی بے قراری بڑھتی گئی۔ گھڑی نے پانچ گھنٹے بجائے پھر ڈیمن اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈپ بچے کو لے کر باہر نکل گیا۔ ٹیلر باتھ روم کی طرف چلا گیا اور ڈیمن نے لائٹر سے فلیتے کو آگ دکھائی۔ دو منٹ بعد جب دھماکا ہوا تو وہ دروازے کی اوٹ میں تھا۔ اس نے تجوری کے دروازے کو جھولتے دیکھا اور باہر نکل گیا۔ خلاف توقع دھماکا بڑا ہو گیا تھا۔ کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے تھے۔ اس نے ٹیلر کو دوڑ کر نکلتے دیکھا اور جب باہر اس نے ڈیمن سے بچے کو لیا تو ڈپ بھی اندر بھاگ گیا۔ وہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ اسے گشت کرنے والے دو سپاہی ملے ان میں ایک موٹے جسم والا سارجنٹ تھا اور دوسرا نوجوان دبلا پتلا کارپورل۔

"ہیلو ڈیمن!" اس نے کہا۔ "اتنی صبح کہاں سے آرہے ہو۔ گڈ مارننگ!"

"گڈ مارننگ سارجنٹ!" ڈیمن رک گیا۔ "بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔" سارجنٹ نے اسٹریٹ لائٹ میں سوتے ہوئے بچے کو دیکھا۔

"ڈاکٹر کو جگانا پڑا ہوگا۔" ڈیمن اس جرح کا مطلب سمجھتا تھا۔

"میں ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔"

"تم نے کوئی دھماکا سنا؟" کارپورل نے مداخلت کی۔ وہ بے چین نظر آتا تھا۔

"دھماکا؟" ڈیمن نے کہا۔ "نہیں' تم نے سنا؟"

"بچے کو اسپتال لے جانا تھا۔" سارجنٹ نے بچے کے گالوں کو انگلی سے چھوا۔

"یہ راستے میں ہی سو گیا۔ شاید پیٹ میں درد تھا۔" ڈیمن نے کہا۔ "میں لوٹ آیا۔"

"دھماکا تو خاصا تیز تھا' سارجنٹ!" کارپورل نے کہا۔

"جب بچوں کے دانت نکلتے ہیں تو بچے پریشان کرتے ہیں' کیلشیم دو۔" سارجنٹ نے کارپورل کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "کتنی عمر ہے اس کی؟"

"چھ ماہ!" ڈیمن نے کہا۔

"میرا خیال ہے دھماکا اس طرف کہیں ہوا ہے۔" کارپورل نے کمپنی آفس کی طرف دیکھا جہاں سے ڈیمن نکلا تھا۔

"تندرست بچہ ہے۔ ڈیمن! مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے تمہیں دیکھ کر تم نے اپنی زندگی کو بالکل بدل لیا ہے۔" سارجنٹ بولا۔ "کون کہہ سکتا ہے کہ سنگ سنگ جیل میں تین مرتبہ رہ کر آنے والا چھ ماہ کے بچے کے پیٹ کے درد سے اتنا پریشان ہو سکتا ہے۔" وہ ہنسا۔ "تمہیں اپنی بیوی سے بھی بہت محبت ہے۔"

"جب آدمی باپ بن جاتا ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ بچوں کے لیے ماضی کو دفن کرنا پڑتا ہے۔" ڈیمن بولا۔

کارپورل کو سارجنٹ کے رویہ نے دل شکستہ کر دیا تھا کہ وہ دھماکے کو قطعی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

"میرا خیال ہے کسی کار نے بیک فائر کیا تھا۔" سارجنٹ بولا۔

"کاریں اکثر بیک فائر کرتی ہیں۔" ڈیمن نے کہا۔ "توجہ کون دیتا ہے۔"

"لیکن دھماکا بیک فائر کا نہیں تھا۔ میں دیکھ کر آتا ہوں۔" کارپورل نے کہا۔ سارجنٹ نے سر ہلایا۔

"نوجوان ہے' زیادہ جوشیلا ہے۔ اس کمپنی میں دھماکا ہو ہی نہیں سکتا۔" سارجنٹ نے کہا۔

"کیوں......؟"

"اس کا کیشئر آج کار کے حادثے میں مارا گیا۔" سارجنٹ نے کہا۔ "بے چارہ تنخواہوں کی رقم لے کر آرہا تھا۔" ڈیمن نے مضبوطی سے ٹوکری کو تھام لیا۔

"کتنی رقم تھی؟"

"بیس ہزار ڈالر! وہ اسپتال جا کر مرا۔ اس کی سائیکل کا چورا ہو گیا۔ رقم ڈائریکٹر کے گھر پہنچا دی گئی۔ یہاں کیا رکھا ہے جو کوئی دھماکا کرے اور کرے گا تو تجوری ہی توڑے گا نا' وہ یوں بھی خاصی پرانی ہو گئی تھی۔ ڈائریکٹر اس کو ویسے بھی بدلنا چاہتا تھا۔" سارجنٹ نے کہا۔

"تمہیں اتنی تفصیلات کیسے معلوم ہو گئیں۔" ڈیمن نے سر اٹھا کر کہا۔

"پولیس کو سب باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ کیشئر میرا داماد تھا۔" سارجنٹ نے کہا۔ "مگر وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا۔ سال بھر کے اندر اندر اس نے میری بیٹی کو طلاق دے دی اور مجھے تو یہ حادثہ بھی بیس ہزار ڈالر غبن کرنے کا کوئی چکر لگتا ہے۔ شاید وہ اتفاقیہ مارا گیا۔"

ڈیمن نے محسوس کیا کہ سارجنٹ سب کچھ جانتا ہے۔ جیسے اس نے ان کی ساری گفتگو سنی ہے۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے' اداکاری ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ چھ ماہ کے بچے کے دانت نہیں نکلتے' اسے سب معلوم ہے۔

"آل رائٹ ڈیمن!" وہ آگے بڑھ گیا۔ "بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ اور ہاں کیلشیم دیتے رہنا' باقی......" بچہ سکون سے سو رہا تھا' وہ آگے بڑھ گیا۔

"گڈ بائے سارجنٹ!" اس نے کہا پھر اس نے بچے کو دیکھا۔ "تھینک یو مائی سن!" اس نے بچے کو چوما۔ "تم نے ڈیڈی کو سنگ سنگ نہیں جانے دیا۔ تمہیں میری ضرورت تھی اور مجھے تمہاری۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے محافظ ہیں۔"

سورج نکلنے والا تھا اور اسے کیفے کھولنا تھا۔ وہ بیوی کی بہن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ سڑک پر ایک مین ہول کھلا پڑا تھا۔ کیسے غیر ذمہ دار لوگ ہیں' اس نے سوچا۔ ننھے منے بچے یہاں سے سڑک پار کرتے ہوں گے جو اسکول جانے کے لیے بستے گلے میں لٹکائے گھر سے نکلتے ہیں اور ٹریفک سے بچ کر نکلنے کے لیے منہ اٹھائے دوڑتے ہیں۔ چند قدم آگے جا کر وہ لوٹا' اوزاروں کا بکس نکالا اور اِدھر اُدھر دیکھ کر گٹر میں ڈال دیا۔

⌘

یعقوب بھٹی

محبت اک الوہی جذبہ ہے۔ اس کا تعلق ربّ کی ذات و صفات سے ہے یہی جذبہ تخلیق آدم کا سبب بنا۔ یہ محبت ہی تھی جس کی شدت نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہ السلام کو معافی دلائی۔ یہ محبت ہی ہے جس نے ابلیس لعین کو متکبر بنایا اور اسے سجدۂ آدم سے روکا۔ یہ رب کی اپنے بندوں سے محبت ہی ہے جس کے تحت خالق کون و مکان نے انبیا کو دنیا میں ہادی و رہنما بنا کر بھیجا کہ اس کے محب راہ سے نہ بھٹکیں اس کی راہ پر چلتے ہوئے بہشت کا سفر کریں۔

اس محبت کے کئی رنگ و روپ ہیں۔ الجبرا کا حساب بھی ہے اور فزکس کا کلیہ بھی جغرافیہ کا سوال بھی ہے اور معاشیات کے اصول بھی۔ نگاہ اور سوچ کے زاویے درست ہوں تو بندہ جاگتی آنکھوں سے اپنے خالق کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ اندازہ اور سوچ میں ذرا سی غلطی ہوجائے تو ولی کامل بھی جانے ان جانے میں شیطان کا پیرو بن جاتا ہے۔

وطن کی محبت سے سرشار ان لوگوں کا فسانہ' جن کے ہاتھوں میں آہنی ہتھیار تھے لیکن دل پیار کی لے پر جھوم رہے تھے۔

عشق و فرض کی راہ پر محوِ سفر دیوانوں کا احوال

وہ آٹھ افراد پر مشتمل گروپ تھا۔ وہ برف کے ہم رنگ سردی سے بچانے والے خصوصی لباس میں تھے۔ وہ ایک طویل رسی کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک تھے اور ایک قطار میں چل رہے تھے۔

سب سے آگے لانس نائیک مہر جان خان اور اس کے پیچھے سپاہی شیر دل تھا۔ یہی دونوں آئی بی (انٹیلی جنس بیورو) کے باقی چھ افسران کے رہبر بھی تھے۔ یہ چھ کے چھ جونیئر افسران تھے۔ ان میں دو لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اسپیشل سروسز گروپ اور آئی بی میں سینکڑوں خواتین' دفاع وطن کے لیے مردوں کے شانہ بشانہ مصروف عمل تھیں۔

چھ جونیئر افسران کا یہ گروپ برفیلے پہاڑوں میں ''ریکی'' کی خصوصی تربیت حاصل کرنے کی غرض سے آیا تھا۔

وہ شمالی علاقہ جات کے ضلع گانچھے کے ہیڈ کوارٹر خپلو کے بے حد حساس علاقے میں تھے۔ سطح سمندر سے تیرہ ہزار فٹ کی بلندی پر وہ دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ ''سیاچن'' سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔

کارگل کی جنگ بھی ضلع گانچھے میں ہی لڑی گئی تھی۔

دونوں رہبروں کے پیچھے لیفٹیننٹ شجاع تھا۔ اس نے شیر دل کو مخاطب کرتے ہوئے پٹھانوں کی مانند اردو کی ٹانگ مروڑتے ہوئے کہا۔ ''اوئے شیر دل کا تا! ابی تم امارے کو اور کتنا چلائے گا؟''

اس انداز تخاطب پر شیر دل کے دانت نکل پڑے۔ ''بس' صاحب چار گھنٹے اور۔''

''مر گئے......'' شجاع کے عقب میں لیفٹیننٹ کرن بڑبڑائی۔ پھر اونچی آواز میں بولی۔ ''شیر دل کیا ہم کچھ دیر کے لیے رک سکتے ہیں؟''

شیر دل نے اپنے سنیئر سے کھسر پھسر کی۔ باقی ماندہ افسران بھی کچھ دیر رکنا چاہتے تھے۔ وہ سب

بشمول خواتین اپنی پشت پر بیس بائیس کلو سامان باندھے۔ مسلسل پانچ گھنٹے سے چل رہے تھے۔ برف اور خطرناک راستوں کے سبب ان کا اندازہ تھا کہ انہوں نے ان پانچ گھنٹوں میں بمشکل پانچ کلومیٹر ہی راستہ طے کیا ہوگا۔

ساتھ ہی وہ لوگ شیر دل اور مرجان خان کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ جنہوں نے چالیس' چالیس کلو کے مٹی کے تیل کے کین اپنی پشتوں سے باندھ رکھے تھے اور آغاز سفر کی مانند تازہ دم لگ رہے تھے۔ مگر وہ لوگ شاید اس بات سے واقف نہیں تھے کہ وہ دونوں اسی قطعہ ارض کے فرزند تھے۔ ان کے لیے تو یہ سفر معمول کی بات تھی۔ ویسے بھی قدرت نے اس خطے کے لوگوں کے دل اور پھیپھڑے تھوڑے سے سائز میں بڑے بنائے ہیں۔ جس کے سبب لطیف ہوا میں بھی وہ باآسانی جسمانی مشقت کر لیتے ہیں۔

کھسر پھسر کا نتیجہ افسران کے لیے حوصلہ افزا نہیں نکلا تھا۔ مرجان نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ "نہیں صاحب ہمیں سورج غروب ہونے سے پہلے کیمپ پہنچنا ہے۔" نیم خواندہ سپاہی خواتین افسران کو مخاطب کرتے ہوئے مخمصے میں پڑ جاتے تھے کہ انہیں کس طرح مخاطب کریں۔

اس وقت بھی کرن کے لیے "صاحب" سن کر کئی ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

کرن کے پیچھے لیفٹیننٹ شامیر تھا۔ اس نے سب کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہمت کرو بھئی' صرف چار گھنٹے کا ہی تو سفر باقی ہے۔" پھر انہیں آنے والے زیادہ کڑے وقت کی پیشگی خبر دیتے ہوئے کہا۔ "تربیت کے دوران ہمیں اٹھارہ سے انیس ہزار فٹ کی بلندی تک جانا ہوگا۔ جہاں ہوا بھی زیادہ لطیف ہوگی۔ اس لیے ابھی سے خود کو تیار کر لو!" یہ مختصر سا قافلہ رواں دواں رہا۔

شامیر کے پیچھے لیفٹیننٹ نقش فاطمہ تھی۔ جس کی آنکھیں چوڑے شانوں والے شامیر کی پشت کو بڑے والہانہ انداز میں تکے جا رہی تھیں۔ کوئی دیکھنے والا نہیں تھا۔ اس لیے نگاہیں بے باک ہو رہی تھیں۔ عام حالات میں نقش بے حد محتاط رہتی تھی۔

نقش نے غیر محسوس طور پر ٹھنڈی آہ بھری' وہی تو تھا جس کی خاطر وہ یہاں موجود تھی۔ اسی کی خاطر تو اس نے سارا عیش و آرام تج دیا تھا۔

شامیر اس لمحے بھی اپنی پشت پر کسی کی نگاہوں کی چبھن محسوس کر رہا تھا۔ جس کے سبب اسے بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔

کاکول اور پھر منگلا اکیڈمی میں بھی اس نے بارہا یہ چبھن محسوس کی تھی اور ہر دفعہ اس نے نقش فاطمہ کو ہی اپنے قریب پایا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ جب بھی اس نے چونک کر نقش کی طرف دیکھا تھا۔ اسے کسی اور طرف ہی متوجہ پایا تھا۔ شامیر الجھ کر رہ جاتا تھا۔

نقش کے پیچھے لیفٹیننٹ حنظلہ اور اس کے پیچھے گروپ کا سب سے ہینڈسم لیفٹیننٹ کاشف تھا جو اس وقت بادلوں میں چھپی راکاپوشی کی چوٹی کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ چار کی بجائے پانچ گھنٹے میں ٹریننگ کیمپ پہنچے تھے۔ مسلسل دس گھنٹے پیدل چلنے کے سبب ان کا تھکن سے برا حال تھا اور سورج بھی ڈوب چلا تھا۔ مگر کیمپ کمانڈر کرنل سلیم جنجوعہ نے انہیں فوری آرام کرنے کی بجائے اپنے لیے خیمے نصب کرنے اور پھر "آفیسرز میس" میں آنے کا حکم دیا۔

وہ فوراً کام میں مشغول ہو گئے۔ درجہ حرارت منفی دس تھا اور بھوک سے بھی ان کی جان نکلی جا رہی تھی۔ مگر فوجی تربیت کا پہلا اصول "یس سر!" کہنا تھا۔

اوپر کے چھ اعلیٰ تربیت یافتہ کمانڈوز تھے۔ خیمے نصب کرنا ان کی تربیت کا حصہ رہا تھا مگر میدانی علاقوں میں خیمے نصب کرنے اور برف زاروں میں الگ نما خیمے نصب کرنے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

ایک انسٹرکٹر کی زبانی رہنمائی میں انہوں نے تین خیمے نصب کیے تھے۔ کرن اور نقش نے اپنا خیمہ سب سے پہلے کھڑا کر لیا تھا۔ دوسرے نمبر پر حنظلہ اور کاشف تھے۔ تیسرے نمبر پر شامیر اور شجاع آئے تھے۔

انسٹرکٹر کا اپنی ڈائری پر قلم رواں ہو گیا تھا۔ گویا کیمپ میں قدم رکھتے ہی ان کی تربیت شروع ہو گئی تھی۔ سورج کے ڈھلتے ہی انہوں نے برف کی چمک سے بچانے والے مخصوص چشمے اتار دیے تھے۔ باقی لباس جوں کا توں تھا۔ آفیسرز میس' ایک بڑے سے خیمے پر مشتمل تھا۔ بلکہ سارا کیمپ ہی خیموں پر مشتمل تھا۔ وہ باری باری خیمے میں داخل ہوئے۔ خیمے کے وسط میں مٹی کے تیل سے جلنے والا چولہا روشن تھا۔ جس کے سبب خیمے میں مٹی کے تیل کی بو چکرا رہی تھی۔ مگر خیمے میں خوشگوار حرارت بھی اسی کے سبب تھی۔ سو بری نہیں لگ رہی تھی۔ چولہے کے اطراف اونی نمدے بچھے تھے۔ کرنل سلیم پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اس نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

خوشگوار حرارت نے تھکن کا احساس دوچند کر دیا تھا۔ ان کے دل بیٹھنے کی بجائے لیٹنے کو چاہ رہے تھے مگر کیمپ کمانڈر کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ' کرنل سلیم کے گرد کمانڈوز کے مخصوص اسٹائل میں کمر سیدھی رکھے بیٹھ گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے باری باری اپنا تعارف کروایا۔ جب نقش کی باری آئی تو چند لمحوں کے لیے کرنل کی نگاہیں اس پر جمی رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں واضح طور پر تحسین نظر آئی تھی مگر اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

تعارف مکمل ہوا تو کرنل سلیم نے کہا۔ "پہلے والے آفیسرز بیچ کو رخصت ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں اور مجھے اکیلے کھانا کھاتے ہوئے بھی۔" سخت گیر کیمپ کمانڈر آفیسرز میس میں فرینڈلی روپ میں آ چکا تھا۔ "امید ہے تم لوگ اپنی ٹریننگ کو انجوائے کرو گے۔"

"بالکل سر! اگر بھوک سے ہماری جان نہ نکلی تو!" شجاع حسب عادت اپنی چلبلی فطرت سے باز نہیں آیا تھا۔ کرنل سلیم کے ہونٹوں پر پہلے مسکراہٹ اور پھر آنکھوں میں شرارت چمکی۔ "کیمپ کے اصولوں کے مطابق تو نئے آنے والوں کے لیے کھانے کا آغاز ناشتے سے ہوتا ہے......" اس نے ڈرامائی وقفہ دے کر ان کے چہروں کا جائزہ لیا۔ وہاں مردنی چھا گئی تھی۔ ویسے اڑتالیس' اڑتالیس گھنٹے کی "بھوک" کڑی تربیت کا حصہ تھی۔ "مگر...... میں اکیلا کھانا کھاتے بور ہو چکا ہوں۔"

ان کے چہروں پر زندگی لوٹ آئی۔ سب سے زیادہ خوش شجاع تھا۔ جس کے لیے بھوک برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ کرنل سلیم نے قدرے زور سے آواز دی۔ "اے ڈی......"

خیمے کی ایک بغلی دیوار میں پہلے "زپ" نیچے ہوئی۔ اور پھر دو فٹ کے قریب پیدا ہونے والے خلا سے ایک گول مٹول چہرہ اندر داخل ہوا۔ "جی صاحب!"

"کھانے کے لیے جو کچھ دستیاب ہے لے آؤ۔" کرنل سلیم نے کہا۔

پہلے چہرہ غائب ہوا اور پھر زپ بند ہو گئی۔ ان پر انکشاف ہوا کہ کچن آفیسر میس سے ملحق تھا۔

کچھ دیر بعد پھر زپ نیچے ہوئی اور اشتہا انگیز خوشبوؤں والے کئی ٹن پیک کھانے اندر آ گئے۔ خواتین کمانڈوز نے یہ ٹن وصول کر کے سرو کیے تھے۔ آخری ٹن پکڑاتے ہوئے اے ڈی نامی بیرے

نے کہا تھا۔ ”آپ نے گنجائش رکھ کر کھانا ہے‘ چکن قورمہ گرم ہو چکا ہے اور پراٹھے تیار ہو رہے ہیں۔“

گرم گرم پراٹھوں اور چکن قورمے کے تصور سے ہی شجاع کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

کرنل سلیم کی موجودگی کے سبب کھانا پورے فوجی ڈسپلن کے ساتھ کھایا گیا تھا۔ گرما گرم پراٹھوں کے ساتھ چکن قورمے کا مزہ دوبالا ہو گیا تھا۔

کھانے کے بعد اجازت لے کر کرنل سلیم نے سگار سلگالیا۔ اس نے ایک دو گہرے کش لیے تو تمباکو کی مہک نے مٹی کے تیل کی بو کے ساتھ مل کر ایک نئی خوشبو کو جنم دیا جو نا خوشگوار نہیں تھی۔

زیر تربیت کمانڈوز کے لیے لازم تھا کہ وہ کھانے کے فوراً بعد چائے یا کافی نہ لیں۔ ڈاکٹرز کی رائے میں یہ نقصان دہ تھا۔ اس لیے کچھ دیر بعد ان کے لیے مخصوص قہوہ آ گیا جو کولیسٹرول کو اعتدال پر رکھنے میں معاون ثابت ہوتا تھا۔

ایک چوتھائی سگار سے لطف اندوز ہونے کے بعد کرنل سلیم نے سگار بجھا دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سنیئر آفیسر کو کھڑا ہوتے دیکھ کر وہ سارے بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

کرنل سلیم نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اب وہ ایک سخت گیر کیمپ کمانڈر تھا۔ ”تم لوگوں کو آٹھ بجے اپنے بستروں میں ہونا چاہیے اور صبح سات بجے ناشتے کے لیے آفیسرز میس میں۔“

مخصوص جرابیں اور جوتے پہننے کے بعد اس نے باہر نکلتے ہوئے شجاع کی کھانے کی ”رفتار“ کے پیش نظر اس کے لیے ایک سزا سنائی۔ ”لیفٹیننٹ شجاع!“

”یس سر!“ اس نے مخصوص کمانڈو اسٹائل میں اتنی اونچی آواز میں کہا کہ اس کا آفیسر بخوبی سن سکے۔

”صبح ناشتے میں تم نے چائے کے ساتھ صرف دو بسکٹ لینے ہیں اور وہ بھی کم پروٹین والے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا۔

شجاع نے خود کو اونی نمدے پر گرا دیا۔ دیگر افسران نے بھی لیٹنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ بھاری بھر کم لباس نے لڑکیوں کی بھی بھرپور ستر پوشی کی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ بھی لیٹ گئی تھیں۔ آٹھ بجنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔ آدھا گھنٹہ نیم گرم آفیسرز میس میں گزارنا بے حد خوشگوار تھا۔

شجاع نے مصنوعی انداز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ حنظلہ نے اسے پچکارا۔

”نا رو بچے! کمانڈر کے حصے کے پراٹھوں پر ٹوٹ پڑنے کی یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ رونے کی بجائے تمہیں شکر کرنا چاہیے۔ کسی سنگین سزا سے بچ گئے ہو۔“

کرن نے بھی شجاع کو رگڑا۔ ”تمہیں کھاتا دیکھ کر مجھے شرم آ رہی تھی۔ لگتا ہے زندگی میں پہلی دفعہ پراٹھے کھائے ہیں۔“ اس نے جیسے جل بھن کر کہا تھا۔

شجاع پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آرام سے لیٹا تھکن اتار رہا تھا۔

نقش نے کن انکھیوں سے شامیر کی طرف دیکھا وہ آنکھیں موندے جیسے ان کے درمیان تھا ہی نہیں۔ اس خیال سے نقش کے نفس کی رفتار بڑھ گئی کہ وہ اس سے زیادہ دوری پر نہیں تھا۔ وہ چاہتی تو ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتی تھی۔ مگر...... وہ اس سے لاکھوں سال کی دوری پر تھا۔

نقش کو اپنے چہرے پر نگاہوں کی تپش کا احساس ہوا۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکن پڑ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کاشف کی نگاہیں ہیں جو اکثر و بیشتر والہانہ انداز میں اس کا طواف کرتی ہیں مگر ابھی تک اس نے زبان کو زحمت نہیں دی تھی۔ اس لیے نقش اس کی طبیعت صاف کرنے سے محروم ہی تھی۔

اچانک ہی شجاع اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا۔ کسی خیال سے اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ وہ بولا تو اس کی آواز میں بھی جوش کا عنصر نمایاں تھا۔ ”سزا تو صبح کے لیے ہے‘ اس وقت تو میں کچھ بھی کھانے کے لیے آزاد ہوں۔“ اس نے چٹکی بجائی۔ اور زور سے آواز دی۔ ”اے ڈی......“

کرن نے برا سا منہ بنایا تھا۔ جبکہ نقش‘ حنظلہ اور کاشف مسکرا دیئے تھے۔ شامیر کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

اے ڈی نے اونٹ کی مانند گردن خیمے میں لٹکائی۔ ”جی صاحب؟“

شجاع نے افسرانہ شان سے کہا۔ ”جلدی سے تین چار پراٹھے لے آؤ اور ساتھ میں چکن قورمہ نہ ہو تو نرگسی کوفتوں کا ٹن گرم کر لو۔“

”سوری صاحب!“ اے ڈی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”آفیسرز میس کا ٹائم ختم ہو چکا ہے۔ اب جوانوں کے لیے کھانا پک رہا ہے‘ دو گھنٹے انتظار کریں تو پھر میں کچھ کر سکوں گا۔ ویسے ہمارے پاس راشن محدود ہے۔“ دوسرے لفظوں میں اس نے اشتہا کے گھوڑے کو باندھ کر رکھنے کے لیے کہا تھا۔

شجاع کی کیفیت دیکھنے والی تھی۔ دوسروں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں تھیں۔ شامیر بھی آنکھیں بند کیے مسکرایا تھا۔ اس مسکراہٹ کو نقش نے بڑی حسرت سے دیکھا تھا۔

اے ڈی بدستور گردن ڈالے آئندہ حکم کا منتظر تھا۔ شجاع نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”اے ڈی! اس طرح گردن خیمے میں نہ ڈالا کرو! [illegible] تمہاری گردن مارنے کو جی چاہنے لگتا [illegible] دفعہ مسکراہٹیں بلند آہنگ قہقہوں میں [illegible] گئی تھیں۔

اے ڈی نے بھی فرمائشی انداز میں دانت نکال دیئے تھے۔

آٹھ بجنے میں ابھی پانچ منٹ رہتے تھے کہ وہ اپنے بکھرے ہوئے خیموں میں تھے۔

مخصوص لباس کے نیچے گرم اونی لبادے تھے۔ مخصوص لباس اتار کر شامیر اپنے خاص قسم کے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا۔ سردی ہڈیوں کے گودے میں اتری جا رہی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا کچھ دیر میں سلیپنگ بیگ اس کی جسمانی حرارت کے سبب اس قابل ہو جائے گا کہ وہ آرام سے سو سکے۔

اس کے روم میٹ شجاع نے پورٹیبل لائٹ بجھا دی تھی اور سلیپنگ بیگ میں گھس کر اس کی زپ بھی بند کر لی تھی۔ شامیر کچھ دیر بغلوں میں ہاتھ دیئے رہا۔ سلیپنگ بیگ کے قدرے گرم ہوتے ہی اس نے اپنا ”آئی فون“ نکال لیا۔ یہاں کسی بھی سیلولر کمپنی کی سروس دستیاب نہیں تھی۔ سو وہ بے کار تھا مگر اس میں حوری کی بلا مبالغہ ہزاروں تصویریں اور درجنوں ویڈیو کلپ محفوظ تھے۔ وہ پہلے تصویریں دیکھ کر حوری پر قربان ہوتا رہا پھر ٹٹول کر اس نے ہینڈ فری لگائی اور پھر اس کی تصویر و آواز کو دل میں اتارنے لگا۔ آئی فون کی بیٹری کی اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے پاس خاص قسم کا چارجر تھا جو ڈرائی سیلوں کی مدد سے بیٹری چارج کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

❀......❀......❀

نقش اور کرن اپنے اپنے سلیپنگ بیگوں میں گھس چکی تھیں۔ مگر لائٹ ابھی جل رہی تھی۔ نقش نے فجر کی نماز کے وقت کا الارم لگایا ہی تھا کہ کرن نے اچانک کہا۔

”یار‘ یہ شامیر کچھ عجیب سا نہیں ہے۔“ کرن اور کاشف نے پندرہ روز پہلے منگلا کینٹ میں ان کے

گروپ کو جوائن کیا تھا۔ نقش بے طرح سے چونکی تھی۔ مگر اس نے بے حد عام سے انداز میں کہا۔ ”میں نے تو ایسا کچھ نہیں محسوس کیا۔“ پھر اس نے کرن کو کریدا۔ ”تمہیں کیا عجیب لگا اس میں؟“

کرن نے اونی ٹوپی کانوں تک کھینچتے ہوئے کہا۔ ”اسے لڑکیوں میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں‘ کسی خوب صورت چہرے کی طرف میں نے اسے ارادی نظروں سے دیکھتا نہیں پایا...... میں تو عام سی ہوں مگر تم بلاشبہ بہت حسین ہو۔“

اپنی صنف کے باوجود یہ تعریف سن کر بھی نقش کے چہرے پر سرخی اُمڈ آئی تھی۔

کرن بدستور رواں تھی۔ میں نے کبھی اسے ’تم پر بھی ”خصوصی نظر“ ڈالتے نہیں دیکھا جبکہ گروپ کے دیگر لڑکے گاہے بگاہے تمہیں بڑی ستائشی نظر سے دیکھ ہی لیتے ہیں۔ خاص طور پر کاشف...... تم میں گہری دلچسپی لے رہا ہے۔“ نقش اسے کیسے بتاتی کہ حنظلہ اور شجاع کے علاوہ کاکول میں کئی زیر تربیت جونیئر افسران زبانی اظہار کے بعد سرخ چہرے کے ساتھ کان کھجاتے ہوئے اس کا راستہ اور خیال چھوڑ چکے تھے مگر جس کی ستائشی نظروں اور دلچسپی کی وہ آس لگائے تھی‘ وہ تو اس پر غیر ارادی نظر ڈالنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

نقش کے دل سے آہ نکلی مگر اس نے سینے میں ہی کہیں دم توڑ دیا تھا۔ بظاہر اس نے بے نیازی سے کہا۔ ”مجھے کسی کی ستائشی نظروں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کوئی مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے تو یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔ بات مجھ تک آئے گی تو مجھے دلچسپی لینے والوں کی طبیعت صاف کرنا خوب آتا ہے۔ مجھے صرف اپنے کیریئر میں دلچسپی ہے۔ ان باتوں کو میں فضولیات میں شمار کرتی ہوں۔“ آخری چند فقرے اس نے بڑے تیکھے انداز میں کہے تھے۔

”ایک جنرل کی بیٹی‘ جو اپنے بل بوتے پر کچھ بن کر دکھانا چاہے اسے واقعی اتنا غیر جذباتی اور مضبوط ہونا چاہیے۔ کرن کے لہجے میں اس کے لیے واضح ستائش تھی۔

”اب یہ مردوں کے رویوں اور نظروں کو ذہن سے جھٹکو...... اور سو جاؤ۔“ نقش نے ناصحانہ انداز اختیار کیا تھا۔ ”سات بجے ہم نے میس میں ہونا ہے اور میں نے تو صبح نماز بھی پڑھنی ہوتی ہے۔“

کرن بولی۔ ”سوچ رہی ہوں میں بھی کل سے نماز شروع کر دوں۔ دنیا میں سب سے زیادہ ایوالانچ (برفانی طوفان) اسی خطے میں آتے ہیں۔ جانے کب زندگی کی شام ہو جائے۔“ اس نے عجیب کھوئے ہوئے انداز میں کہا تھا۔ قدرے گرم ہو جانے والے سلیپنگ بیگ میں سے ہاتھ نکالنا ایک عذاب تھا مگر اس کے باوجود نقش نے ہاتھ باہر نکال کر اس کا اونی ٹوپی پوش سر تھپکا۔ ”زندگی‘ موت خدائے بزرگ و برتر کے ہاتھ میں ہے۔ ہم یہاں اسلام کے قلعے کی سربلندی کی خاطر صعوبتیں جھیل رہے ہیں۔ اس راہ میں آنے والی موت‘ موت نہیں شہادت ہے۔ جو ایک عظیم مرتبہ ہے۔“ نقش کا لہجہ بڑا گداز ہو گیا تھا۔ ”خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ...... جنہیں یہ سعادت نصیب ہوتی ہے۔“

کرن کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔ نقش نے گہرا سانس لے کر کہا۔ ”یہ بہت اچھی بات ہے کہ تم نماز کی طرف رجوع کر رہی ہو۔ میں تمہیں نماز کے وقت جگا دوں گی۔“

کرن آنسوؤں کے درمیان مسکرادی۔ اس کا ایمان اور جذبہ حب الوطنی پھر سے تازہ ہو گیا تھا۔

نقش نے لائٹ بجھا دی۔

کرن کچھ دیر خاموش رہ کر سونے کی کوشش کرتی

رہی مگر پھر اس کی خیالی رو شامیر کی طرف پلٹ گئی۔ اس نے دھیرے سے نقش کو پکارا ”یار جاگ رہی ہو؟“

”ہوں......“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ایک آخری بات کہنے کی اگر اجازت ہو تو......“ اس نے ڈرتے ڈرتے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

نقش نے سلیپنگ بیگ میں منہ دیے کہا۔ ”بولو‘ تمہارے دل میں کوئی غبار یا بوجھ رہ نہ جائے۔ ایوالانچ وغیرہ کا تو خدشہ تم پہلے ہی ظاہر کر چکی ہو۔“

کرن ڈرے ڈرے انداز میں ہنسی اور بولی۔ ”تم نے کبھی شامیر کی آنکھیں غور سے دیکھی ہیں؟“

”کرن کی بچی......“ نقش نے قدرے غصے سے کہا۔ مگر اس کی دھڑکنیں زیر و زبر ہو گئی تھیں۔

”پلیز...... پلیز“ کرن نے ملتجیانہ انداز میں کہا اور پھر چند لمحوں بعد اس کی خاموشی سے شہہ پا کر بولی۔ ”یہی ہلکی بھوری اور گھنیری پلکوں والی آنکھیں ہی ہیں جنہوں نے پورے سراپا کو انجانی سی کشش عطا کی ہے۔“ اس کا لہجہ خمار میں بھیگ گیا تھا۔

عورت کے دل نے کروٹ لی تھی۔ نقش کو اس کا یہ لہجہ دھیمی سی آگ کے سپرد کر گیا تھا۔

کرن اسی انداز میں کہہ رہی تھی۔ ”یہی مقناطیسی کشش ہے جو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ورنہ اس کی سانولی رنگت اور عام سے نقوش میں کچھ بھی نہیں ہے۔ کاشف اس سے ہزار گنا زیادہ ہینڈسم اور جاذب ہے۔ مگر مجھے اس میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔“ ...والی میں وہ شامیر میں اپنی دلچسپی کا اظہار کر گئی تھی۔

”تمہاری کیمسٹری میں ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔“ نقش کا لہجہ نہ چاہنے کے باوجود سرد اور بیگانہ ہو گیا تھا۔ ”تم‘ کشش ثقل اور مقناطیسی کشش پر غور کر رہی ہو۔ ضرور تم بھی کوئی نئی تھیوری دریافت کر لو گی۔ اب مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔“

کرن کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئی اور اس کے بعد اسے واقعی بولنے کی جرات نہیں ہوئی تھی یا پھر وہ سو گئی تھی مگر نقش کی نیند اس نے اڑا دی تھی۔

نقش کو وہ لمحے یاد آ رہے تھے جب اس کا ان سحر انگیز آنکھوں سے تعارف ہوا تھا۔ وہ بھی تو انہی آنکھوں سے گھائل ہوئی تھی۔ اور کچھ حوری کی اپنے چاچو سے بے پایاں محبت نے بھی اسے متاثر کر کے اس فیملی کا حصہ بننے کی خواہش لاشعور میں پیدا کی تھی۔

وہ اپنے بابا میجر جنرل عاطف لودھی کو ریسیو کرنے کے لیے ایئرپورٹ پر موجود تھی۔ جب اس نے پہلی دفعہ شامیر کو دیکھا تھا۔ وہ بھی غالباً اسی فلائٹ سے آیا تھا۔

سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس اونچے قد اور توانا جسم کا شامیر ایک عام سا نوجوان تھا مگر اس کی آنکھوں کا جادو اس لمحے بھی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس نے دونوں بازوؤں پر ایک چار سالہ بے حد پیاری اور گول مٹول سی بچی کو اٹھا رکھا تھا‘ ایک ملازم اس کا بیگ سنبھالے عقب میں تھا۔

نقش کو بچے بہت اچھے لگتے تھے اور وہ بچی تو بہت پیاری اور ”گپلی گپلی“ سی تھی۔ اس کا دل بے اختیار اس بچی کو پیار کرنے کے لیے مچلا تھا۔ اور اسی سبب وہ ان کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اور اس کا واسطہ ”آنکھوں کے جادو“ سے پڑا تھا۔

وہ چچا‘ بھتیجی ہر طرف سے بے خبر ایک دوسرے میں مگن تھے۔ شامیر نے سر جھکا کر اس کی سینگ نما بالوں کی ننھی ننھی چوٹیوں کو چوما تھا۔ اس دوران وہ بالکل نقش کے قریب سے گزرے تھے اور شامیر نے اس سے پہلو بھی بچایا تھا مگر اس پر ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی۔

نقش کے پندار حسن کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔

اسے تو راہ چلتے اچھے اچھے پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور اس عام سے لڑکے نے اس پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کیا تھا' وہ اپنی جگہ بن سی کھڑی رہ گئی تھی۔ جب وہ اس کے قریب سے گزرا تھا تو حوری اپنی توتلی آواز میں اسے کہہ رہی تھی۔

''چاچو! جب آپ چلے جاتے ہیں تو پھر مجھے نونی آتی ہے۔''

اور اس نے بے اختیار جھک کر اسے پیار کیا تھا۔

نقش کو جہاں توہین کے احساس نے شل کر دیا تھا وہیں حوری کے بے پایاں پیار نے بھی اسے متاثر کیا تھا۔ حوری نے کتنی سادگی اور معصومیت سے اپنے بے اختیار جذبات کا اظہار کیا تھا۔

اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ آپ چلے جاتے ہیں تو میں نونی کرتی ہوں۔ یعنی روتی ہوں۔ اس نے بے اختیار جذبے کا اظہار کیا تھا کہ جب آپ چلے جاتے ہیں تو مجھے نونی ''آتی'' ہے۔

نقش کو اس وقت ہوش آیا تھا جب جنرل صاحب نے اس کے کان کے قریب آہستہ سے ''ہاؤ......'' کی تھی۔ نقش ان کے کندھے سے لگ گئی تھی۔

جنرل صاحب نے اسے بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے کہا۔ ''ہماری سوہنی بیٹی کس خیال میں ڈوبی تھی کہ بابا کو بھی فراموش کر بیٹھی تھی۔''

نقش کو شرمندگی کا احساس ہوا اس نے باپ کے کندھے سے ناک رگڑتے ہوئے کہا۔ ''سوری بابا! دراصل ایک چچا' بھتیجی کی محبت نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔'' وہ باپ بیٹی سے زیادہ اچھے دوست تھے۔

کینٹ کی طرف جاتے ہوئے نقش نے انہیں محبت کے اس مختصر سے احوال سے آگاہ کیا۔ جو بظاہر تو ایک عام سا منظر تھا مگر اس کے خاص پن کو نقش نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا البتہ وہ خود نظر انداز کیے جانے والی بات چھپا گئی تھی۔ لاکھ بے تکلفی سہی مگر باپ سے وہ یہ بات تو شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ اس مقصد کے لیے وہ جلد از جلد ماہم سے ملنا چاہتی تھی۔

دوسری طرف جنرل صاحب دل ہی دل میں افسردہ ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نقش کو بچے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ چھوٹا کوئی بہن بھائی تھا نہیں جس پر وہ محبتیں نچھاور کرتی۔ ایک ہی بڑا بھائی تھا جو انگلینڈ میں ابھی پڑھ رہا تھا۔

جنرل صاحب کی خواہش تھی کہ جلد از جلد وہ بیٹے کی شادی کر کے دادا بن جائیں اور نقش کو بھی کھیلنے کے لیے بھتیجا یا بھتیجی مل جائے۔ دوسروں کے بچوں سے کوئی کب تک کھیل سکتا ہے۔ مگر ابھی عاکف لودھی کی تعلیم مکمل ہونے میں ایک سال کا عرصہ تھا۔ بقول شاعر دلی دور است' وہ دل مسوس کر رہ گئے۔

اگلے روز جب نقش نے ماہم کو اس واقعے سے آگاہ کیا تھا تو وہ بے تحاشا ہنسی تھی۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا تھا۔ پھر اس نے کہا تھا۔

''اوہ...... اب آیا اونٹ پہاڑ کے نیچے...... نقش فاطمہ لودھی...... جس نے درجنوں آرمی افسران کے دل اپنی اونچی ہیل کے نیچے مسل دیے اور جسے اپنا بنانے کی حسرت لیے وہ دوسری لڑکیوں کو پیارے ہو گئے' اور جس نقش کو دیکھ کر کینٹ کے شادی شدہ آفیسر ٹھنڈی اور غیر شادی شدہ گرم آہیں بھرتے ہیں اور جس کی صرف ایک نگاہ التفات کے لیے کئی سر پھرے جان بھی دے سکتے ہیں۔ اس پر ایک عام سی شکل وصورت کے نوجوان نے نگاہ تک نہیں ڈالی...... اوہ' مجھے یقین نہیں آ رہا۔''

''میں نے یہ سب تجھے اس لیے نہیں بتایا کہ تو میرا مذاق اڑائے......'' نقش بے حد سنجیدہ تھی۔ اس کی سنجیدگی کو محسوس کر کے ماہم بھی سنجیدہ ہو گئی۔ وہ بولی۔ ''ممکن ہے...... اس نے تجھے دیکھا ہی نہ ہو۔ تو نے خود ہی تو بتایا ہے وہ اپنی پیاری سی بھتیجی میں کھویا ہوا تھا۔'' اس نے اپنا خیال پیش کیا تھا۔

نقش نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کم از کم دس گز وہ میری جانب آیا تھا' اور درمیان میں کوئی ''دیوار'' بھی نہیں تھی کہ میں اسے نظر نہ آتی' اس کی نظریں سامنے ہی تھیں۔'' اس نے پورا منظر بیان کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسا نہیں کہ اس نے مجھے دیکھا نہیں تھا' مگر یہ دیکھنا ایسے تھا جیسے آپ راہ میں حائل کسی ستون وغیرہ کو دیکھتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے وہ روہانسی سی ہو گئی تھی۔

اس کی مثال پر ماہم کے لیے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا تھا وہ ہنسی روکنے کی کوشش میں اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے دبائے تھی مگر ہنسی کہیں نہ کہیں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

نقش نے آنسو بہاتے ہوئے تکیوں سے اس کی اچھی خاصی دھنائی کر دی اور پھر تھک ہار کر اس کی گود میں منہ چھپا کر بے آواز آنسو بہانے لگی۔

ماہم کی انگلیاں اس کے گھنیرے بالوں میں سرسرانے لگیں۔

نقش نے منہ چھپائے' آنسوؤں سے بھیگی آواز میں اعتراف کیا۔ ''مونی! اس عام سی شکل وصورت والے لڑکے نے تیری نقش کا چین چھین لیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ اور بھائی نہیں دیتا۔ اس کی سحر انگیز آنکھیں مجھے اپنی طرف کھینچتی ہیں۔'' وہ بے خودی میں بولے جا رہی تھی۔ ''اور اس کی بھتیجی کی توتلی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے تو کوئی ان جانی طاقت مجھے پوری قوت سے اس کی طرف دھکیلنے لگتی ہے۔ نہ جانے وہ کون ہے اور اس وقت کہاں ہے؟'' اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ ماہم کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک کر اس کے گھنیرے بالوں میں کہیں گم ہو گئے۔ سر جھکا کر اس نے نقش کے بال چومے اور پرسوچ انداز میں بولی۔

''کچھ کرتے ہیں میری جان! ڈھونڈنے سے تو کہتے ہیں خدا بھی مل جاتا ہے۔''

ماہم کی بڑی بہن آئی ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد جیسے نقش سب کچھ بھول کر ان کے دونوں بچوں سے کھیلنے میں مگن تھی۔ بہن کو چائے تھماتے ہوئے ماہم نے ایک نظر اس پر ڈال کر دل ہی دل میں اسے ڈھیروں خوشیوؤں اور من چاہی مرادوں کی دعا دی تھی۔

❀......❀......❀

ٹریننگ کیمپ فجر کی نماز کے وقت ہی جاگ جاتا ہے۔ تمام تر سرگرمیاں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک رہتی تھیں۔ سورج صرف نام کو ہی طلوع ہوتا تھا۔ زیادہ تر وقت اسے بادل ہی گھیرے رہتے تھے۔

کیمپ میں باجماعت نماز کا اہتمام تھا۔ کیمپ کمانڈر بذات خود پانچوں وقت امامت کرواتا تھا۔ کیمپ میں تین انسٹرکٹر' آٹھ سپاہی اور تین افراد پر مشتمل کچن کا عملہ تھا۔ یہ بھی فجر کی نماز میں شریک ہوئے تھے۔ جماعت کھڑی ہونے سے کچھ دیر پہلے شامیر بھی پہنچ گیا تھا۔

ناشتے کے بعد کرنل سلیم نے نماز میں شرکت نہ کرنے والوں کی کلاس لی تھی۔ اس موقع پر کرن نے اپنی اور نقش کی صفائی دیتے ہوئے کہا۔

''سر! ہم دونوں نے تو اپنے خیمے میں نماز پڑھ لی تھی۔''

''اچھی بات ہے۔ ویسے بھی خواتین کو باجماعت نماز سے استثناء حاصل ہے۔'' وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور دوبارہ بے نمازیوں سے مخاطب ہوا۔ جن کے سر جھکے ہوئے تھے۔

”ویسے اگر کوئی نماز نہ پڑھنا چاہے تو میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ ہر کسی کا اپنے خدا سے معاملہ ہے۔“

جھکے سر مزید جھک گئے تھے

کرنل سلیم نے جوتے پہنے اور باہر جانے سے پہلے کہا۔ ”پانچ منٹ میں تم لوگوں کو کلاس روم میں ہونا چاہیے۔ میں انتظار میں ہوں گا۔“

کرنل سلیم کے جاتے ہی سبھی ایزی ہو گئے تھے۔ جھکے سر دوبارہ سے تن گئے تھے۔ تین بسکٹ اور چائے کے ایک کپ کے سبب شجاع کے چہرے پر بڑی مسکینی برس رہی تھی۔

کرن، شامیر سے مخاطب ہوئی۔ ”تم نماز کے لیے اٹھ گئے تھے تو کم از کم شجاع کو ہی جگا دیتے۔ کسی ایک کی تو ”بے عزتی“ خراب ہونے سے بچ جاتی۔“

نقش یہ محسوس کر کے تلملا کر رہ گئی تھی کہ شامیر سے مخاطب ہوتے ہوئے کرن کے لہجے میں خاص قسم کی اپنائیت در آئی تھی۔ جسے صرف اسی نے محسوس کیا تھا۔

شامیر زیرلب مسکرا دیا، مگر اس نے نظریں نہیں اٹھائی تھیں۔ ”صاحب! موجود ہیں، میری صفائی دیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تھا۔

کرن، شجاع کی طرف پلٹی، اس کی استفہامیہ نگاہوں کے جواب میں شجاع نے اپنا ٹوپی پوش سر کھجاتے ہوئے قدرے ڈھیٹ پن سے کہا۔

”شاید مجھے جگانے کی کوشش تو کی تھی شامیر نے۔“

”کوشش نہیں، میں نے باقاعدہ تمہیں جھنجوڑا تھا۔“ شامیر نے بوٹ کے تسمے بند کرتے ہوئے اپنی صفائی خود دینے پر مجبور ہو گیا۔

حقیقت یہ تھی کہ نقش اور شامیر کے علاوہ کوئی بھی باقاعدگی سے نماز کا اہتمام نہیں کرتا تھا۔

کرن نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کم از کم میں تو آج سے پانچوں وقت نماز پڑھوں گی۔ میری ”خیمہ میٹ“ ماشاءاللہ پکی نمازی ہے۔“

یہ دیکھ کر نقش کے دل کا موسم بے حد خوشگوار ہو گیا کہ پہلی دفعہ شامیر نے باقاعدہ اس پر نگاہ اٹھائی تھی۔ ان سحر انگیز آنکھوں میں تحسین کی معمولی سی جھلک بھی تھی۔

پانچ منٹ بعد وہ لوگ کلاس روم میں تھے۔ باجماعت نماز کا اہتمام بھی اسی خیمے میں ہوتا تھا۔ جو اب کلاس روم کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

یہاں ان کا لیکچر کرنل سلیم ہی تھا جس نے انہیں ایک نقشے کی مدد سے اردگرد کے محل وقوع کے بارے میں طویل لیکچر دیا۔ چیدہ چیدہ پوائنٹ انہوں نے نوٹ بھی کر لیے تھے۔

لیکچر کے بعد کرنل سلیم نے پنوں کی مدد سے چسپاں نقشہ بلیک بورڈ سے اتار دیا اور نیچے موجود کاغذ کی شیٹ پر پنسل سے ایک دائرہ بنا کر اس سے ایک ٹیڑھی میڑھی لکیر کھینچی۔ ”تم لوگ چلوں سے اس گاؤں سارگن تک بذریعہ جیپ آئے تھے۔ اس کے بعد تم لوگ یہاں تک پیدل چل کر آئے ہو۔“ اس نے تمہید باندھنے کے بعد کہا ”تم لوگ باری باری یہاں آ کر اپنے سفر کا راستہ نقشے کی صورت میں بناؤ! سمتوں کا واضح کرنا بے حد ضروری ہے...... کون آئے گا پہلے؟“ انہوں نے باری باری سب پر نظر ڈالی تھی۔

ان سبھی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان سے ایسے نقشے کی فرمائش کی جائے گی مگر انٹیلی جنس جونیئر افسران کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ لگانا بھی بہت ضروری تھا۔

کرنل سلیم کی نظریں حنظلہ پر رک گئیں۔ ”آ جاؤ جوان لڑکے!“ اس نے ہاتھ میں پکڑی اسٹک سے حنظلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

حنظلہ ہچکچاتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

اس کے تذبذب کو محسوس کر کے کرنل سلیم نے شگفتہ انداز میں کہا۔ ”آ جاؤ یار! یہ وہ اسٹک نہیں ہے جس سے تم لوگ اسکولوں میں پٹتے رہے ہو اور نہ ہی میں اسکول ٹیچر ہوں۔“

سبھی کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں دوڑ گئی تھیں اور قدرے اطمینان اور اعتماد کا احساس بھی ہوا تھا اور کرنل سلیم یہی چاہتا تھا۔

حنظلہ پر اعتماد انداز میں بلیک بورڈ کی طرف بڑھا اور کرنل سلیم کی ہدایت پر بلیک بورڈ کا رخ تھوڑا سا پھیر کر مصروف ہو گیا۔ اسے سات منٹ ملے تھے۔

کرنل سلیم باقی پانچ سے مخاطب ہوا۔ ”آپ لوگوں کے پاس وقت ہے، اپنے ذہنوں میں نقشے ترتیب دے لیں۔“ ان کے ذہن پہلے ہی اس کام میں لگے ہوئے تھے۔

سات منٹ بعد حنظلہ نے ہدایت کے مطابق شیٹ لپیٹ دی اور اس پر اپنا نام لکھ کر کرنل سلیم کے حوالے کر دی۔ اب نئی شیٹ کے ساتھ نقش کی باری تھی۔

اس سیشن سے فارغ ہونے کے بعد کرنل سلیم، انہیں کیمپ سے کچھ فاصلے پر لے آیا۔ اس دوران ہوا میں خاصی تیزی آ گئی تھی۔ جس کے سبب درجہ حرارت مزید گر گیا تھا۔ وہ حقیقتاً ایک سرد جہنم میں تھے۔ سردی کے سبب سانس تک سینوں میں جمتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ لوگ سفید رنگ کے جس خاص لباس میں تھے۔ وہ بہت قیمتی اور مکمل طور سے بہت سرد علاقوں میں لڑنے والی افواج کے لیے ڈیزائن کیا گیا تھا۔ ایسے ہی ان کے جوتے، موزے اور دستانے بھی خاص طور پر سرد ترین موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ اس لیے وہ لوگ آسانی کے ساتھ اس موسم کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔

شروع میں جب سیاچن پر بھارتی دراندازی کا پتا چلا تھا تو پاکستان آرمی کے پاس اتنی بلندی پر لڑنے کی صلاحیت نہیں تھی۔ محض حرارت ایمانی اور بلند حوصلوں کے سبب آرمی کے آفیسرز و جوان، مکمل ساز و سامان اور تیاری کے ساتھ آنے والے بھارتی ٹروپس کے سامنے جم گئے تھے۔ ان دنوں بلندی کی مخصوص بمباری، ”فراسٹ بائٹ“ عام سی بات تھی۔ یہ بمباری جو دراصل شدید ترین سردی ہی کی دوسری شکل تھی سب سے پہلے انسانی ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ شدید سردی کے سبب انگلیاں بے جان ہو جاتی تھیں، اور پھر گوشت ہڈیوں پر سے جھڑ جاتا تھا۔ سیاچن پر لڑنے والے اکثر پرانے سپاہی اسی بمباری کے سبب میڈیکل ان فٹ قرار دے دیے گئے تھے۔ اب تو سہولیات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا۔

کیمپ سے کچھ فاصلے پر ایک اونچا برفانی ٹیلا تھا جس پر وہ لوگ موجود تھے۔ اس اونچائی سے کیمپ اور گرد و پیش خاصے نمایاں تھے۔ مگر گہرے بادلوں اور ہوا میں اڑتے برف کے ریزوں کے سبب حد نگاہ خاصی کم تھی۔

اس بلندی سے کیمپ کو دیکھنے پر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایوالانچ سے بچنے کے لیے آئیڈیل جگہ پر تھا۔ ایک ڈھلوان سامنے تھی۔ جو برف سے ڈھکی تھی۔ یہاں سے لڑھکنے والی برف آسانی کے ساتھ کیمپ کو تہس نہس کر سکتی تھی۔ مگر اس ڈھلوان اور کیمپ کے درمیان ایک بے حد تنگ وادی تھی۔ جس کی چوڑائی بمشکل ہی چھ سات میٹر تھی۔ ایسی تنگ وادیاں صرف بلتستان اور گانچے ہی میں پائی جاتی تھیں۔

اسی تنگ وادی کی وجہ سے سامنے کی سمت سے

کیمپ محفوظ تھا۔ عقب میں گہرائی تھی اور دائیں، بائیں برفیلی ڈھلانیں کافی فاصلے پر تھیں۔ کوئی شدید قسم کا ایوالانچ ہی کیمپ کو تباہ کرسکتا تھا۔

کرنل سلیم نے اسٹک سے ایک چھوٹے سے گلیشیئر کی طرف اشارہ کیا۔ اسے ہم نے "چیلوٹو" کا نام دیا ہوا ہے۔ آج کی ایکسرسائز کے طور پر تم لوگ دو گروپوں میں، اور دو مختلف سمتوں سے چیلوٹو کے گرد چکر لگا کر آؤ۔ دونوں گروپس کی رہنمائی کے لیے ایک ایک تجربہ کار سپاہی ساتھ ہوگا۔" پھر اس نے خود ہی دو گروپ بنائے۔

"کاشف، حنظلہ اور کرن! تم لوگوں کے گروپ کا نام الفاون ہے۔ دوسرا گروپ الفاٹو کہلائے گا۔"

کرن نے برا سا منہ بناتے ہوئے قریب موجود نقش کے کان کے نیچے سرگوشی کی۔ "تم میرے گروپ میں میری جگہ آجاؤ یار!"

نقش اپنی جگہ مسرور تھی۔ اس نے صاف انکار کرتے ہوئے جوابی سرگوشی کی۔ "سوری بھئی! میں شجاع جیسے جوکر کا ساتھ مس نہیں کرسکتی۔ ہنسائے گا تو سہی نا۔" دل کی چوری وہ بڑی خوبی سے چھپا گئی تھی۔

کرن نے غیر محسوس انداز میں اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔ وہ شاید شجاع کے حوالے سے اس کے چہرے پر دھنک کا کوئی رنگ ڈھونڈنا چاہ رہی تھی۔ ایسا کچھ تھا ہی نہیں تو اسے ملتا کہاں سے۔

کرنل سلیم نے دونوں رہنما سپاہیوں کو بھی طلب کرلیا تھا۔ نقش وغیرہ کے حصے میں شیر دل خان آیا تھا۔ ان لوگوں کے بنائے نقشوں پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کرنل سلیم نے الفاون کی قیادت حنظلہ اور الفاٹو کی نقش کو سونپی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ ان کے نقشے سب سے بہتر پائے گئے تھے۔

دس منٹ بعد دونوں گروپس کیمپ سے نکل چکے تھے۔ ہوا میں شدت آگئی تھی جس کے سبب برف کے ذرات چھروں کی مانند ان کے چہروں سے ٹکرانے لگے تھے۔ نقش نے بطور قائد انہیں اپنے چہرے ماسک سے ڈھانپنے کی ہدایت دی۔ یہ ماسک بھی وردی کا حصہ تھے۔

وہ، کوہ پیماؤں کے انداز میں پھر ایک طویل رسے سے آپس میں منسلک تھے۔ ان کے ہاتھوں میں فولڈ ہوجانے والی نکیلی مخصوص قسم کی اسٹکس تھیں، جن کے ذریعے برف کو ٹٹولا جاتا تھا کہ اگلا قدم انہیں کسی کھائی یا گڑھے میں تو نہیں لے جانے والا۔

سب سے آگے شیر دل تھا۔ دس گز کے مخصوص فاصلے کے بعد شجاع پھر نقش اور آخر میں شامیر تھا۔ ان کی ساری توجہ گردوپیش پر تھی۔ اس دفعہ ہر کسی کے دماغ میں نقشہ بنانے والی بات موجود تھی اس لیے سبھی اسی نظر سے گردوپیش کو دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد شجاع کی زبان پر کھجلی ہوئی۔ وہ نقش سے مخاطب ہوا۔ "میڈم سر! مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی چھوٹا سا جانور میرے پیٹ میں گھس گیا ہے، اور اپنے نکیلے پنجوں سے مسلسل میرے معدے کو چھید رہا ہے۔ بطور لیڈر آپ کا فرض بنتا ہے کہ مجھے اس جانور سے نجات دلائیں۔"

نقش پس ماسک مسکرائی۔ ہوا کے شور کے سبب شامیر تک شجاع کی فریاد نہیں پہنچی تھی۔

نقش نے بظاہر سنجیدہ انداز میں کہا۔ "ہلکے پھلکے ناشتے کے سبب اکثر یہ 'جانور' پیٹ میں گھس ہی جاتا ہے۔ تمہارے پیٹ میں تو اس نے مستقل بل بنالیا ہے۔ اس کا خیر علاج ہے میرے پاس۔"

"او..... تھینکس۔ میڈم سر!" شجاع کی آواز میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ اس نے سمجھا تھا کہ شاید اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے۔"

نقش نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ''تم چہرے سے ماسک اتار دو اور چند گہری سانسیں لینے کے بعد تھوڑی سی برف پھانک لو۔ ضرور شفا ہوگی۔''

شجاع نے حسب عادت رونے کی آواز نکالی۔

ہوا کا رخ تبدیل ہونے کے سبب یہ آواز شامیر تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے زور سے کہا۔ ''کیا ہوا یار؟''

یہ آواز شجاع تک تو نہیں البتہ نقش تک ضرور پہنچ گئی تھی۔ اس نے چہرہ گھما کر شامیر کی طرف دیکھا۔ اور عام سے انداز میں کہا۔ ''اسے ہوا تو کچھ نہیں بھوک سے مرنے کا ڈرامہ کر رہا ہے۔'' ماسک کی آڑ ہونے کے سبب اس نے شامیر پر بھرپور نظر ڈال لی تھی۔

شامیر نے بھی اسی کے انداز میں کہا۔ ''بھوک تو ویسے بھی اس کی کمزوری ہے۔ سزا کے سبب اس کے پیٹ میں برائے نام ہی کچھ گیا ہے۔ یہاں تو ویسے بھی بھوک زیادہ لگتی ہے۔''

نقش نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ ایک ہی گروپ کا حصہ ہونے کے سبب اکثر ان کے درمیان اس قسم کے عام سے مکالمے ہوجاتے تھے مگر نقش کے لیے یہ بھی بہت تھے۔

سامنے ایک چھوٹی سی ڈھلان آنے کے سبب چلوٹو ان کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔ وہ اسٹکس کے سہارے برف کو ٹٹول کر ڈھلوان پر چڑھنے لگے۔ یہاں وہ گھٹنوں گھٹنوں تک برف میں دھنس رہے تھے۔

شیر دل کے ڈھلوان کے دوسری طرف اترتے ہی ایک زور دار جھٹکے نے شجاع کے قدم اکھیڑ دیئے تھے۔ وہ پہلے گھٹنوں کے بل گرا تھا پھر اوندھے منہ اور پھر آگے کی طرف گھسٹتا گیا تھا مگر عقب میں رسے میں تناؤ پیدا ہوتے ہی وہ ساکت ہوگیا تھا۔

شیر دل نگاہوں سے اوجھل تھا یقیناً وہ کسی گڑھے یا کھائی میں گر گیا تھا۔ ایک ہی رسے سے بندھے ہونے کی وجہ سے یہ جھٹکا لگا تھا۔ جھٹکا تو نقش اور شامیر کو بھی لگا تھا مگر زیادہ شدت شجاع نے سہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے ان تینوں کے حواس مختل ہوئے تھے مگر تربیت کے زیر اثر انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ نقش اور شامیر نے فوراً مخصوص انداز میں پاؤں آگے، پیچھے کر کے مضبوطی سے جما لیے تھے اور رسے کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

شجاع بھی سنبھل کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اسے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ شیر دل کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔

بطور لیڈر نقش کے لیے صورت حال گمبھیر ہوگئی تھی۔ اس نے پہلے شجاع کی خیریت جانی پھر شجاع کو شیر دل کی خیریت جاننے کے لیے کہا۔ شجاع ہی شیر دل سے نزدیک تھا۔

شجاع نے رسے پر ہاتھ جماتے ہوئے شیر دل کو آواز دی۔ شیر دل نے جواب دیا۔ تو شجاع کو اطمینان ہوا۔ ساتھ ہی اس کی شگفتگی بھی لوٹ آئی۔

''یارا! تم کدر غائب ہوگیا ہے تم کوئی جن، بھوت تو نہیں ہے؟''

''صاحب! ام اُدر کھائی میں لٹکا ہوا ہے۔ یہ سور کا بچہ برف میں چھپا ہوا تھا ام کو باہر کینچو۔''

شجاع نے چلا کر ان دونوں کو شیر دل کی خیریت کی اطلاع دی اور رسہ کھینچنے کے لیے تیار رہنے کے لیے کہا۔ پھر شیر دل سے مخاطب ہوا۔

''ام تم کو کنچے لگا ہے تمہارا پوزیشن کیا ہے؟''

''ام گرتے ہوئے گوم (گھوم) گیا ہے، امارا کمر کھائی کا دیوار سے لگا ہے اور سر کے اوپر ایک بڑا پتھر لٹکا ہوا ہے۔ اسی سے ٹکر کھا کر ام کو ما ہے۔ آپ رسے کو کینچے گا تو پتھر امارے مغز میں لگے گا۔''

شجاع نے کہا۔ ''تم مغز کی فکر نہ کرو۔ اگر تمہارے اس مغز ہوتا تو تم اوپر اٹھتے ہوئے ہاتھوں کو استعمال کرکے پتھر سے بچ سکتا تھا۔''

''آپ مذاق کرتا صاحب! مگر یہاں ایک دو اور پتھر بھی ہے۔ آپ پیچھے والا صاحب کو رسے سے علیحدہ کر کے کھائی کے کنارے بھیجو وہ رسے کو گھمائے گا تو ام سیدھا ہو جائے گا پھر آپ لوگ کھینچ لینا۔''

''تم سو سال بھی سیدھا نہیں ہو سکتا۔'' شجاع نے زیر لب کہا اور نقش کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

ہوا کے رخ کے سبب شامیر بھی آگاہ ہوگیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں آتا ہوں۔'' وہ اپنی کمر سے بندھا رسا کھولنے لگا۔

مشترکہ رسے سے علیحدہ ہو کر شامیر کا آگے جانا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ نقش کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں تھا۔

شامیر نے خود کو رسے سے علیحدہ کیا تو شیر دل کے سارے وزن کا دباؤ نقش اور شجاع پر آگیا تھا۔ انہیں پوری طاقت صرف کرنا پڑ گئی تھی۔

شامیر اسٹک برف میں جما جما کر بے حد احتیاط سے آگے بڑھا، نقش کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں، ہر قدم پر اس کے دل سے شامیر کے لیے خیر و عافیت کی دعا نکل رہی تھی۔ شامیر اس کے قریب سے گزرا تو پہلی دفعہ نقش کو خود پر کنٹرول رکھنا مشکل ہوگیا۔

''خیال سے شامیر۔''

ان تین لفظوں میں نہ جانے کیا تھا کہ شامیر نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا تھا۔

ماسک نے نقش کا بھرم رکھ لیا تھا اور وہ بھی سنبھل گئی۔ ''میرا مطلب ہے کھائی کے کنارے پر احتیاط سے اور لائف لائن بھی لگا لینا۔'' اس دفعہ الفاظ کا آہنگ اور آواز کا ارتعاش مکمل کنٹرول میں تھا۔

شامیر نے مختصراً کہا۔ ''بے فکر رہو۔'' اور پھر آگے بڑھ گیا۔ بہرحال نقش کے پہلے والے انداز نے اس کے دل و دماغ میں کھلبلی سی مچا دی تھی۔

شامیر نے شجاع کی کمر سے لپٹی باریک مگر بے حد مضبوط ڈوری، جسے ''دوسری لائف لائن'' کہا جاتا تھا، کھول کر اس کا ایک سرا اپنی بیلٹ سے منسلک کرنے کے بعد کھائی کی طرف بڑھا۔

اگلے چند منٹ میں شیر دل کھائی سے باہر آچکا تھا اور وہ سابقہ پوزیشن میں پھر روانہ ہو چکے تھے۔ کھائی کے قریب رک کر نقش نے اپنی ڈائری پر سکے والی پنسل سے نوٹ لکھا تھا۔

چلوٹو ایک دفعہ پھر ان کے سامنے تھا۔ مگر اتنے ہی فاصلے پر محسوس ہو رہا تھا جتنا کیمپ سے روانہ ہوتے ہوئے محسوس ہوا تھا۔

شیر دل کو کوئی چوٹ نہیں آئی تھی۔ موٹے حفاظتی لباس کے سبب وہ رگڑ سے بھی محفوظ رہا تھا۔ شجاع نے اس سے مخاطب ہو کر منت کے انداز میں کہا تھا۔

''اب سنبھل کر چلنا یارا! کسی اور کھائی سے تمہیں ''کنچنے'' کی ہمت اب ام میں نہیں ہے۔''

شیر دل کھسیانی انداز میں ہنسا۔ ایسا ہو جاتا ہے صاحب! بے دھیانی میں اٹھا ایک قدم آپ کو کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ ان پہاڑوں میں ہر قدم دیکھ کر رکھنا چاہیے۔''

''جیسے تم نے دیکھ کر کھائی میں رکھا تھا۔'' شجاع طنز کرنے سے باز نہیں آیا۔

شیر دل ایک دفعہ پھر کھسیانی انداز میں ہنس کر چپ ہوگیا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کھائی میں وہ پہلے بھی کم از کم درجن دفعہ گر چکا ہے۔''

بظاہر نصف گھنٹے کی مسافت پر نظر آنے والے

گلیشیئر تک وہ ڈھائی گھنٹے میں پہنچ سکے تھے۔ آدھے گھنٹے سے زیادہ اس کے گرد گھوم کر اس ٹریک پر جانے میں لگا جو کیمپ کی طرف واپس جارہا تھا۔ اور الفاوان کو اسی ٹریک سے گلیشیئر کی طرف آنا تھا۔ مگر ابھی تک ان کا کوئی نام ونشان نظر نہیں آرہا تھا۔ لگتا تھا کہ ابھی پیچھے تھے۔ مگر ہوا میں اڑتے برف کے ذروں کے سبب حدنگاہ چند میٹر سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا وہ قریب ہی ہوں۔ وہ فوراً ہی واپسی والے ٹریک پر ہولیے تھے۔ کل کے طویل سفر کی مشق ان کے کام آرہی تھی۔ پھر رات انہوں نے بھرپور آرام بھی کیا تھا۔ البتہ بھوک کا عفریت انگڑائیاں لینے لگا تھا۔ شجاع کا برا حال تھا مگر وہ زبردست قوت برداشت کا مالک کمانڈو تھا۔ دودن مزید خوراک کے بغیر وہ نکال سکتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے واویلا شروع کردیا تھا۔

"میڈم سر! آپ نے کمانڈر کو دی جانے والی رپورٹ میں اس تجویز کا اضافہ ضرور کرنا ہے کہ ہر مشکل سفر پر ٹروپس کے پاس زادراہ کے طور پر کم ازکم ہائی انرجی پروٹین بسکٹ ضرور ہونے چاہیے۔ یہ برف زار توانائی تیزی سے چاٹتے ہیں۔"

نقش نے کہا۔ "کمانڈر یہ بات بہتر طور پر جانتے ہیں۔ ہمیں یہاں آئے ہوئے دوسرا دن ہے اور وہ نہ جانے کب سے یہاں ہیں...... ویسے تمہارے نام کے ساتھ کہو تو یہ تجویز دی جاسکتی ہے۔" اس کے لہجے میں شرارت در آئی تھی۔

"نن...... نن...... نہیں...... نہیں۔" شجاع نے لرز کر کہا۔ "مجھ میں مزید "کم خوراکی" کی سزا سہنے کی ہمت نہیں ہے۔"

اسی وقت پیچھے برف نے چند سفید پوشوں کو اگل دیا تھا۔ یہ الفاوان تھا۔ چند منٹ بعد دونوں گروپ یکجا تھے۔ کاشف نے جان بوجھ کر نقش کو مخاطب کیا تھا۔ "تمہارے گروپ نے لیڈ لے لی ہے......"

"دراصل ہمیں ایک چھوٹا سا حادثہ پیش آگیا تھا۔"

نقش نے اسے نظرانداز کرکے حنظلہ سے پوچھا۔

"کیا حادثہ ہوا ہے تمہارے ساتھ؟" انہیں عمودی لحاظ سے مکمل دیکھ کر اسے زیادہ تشویش نہیں ہوئی تھی۔

اس طرح نظرانداز کیے جانے پر کاشف کٹ کررہ گیا تھا۔

حنظلہ نے کہا۔ "وہ...... دراصل ہمارے رہنما مرجان خان صاحب ایک کھائی میں جاگرے تھے۔" اس کے انداز کے سبب کئی بلند آواز میں ہنسے تھے۔

"اسی سبب ہمیں قدرے تاخیر ہوگئی ہے۔" حنظلہ نے بات مکمل کی۔

شجاع بولا۔ "گرتو ہمارے شیر دل خان بھی گئے تھے مگر ہم انہیں بروقت کھائی میں سے نکالنے میں کامیاب رہے تھے۔"

ان لوگوں کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ان کے رہنما جان بوجھ کر کھائیوں میں گرے تھے۔ اس موقع پر کرن نے چپ کھڑے شامیر پر ایک نظر ڈالی اور بولی۔ "میرا خیال ہے ہمیں روانہ ہوجانا چاہیے مزید تاخیر کم ازکم ہمارے گروپ کے لیے مناسب نہیں ہے۔"

اس سے اتفاق کیا گیا۔ دونوں گروپس اپنے اپنے رستے پر ہولیے۔

کاشف نے پس ماسک بڑی جلتی ہوئی نظروں سے نقش کی طرف دیکھا تھا۔

❁ ❁ ❁

رات کو آج کے سفر کی رپورٹ اور نقشہ بنانے کے بعد نقش سلیپنگ بیگ میں گھسی تو اس کے فارغ ہونے کی منتظر کرن کی زبان کو فوراً حرکت ہوئی۔

"نقش! ہمارے ساتھ کو زیادہ دن نہیں گزرے مگر میں تمہارے لیے اپنے دل میں خاصی جگہ محسوس کرتی ہوں۔ تم بہت اچھی ہو۔"

نقش نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی عام سی مگر شفاف آنکھوں میں سچائی اور خلوص کی چمک تھی۔ نقش نے ملائم انداز میں کہا۔ "یہ تمہارے اندر کی اچھائی ہے جو تم نے مجھے اچھا جانا...... اس کے لیے بہت سارا شکریہ۔" پھر اس نے شگفتگی کا مظاہرہ کیا۔ "ویسے پوچھ سکتی ہوں یہ مکھن کس سلسلے میں لگایا جارہا ہے۔"

کرن ہنسی۔ "ہوں...... دراصل تمہیں رازداں بنانے کو جی چاہ رہا ہے۔" نہ جانے کن خیالوں میں کھو کر اس کی آنکھیں ستاروں کی مانند چمکنے لگی تھیں۔

نقش کے وجود میں نرمی اترنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ کرن اسے کس سلسلے میں اپنا رازداں بنانا چاہتی ہے۔ پھر بھی اس نے نرمی سے کہا۔ "تمہارے بتائے بغیر بھی میں جانتی ہوں تم کس سلسلے میں مجھے رازداں بنانا چاہتی ہو...... یہی نا کہ شامیر تمہیں اچھا لگنے لگا ہے؟"

کرن نے اثبات میں سرہلایا اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ وہ بولی۔ "وہ بھی عام سی شکل وصورت کا ہے اور میں بھی۔ ہماری جوڑی مناسب رہے گی۔" پھر اس نے خود ہی خیال آرائی کی۔ "مجھے لگتا ہے اپنی عام سی شکل وصورت کے باعث وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔ اسی سبب لڑکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔ اس کے لاشعور میں مسترد کیے جانے کا ڈر چھپا ہوا ہے۔ میں خود پیش قدمی کروں تو ممکن ہے اس کا یہ خود ساختہ خوف ختم ہوجائے۔"

نقش جانتی تھی کہ شامیر کے لڑکیوں کی طرف متوجہ نہ ہونے کی یہ وجہ نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی معلومات کرن سے شیئر تو نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے خوشگوار انداز میں کہا۔ "تم نے تو اس کا اچھا خاصا نفسیاتی تجزیہ کرڈالا ہے۔ مگر کل تم نے کسی مقناطیسی کشش اور اس کی آنکھوں کی سحرانگیزی کا ذکر کیا تھا ممکن ہے تم نے جو محسوس کیا ہے وہ کسی اور نے بھی محسوس کیا ہو۔"

نقش نے کسی قدر مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اس بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

کرن کا چہرہ محبت کے احساس تفاخر سے جگمگانے لگا۔ "یہ محبت کا کرشمہ ہے میری جان!" کرن کا لہجہ خمار آگیں ہوگیا تھا۔ "اس کی خوب صورتی اور انفرادیت کو ضرور میری پرستش کرنے والی نظروں نے محسوس کیا ہے۔ کسی اور نے اسے ان نظروں سے دیکھا ہی نہیں۔ تو پھر اس انفرادیت کو کیسے محسوس کرسکتا ہے۔"

"تم یہ دعویٰ کس بنیاد پر کررہی ہو؟" نقش نے قدرے تیکھے انداز میں کہا تھا مگر کرن جس کیفیت میں تھی اسے لہجے کی تیزی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی انداز میں بولی۔

"یہ میرے دل کا دعویٰ ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ "خیر...... تم نہیں سمجھوگی۔" وہ اچانک ہی واپس آگئی۔

"میں کیوں نہیں سمجھ سکتی؟" نقش نے تیوریاں چڑھائیں۔

"اس لیے مائی سولجر گرل کہ تمہارے سینے میں دل کی جگہ پتھر دھرا ہے۔"

اس کے انداز پر نقش بے اختیار ہنس پڑی۔

کرن اپنی بات جاری رکھے تھی۔ "اگر تمہارے سینے میں جذبات سے بھرپور دل دھڑکتا تو تم اپنے بیچ کے سب سے خوبرو لیفٹیننٹ کو یوں نظرانداز نہ کرتیں۔" اس نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

نقش کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ اس کا اشارہ یقیناً

کاشف کی طرف تھا۔ اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت دیکھ کر کرن کو چپ سی لگ گئی۔

نقش بولی تو اس کا لہجہ بالکل اجنبی انداز لیے ہوئے تھا۔ "کرن! میں پہلی اور آخری دفعہ تمہیں وارن کررہی ہوں' آئندہ اس طرح کی کوئی بات نہ کرنا۔ مجھے کسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

کرن کا رنگ فق ہوگیا تھا۔ اس نے بے جان سی آواز میں معذرت کی۔ "سوری' میں آئندہ خیال رکھوں گی۔"

اس کی حالت دیکھ کر نقش زبردستی مسکرائی۔ "گڈ گرل!" پھر اس نے گفتگو کا رخ کرن کے پسندیدہ موضوع کی طرف موڑ دیا۔ شامیر کے دل کا دروازہ کھولنے کے لیے تم نے کوئی طریقہ بھی سوچا ہے یا نہیں۔"

حسب توقع کرن فوراً ہی پرجوش ہوگئی' بولی۔ "میں اس کے خوف کا خود ساختہ خول توڑ کر ہی رہوں گی۔ میں نے سوچا ہے موقع ملتے ہی دل کی کیفیت اس کے سامنے کھول کر بیان کردوں گی۔ تم کیا مشورہ دو گی؟"

نقش کو اس پر ترس آنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ شامیر کا خول توڑتے ہوئے وہ خود ٹوٹ جائے گی۔ اس سادہ اور کھری لڑکی کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے اس نے کہا۔ "میں' تمہیں سیدھا حملہ کرنے کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گی۔ پہلے اس کے دل میں تھوڑی سی جگہ تو بنالو یہ نا ہو کہ اپنے دل کی کرچیاں ہاتھ میں لیے رہ جاؤ۔" کرن اندیشوں کا شکار ہوگئی۔

نقش نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "آگے تمہاری مرضی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جلد بازی میں' میری اس کیوٹ سی دوست کا ننھا سا دل ٹوٹ جائے اور وہ ان برف زاروں میں گاتی پھرے...... دل میرا توڑا؟

کہیں کا نہ چھوڑا...... او صنم بے وفا......"

کرن اداسی سے مسکرائی۔ پھر پرسوچ انداز میں بولی۔ "تمہارا مشورہ مناسب ہے۔"

نقش نے اونی ٹوپی کانوں تک کھینچی' "اپنی آنکھوں میں ساجن کے خواب سجائے اب سو جا میری رانی!" کرن نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ مبہوت ہوکر اسے تکے جارہی تھی۔

کولڈ کریم کی ڈبی کا ڈھکن کھولتے ہوئے نقش چونکی۔ "کیا ہوا......؟" اس نے کرن کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔

"ٹوپی سے نکلے برنش بالوں کی لٹوں میں تمہارا چہرہ کتنا پیارا لگ رہا ہے۔" اس نے رشک وحسد کے ملے جلے جذبے سے کہا تھا۔

چہرے پر کریم کا مساج کرتے ہوئے نقش ہنسی مگر دل سے کراہ نکلی تھی۔ جن سراہنے والی نظروں کی اسے طلب تھی وہ تو جیسے اس کی طرف سے بند تھیں۔ کراہ ہنسی میں دب گئی تھی۔ وہ بولی۔ "تو پھر ساجن کی بجائے میرا چہرہ آنکھوں میں سجالو...... مگر سو جاؤ...... میں لائٹ بند کرنے لگی ہوں۔"

کرن نے جانے کیا سوچ کر ٹھنڈا سانس لیا تھا۔ چند لمحوں بعد نقش نے لائٹ بجھادی۔ اندھیرا ہوتے ہی چہرے سے خوشنمائی کا نقاب اتر گیا تھا۔ دل میں درد اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ یادوں کی بارات بے حد دھیرے سے اس یخ بستہ خیمے میں اتر آئی۔

❁......❁......❁

ماہم آج کئی دنوں بعد آئی تھی۔ اور آتے ہی اس سے لپٹ گئی تھی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیوں خوشی سے چہکنے لگی ہے۔" نقش نے اس سے بمشکل علیحدہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"جلدی سے میرے لیے اپنے ہاتھ سے کچھ ......" ماہم نے بے حد پرجوش انداز میں کہا۔ "میں نے تیرے سانولے سلونے شہزادے کا پتا چلالیا ہے۔"

نقش کا دل پہلے دھک سے رہ گیا پھر تیزی سے دھڑکنے لگا۔ "مگر کیسے...... پتا چلالیا تو نے؟" اس کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔ ساتھ ہی اس نے ماہم کو صوفے پر دھکیلا۔

"تیری خاطر ملکی وسائل کو استعمال کیا گیا ہے لڑکی! میرے ہونے والے "وہ" ہیں نا...... انہوں نے کام دکھایا ہے۔"

نقش کے ذہن میں پھلجڑی سی چھوٹی۔ ماہم کا منگیتر علی مینگل آئی' ایس' آئی میں تھا۔ "علی بھائی نے پتا چلایا ہے؟" ماہم نے اثبات میں سرہلایا۔

یہ سوچ کر نقش کا چہرہ سرخ ہوگیا کہ ماہم نے علی سے نہ جانے کیا کیا بکواس کی ہوگی۔ دوسری طرف ماہم تفصیل بتانے لگ گئی تھی۔

"میں نے تیرے "مرض" کا حال اسے سنایا تو اس نے چٹکی بجاتے میں مسئلہ حل کردیا۔ میں نے اسلام آباد سے آنے والی اس فلائٹ کا ٹائم بتایا جس میں انکل اور تیرا "شہزادہ" کراچی آئے تھے۔ اس نے سیکیورٹی کے نام پر فوراً اس فلائٹ کے مسافروں کا ریکارڈ طلب کرلیا۔ اس ریکارڈ میں مسافروں کے آئی ڈی کارڈز کی کاپیاں بھی تھیں۔

اس چھوٹے سے جہاز میں صرف بہتر مسافر تھے۔ جن میں نوجوانوں کی تعداد صرف آٹھ تھی۔ میں نے انہیں شارٹ لسٹ کیا تو صرف تین [illegible]۔ ان میں سے بھی دو اچھے خاصے خوبرو [illegible] سامنے ہے۔" اس نے ایک ہی [illegible] پوری تفصیل بتا کر اپنے بیگ میں سے [illegible] نکال کر لہرایا۔

نقش اس کاغذ پر جھپٹی۔

ماہم نے بڑی صفائی سے کاغذ بچایا۔ "ایسے نہیں۔ کم از کم پہلے منہ تو میٹھا کرواؤ میں تجھے ایک اور خوشخبری سناؤں......"

"دکھا تو سہی......" نقش نے بڑی بے چینی سے کہا۔ "کسی اور کو تو نہیں اٹھا لائی۔"

ماہم نے کاغذ اس کی پہنچ سے دور رکھتے ہوئے ایک کونا کھولا "دیکھ لے...... یہی ہے نا؟" اس نے بڑے پریقین انداز میں پوچھا تھا۔

نقش کی ساری حسیں آنکھوں میں سمٹ آئی تھیں۔ آئی ڈی کارڈ کا صرف ایک حصہ نظر آیا تھا جس پر اس دشمنِ جاں کی تصویر نظر آرہی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ کاپی کے باوجود اس نے پہچان لیا۔ یہ بے شک وہی تھا۔ ماہم کی نظریں اسی پر جمی تھیں نقش نے گہرا سانس لیا تو اس نے کاغذ لپیٹ لیا۔

"یہی ہے نا......" اس نے تصدیق چاہی۔ وہ نقش کے چہرے سے اندازہ تو لگا ہی چکی تھی۔ نقش نے اعتراف جرم کے انداز میں سرہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر شرمگیں سی مسکراہٹ تھی۔

بعد میں نقش نے اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں رس گلا ٹھونسا تو اس نے رس گلا حلق سے اتارنے کے بعد کہا۔ "اس کا نام شامیر ہے۔"

فوراً ہی یہ نام نقش کی دھڑکنوں کے ہم آہنگ ہوکر اس کے دل کے ساتھ دھڑکنے لگ گیا تھا۔ "اور وہ خوشخبری......" اس نے بمشکل اپنی دھڑکنوں کو سنبھالتے ہوئے کہا تھا۔

ماہم نے اس کے گلال ہوجانے والے گالوں میں سے ایک پر آہستہ سے چٹکی لی۔ "میری بنو...... وہ آرمی میں ہے اور کاکول میں زیرتربیت ہے۔ کیا سمجھی۔ اپنے باپ کو بول اس کے گلے میں رسی باندھ

کر تیرے ہاتھ میں تھمادے پھر اسے ڈگڈگی پر ساری عمر نچاتی رہنا۔"

نقش چند لمحوں کے لیے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی پھر اچانک ہی اس نے ماہم کے ہاتھ سے کاغذ اچک لیا۔

ماہم فوراً ہی اس سے ہاتھاپائی کرنے لگی۔ "میں تیری جان لے لوں گی۔" وہ چلائی' اپنے ہاتھوں سے چکن کٹلس بنا کر کھلائے گی تو اس کاغذ پر تیرا حق بنے گا۔" اس نے بے دریغ نقش کے کاغذ والے ہاتھ کی کلائی پر دانت جمادیے۔

نقش نے سسکاری لی۔ "اچھا بابا کھلاتی ہوں' میرا گوشت تو نہ کھا۔"

ماہم نے پہلے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا پھر دانتوں کی گرفت ڈھیلی کی۔

نقش نے اپنی سڈول اور سرخ و سفید کلائی پر نظر ڈالی۔ جہاں اس کے دانتوں کے نشان بن گئے تھے۔ "تیرے آباؤاجداد ضرور کسی آدم خور قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔" اس نے جل کر کہا۔

"تو کچن کا راستہ ناپتی ہے یا میں اپنے آدم خور ہونے کا باقاعدہ ثبوت دوں۔"

"یہ ثبوت کیا کم ہے۔" نقش نے اپنی کلائی پر دوبارہ نظر ڈالتے ہوئے کہا اور پھر کچن کی طرف چل دی۔ ماہم بھی اس کے پیچھے تھی کہ کہیں وہ خانساماں کی مدد نہ لے لے۔

پرتکلف چائے کے بعد ماہم نے وہ پرچا اس کے حوالے کردیا تھا۔ پی آئی اے کے ریکارڈ کے مطابق شامیر ہر ہفتے باقاعدگی سے کراچی آتا تھا۔ ویک اینڈ شام کو اس کی روانگی ہوتی تھی۔

نقش نے سوچا' ایبٹ آباد سے بائی روڈ اسلام آباد' شام کی فلائٹ سے کراچی اور اگلے دن ہی شام کو روانگی اور دوبارہ سے کاکول تک کا سفر۔ وہ کس کی خاطر اتنی صعوبتیں اور اخراجات برداشت کررہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کے ذہن میں شامیر کی بھتیجی کی توتلی آواز ابھری۔ "چاچو! جب آپ واپس چلے جاتے ہیں تو پھر مجھے نونی آتی ہے۔"

اس کے دماغ میں کوئی چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا وہ یہ تھکا دینے والا سفر بھتیجی اور دیگر اہل خانہ کی خاطر ہی کرتا ہے۔

اسے گم صم دیکھ کر ماہم نے کہا۔ "علی کو باقاعدہ میں نے شامیر کے پیچھے لگا دیا ہے۔ جلد ہی وہ مزید اس کے بارے میں معلومات دے گا۔ پھر ایک خیال سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "اس کا گھر تو یہیں ڈیفنس میں ہی ہے' چل اس کے گھر چلتے ہیں۔"

"پاگل تو نہیں ہوگئی تو......" نقش نے اسے اچنبھے سے دیکھا۔ "نہ جان نہ پہچان...... میں تیرا مہمان۔ وہاں ہمیں کون گھسنے دے گا۔"

ماہم نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ شامیر کے آئی' ڈی کارڈ پر درج ایڈریس کو ذہن نشین کررہی تھی پھر اس نے اپنی چادر اور بیگ سنبھالا۔ "چل اٹھ...... میں جانتی ہوں شامیر سے زیادہ تو اس کی بھتیجی کو پیار کرنے کے لیے مری جارہی ہے۔ اب زیادہ نخرے نہ کر۔"

"لیکن یار' ہم کس حوالے سے وہاں جائیں گے؟" اسے تیار دیکھ کر نقش سچ مچ بوکھلا گئی تھی۔

"یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔" ماہم نے بے پروائی سے کہا۔

چند منٹوں بعد ماہم نے باقاعدہ دھکیل کر اسے اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا۔

"بچی یار' تم سچ مچ بے عزتی کرواؤ گی۔" نقش بے حد خائف تھی۔

"تو دیکھتی جا......" ماہم نے بڑے اعتماد سے کہا اور پھر گاڑی آگے بڑھادی۔

نقش دل ہی دل میں جل تو جلال تو...... کا ورد کرنے لگی۔

تھوڑی سی تلاش وبسیار اور ایک اسٹیٹ ایجنسی والے سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد ماہم نے ایک عالیشان سرخ ماربل سے بنی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔ گیٹ کے دائیں طرف ایک بڑی سی سیاہ فولادی پلیٹ پر ابھرے ہوئے ابھری حروف سے "کاشانہ نصیر" کے نیچے سمیر نصیر اور شامیر نصیر لکھا ہوا تھا۔ ماہم نے کوٹھی کے نمبر کو بغور دیکھا اور مطمئن ہوگئی۔ البتہ نقش کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔

گیٹ کے سامنے ڈرائیو وے میں گاڑی رکتے ہی گیٹ کا چھوٹا والا حصہ کھل گیا تھا اور نیلی وردی میں ملبوس بڑی بڑی مونچھوں والا ایک گارڈ استفہامیہ انداز میں ان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

اس دوران ماہم نے اپنے بیگ میں سے اپنے باپ بریگیڈیئر قادر مگسی کا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس پر بال پوائنٹ سے کچھ لکھ لیا تھا۔ نقش کا سر اسی طرف جھکا ہوا تھا۔ ماہم نے اپنے مختصر تعارف کے ساتھ کوٹھی کی ظاہری خوبصورتی کو سراہتے ہوئے اسے اندر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

ماہم نے اشارے سے گارڈ کو بلایا اور کارڈ خاتونِ خانہ کو دینے کیلئے کہا۔ گارڈ کارڈ لے کر چلا گیا۔

نقش نے خشمگیں نظروں سے ماہم کو گھورا تو وہ [illegible] کر ہنس پڑی۔ "کیا کریں یار! تجھے تیری [illegible] تک تو پہنچانا ہی ہے۔ ویسے کوٹھی کی خوبصورتی [illegible] بھی نہیں ہے۔ سرخ پتھر کو بڑی مہارت سے استعمال کیا گیا ہے۔" نقش کے کچھ بولنے سے پہلے ہی کوٹھی کا مین گیٹ کھلنے لگا۔

ماہم نے کامیابی کے تفاخر سے نقش کی طرف دیکھا اور گاڑی اندر کی طرف بڑھادی۔ ڈرائیو وے کے اختتام پر پورچ میں پہلے ہی ایک چھوٹی گاڑی کھڑی تھی۔ پورچ کے ایک طرف چھوٹا سا مگر بے حد نفاست سے سجا لان تھا۔ جو پھولوں کے حاشیے میں مقید تھا۔ داخلی راستہ اونچے گول جنگلے کا تھا جس پر بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔

ایک قدرے دراز قامت' گوری چٹی' اٹھائیس' تیس سالہ خاتون پورچ میں کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے سے اشتیاق و بے چینی ہویدا تھی۔ یہی خاتونِ خانہ تھیں جو خود باہر آگئی تھیں۔

وہ ان دونوں سے بڑی محبت سے پیش آئیں اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئیں ان کا نام غزالہ تھا۔

ڈرائنگ روم کی آرائش میں بھی نفاست اور سلیقہ نمایاں تھا۔ سب سے بڑھ کر ایک سنہرے فریم میں شامیر کی قدآدم تصویر تھی۔ غالباً کسی پروفیشنل نے یہ تصویر بنائی تھی اس کی شارپ نس قابل دید تھی۔ وہ قد آدم تصویر اتنی حقیقی تھی کہ لگتا تھا کہ مسکراتا ہوا شامیر ابھی حرکت کرنے لگ جائے گا۔

غزالہ ان کی خاطر تواضع پر تل گئی تھیں۔ انہیں بڑی مشکل سے باز رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ یقین کریں' میں نے کچھ دیر پہلے ہی نقش سے ٹریٹ لی ہے۔"

"کس چیز کی ٹریٹ لی ہے؟" غزالہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ماہم زیرلب مسکرائی۔ "ان کے بے چین دل کو میری کوششوں سے قدرے قرار آیا ہے۔ اسی سلسلے میں ٹریٹ لی ہے میں نے۔" نقش کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس سرخی کو غزالہ نے دلچسپی سے دیکھا تھا مگر کسی قسم کی خیال آرائی سے گریز کیا۔ وہ صرف

مسکرادی تھیں۔

ماہم نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ "یہ صاحبہ بھی ڈیفنس میں ہی رہتی ہیں اور مجھے جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ اسی لیے انہیں ملنے کے لیے اکثر مجھے ہی آنا پڑتا ہے۔"

غزالہ نے ایک دفعہ پھر دلچسپی سے نقش کی طرف دیکھا۔ جو قدرے کنفیوز نظر آرہی تھی۔

ماہم رواں تھی۔ "آپ کی یہ دلکش رہائش گاہ ہر دفعہ قدم روکتی تھی۔ مگر کبھی قدم آگے بڑھانے کی ہمت نہیں ہوئی کہ جانے کیسے رویے کا سامنا کرنا پڑے...... مگر آپ سے ملنے کے بعد لگ رہا ہے۔ میں نے اتنی دیر کرکے غلطی کی ہے۔ مجھے بہت پہلے آجانا چاہیے تھا۔ جتنا پیارا آپ کا گھر ہے' آپ اس سے بھی پیاری اور نفیس ہیں۔"

"یہ آپ لوگوں کا حسن اخلاق ہے۔ ورنہ اس گھر اور مجھ میں اتنا بھی خاص کچھ نہیں ہے۔" غزالہ نے انکساری کا مظاہرہ کیا پھر نقش سے مخاطب ہوئیں۔

"لگتا ہے بولنے کی تمام تر ذمہ داری آپ نے اپنی دوست کو سونپ رکھی ہے۔"

نقش کے بولنے سے پہلے ماہم نے دخل اندازی کی۔ "دراصل خاموش اور سنجیدہ رہنا انہیں وراثت میں ملا ہے۔ یہ جنرل عاطف لودھی کی دختر نیک اختر ہیں۔"

غزالہ کے چہرے پر مرعوبیت نظر آنے لگی اور ماہم یہی چاہتی تھی کہ نقش کا مکمل تعارف ہو جائے۔

نقش نے خود کو سنبھال کر کہا۔ "بکواس کرنے کی اس کی عادت ہے۔ یہ کسی اور کو بولنے کا موقع دے تو وہ بولے۔"

"تو بولو...... تمہیں کس نے روکا ہے۔ میں اب خاموش رہوں گی۔" اس نے ترنت جواب دیا تھا۔

غزالہ ان دونوں کی نوک جھونک سے محظوظ ہوئیں

بولیں۔ "آپ لوگ کچھ کھانے پینے سے تو انکاری ہیں آئیں آپ کو اپنا گھر ہی دکھادوں۔"

نقش نے کسی قدر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "کہیں ہماری وجہ سے آپ کے فیملی ممبر ڈسٹرب نہ ہوں۔"

غزالہ کے چہرے پر اداسی بکھر گئی۔ "اہل خانہ کے نام پر یہاں میں' میری چار سالہ بیٹی اور میرے شوہر رہتے ہیں' میرے شوہر اس وقت شوروم پر ہوں گے اور بیٹی ہمسائیوں کے بچوں سے کھیلنے کے لیے گئی ہوئی ہے۔" سانس لینے کے لمحاتی وقفے کے بعد اس نے دوبارہ کہا۔ "ساس' میری شادی سے بہت پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ سسر کو وفات پائے ابھی سال ہوا ہے۔ یہ پورا گھر آپ کو بھائیں بھائیں کرتا ملے گا۔"

اداسی نے کسی غیر مرئی بادل کی مانند لمحوں میں اس ڈرائنگ روم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ دونوں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد ماہم نے بوجھل سی آواز میں کہا۔ "یہ ڈرائنگ روم میں تصویر کس کی ہے۔ یہ آپ کے...... اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

نقش کی دھڑکنیں پھر بے ترتیب ہو گئی تھیں۔

غزالہ اداسی آمیز انداز میں مسکرائیں۔ "یہ میرا دیور شامیر ہے۔" ان کی نظریں شامیر کی تصویر پر گئی تھیں اور ان آنکھوں سے ممتا بھری محبت اُمڈ رہی تھی۔ "یہ بھی اس گھر کی جان ہوتا تھا' مگر اپنے باپ کی وفات کے بعد اس نے جیسے بن باس لے لیا۔ اور اب تو چند ماہ پہلے اس نے آرمی جوائن کر لی ہے۔ آج کل کاکول اکیڈمی ہوتا ہے۔"

غزالہ کے انداز و لہجے سے یہ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خاندان کسی المیے کا شکار ہوا ہے مگر ماہم نے خواہش کے باوجود پہلی ملاقات میں کریدنے

خود کو رو کے ہوئے تھی۔ نقش تو ویسے ہی بہت حساس تھی اس کا دل اس فیملی کے کسی المیے کو محسوس کر کے ویسے ہی آنسو بہانے لگ اٹھا۔

غزالہ جیسے غیر مرئی اداسی کو جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی اور انہیں گھر دکھانے لگی۔ شامیر کے لیے شادی سے پہلے ہی اوپر کا پورشن مخصوص کر دیا گیا تھا۔ یہ بات غزالہ نے انہیں بتائی تو تھی مگر اوپر لے جانے سے گریز کیا تھا۔

ماہم اپنے کردار میں حقیقت کا روپ بھرنے کے لیے ایک ایک گوشے میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ غزالہ کے ذوق کو بھی سراہا رہی تھی۔

کچن میں وہ قیمتی لکڑی کا دیدہ زیب کام دیکھ رہے تھے کہ ایک بالکل سفید اور خوبصورت پلا ہوا ایرانی نسل کا بے حد پیارا بلا آکر غزالہ کی ٹانگوں سے جسم رگڑنے لگا۔ ساتھ ہی وہ بے چین سی آوازیں بھی نکال رہا تھا۔

"صبر کرو جیکل۔" غزالہ بلے سے مخاطب ہوئی۔ "حوری آتی ہی ہوگی' وہی تمہیں آکر کھانا دے گی۔"

ماہم نے بے اختیار جھک کر بلے کا سر چھوا۔ "اف کتنا کیوٹ ہے۔ لیکن اس کا نام کتنا عجیب ہے' مجھے تو ہائیڈ اینڈ جیکل کارٹون یاد آگئے ہیں۔"

کسی خوشگوار لمحے کو یاد کر کے غزالہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ بولیں۔ "یہ دراصل دو ایک جیسے ہی بلے تھے جو شامیر...... حوری کی پہلی سالگرہ پر اس کے لیے تحفے کے طور پر لایا تھا۔ یہ اس وقت محض چند دنوں کے تھے اور شامیر ہی نے کارٹون کرداروں پر ان کے نام ہائیڈ اینڈ جیکل رکھے تھے پھر ان میں سے ایک' جیکل کا بھائی ہائیڈ نہ جانے کس طرح مر گیا۔ شاید اس نے کوئی غلط چیز کھالی تھی۔" وہ جیسے کہیں کھو گئی تھیں۔ "حوری دو دن تک محض ایک سال کی ہونے کے باوجود جیکل کے لیے روتی رہی تھی اور حوری کا رونا ہمیشہ سے شامیر کو بے کل کر دیتا ہے۔ دو دن جیسے شامیر نے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزارے تھے۔"

نقش کا دل جیسے پگھلنے لگا تھا۔ شامیر اور حوری کی محبت کا اس نے درست ہی اندازہ لگایا تھا۔

"حوری غالباً آپ کی بیٹی کا نام ہے؟" ماہم انہیں واپس حال میں لے آئی۔

غزالہ کے چہرے پر ممتا کی روشنی پھیل گئی۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہ آتی ہوگی۔ آپ لوگوں سے ملواتی ہوں۔ ماشاء اللہ بہت پیاری اور ذہین بچی ہے۔"

نقش نے پہلی دفعہ براہ راست گفتگو میں حصہ لیا۔ "آپ کی باتوں سے اندازہ ہوا ہے کہ آپ کے دیور حوری سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"محبت بہت چھوٹا لفظ ہے۔ عشق سے بھی کوئی آگے کی چیز ہے جو وہ' حوری سے کرتا ہے اور حوری کا جذبہ بھی اس کے لیے کچھ ایسا ہی شدید ہے۔"

"تو پھر وہ ایک' دوسرے سے دور کیسے رہ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے حوری تو ابھی بچی ہے۔ انہیں بہت مس کرتی ہوگی۔"

ماہم نے نظروں ہی نظروں میں اس کا شانہ تھپکا تھا۔

"شروع میں تو تھوڑا مسئلہ ہوا تھا مگر حوری بہت سمجھدار اور تعاون کرنے والی بچی ہے۔ شامیر کی بات فوراً سمجھ اور مان لیتی ہے۔ شامیر ویسے ہر ہفتے آتا ہے۔" پھر وہ ہنسیں "موبائل فون کی وجہ سے بھی وہ قریب ہی رہتے ہیں۔ دن میں تین دفعہ بات اور تصویروں کے تبادلے ہوتے ہیں۔"

ایرانی بلا جیکل اچانک ہی غزالہ کی پنڈلیاں چھوڑ

کر باہر بھاگا تھا۔
غزالہ نے کہا۔ ''آئیں' آپ لوگوں کو حوری سے ملواؤں۔ ہیکل' اسی کی مہک سونگھ کر ہی بھاگا ہے۔ لگتا ہے وہ آچکی ہے۔''
غزالہ انہیں ڈرائنگ روم کی بجائے لاؤنج میں لے آئی۔ یہاں حوری ایک بڑے کُشن پر بیٹھی ہیکل کے کان کھینچ رہی تھی۔
''تمہیں اتنی جلدی بھوک لگ جاتی ہے۔ کھانا پورے چھ بجے ملے گا۔'' حوری کے قریب ہی ایک صاف ستھرے لباس میں ملبوس لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کی گورنس تھی۔
ماں اور دو اجنبی لڑکیوں کو دیکھ کر حوری کُشن سے کھڑی ہوگئی تھی۔
نقش کی پُرشوق اور محبت بھری نظریں حوری پر تھیں۔ آج بھی اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں کی دو سینگ نما چوٹیاں بنی ہوئی تھیں۔ ماں کے پکارنے سے پہلے ہی وہ ان کی طرف آ گئی تھی۔
''حوری' بیٹا ان سے ملو! یہ دونوں آنٹیاں آپ سے ملنے آئی ہیں۔'' غزالہ نے کہا۔
حوری اعتماد اور بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہاتھ ماہم کی طرف بڑھاتے ہوئے' بڑی خوبصورت ادا سے کہا۔ ''میرا نام حورالعین ہے۔ سب حوری کہتے ہیں۔''
''اوہ...... کیوٹ گرل۔'' ماہم نے ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا گال چھوا۔ اور اسی کے انداز میں کہا۔ ''میرا نام ماہم ہے' مگر گھر والے اور خاص دوست مونی کہتے ہیں۔ آپ کی میں' مونی آنٹی ہوں۔''
''مونی آنی'' حوری نے زیرِ لب دہرایا۔ پھر وہ' نقش کی طرف متوجہ ہوئی۔
اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نقش نے بے اختیار اسے آغوش میں لے کر اس کے پھولے پھولے گال چومے تھے اور پھر اسے گود میں بٹھالیا۔
بے تکلفی کے اس مظاہرے پر حوری قطعی بے چین و پریشان نہیں ہوئی تھی۔ جاننے والے اکثر ایسے ہی اسے بے ساختہ پیار کر بیٹھتے تھے۔ وہ بے تکلفی سے نقش کی گود میں براجمان رہی۔
نقش نے کہا۔ ''بھئی' میں آپ کی نقش آنٹی ہوں۔ سارے مجھے نقش ہی کہتے ہیں۔''
اس کے اس انداز پر ماہم کھل کر ہنسی تھی۔ البتہ غزالہ صرف مسکرا کر رہ گئی تھیں۔
حوری نے حیرت انگیز طور پر اس کا درست تلفظ کے ساتھ نام دہرایا۔ ''نقش آنی۔''
نقش اور ماہم نے حوری کی گورنس سے بھی رسمی جملوں کا تبادلہ کیا تھا۔
ہیکل' حوری کی طرف آیا تو اس نے ڈپٹا۔ ''وہاں جا کر کُشن پر بیٹھو۔'' اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''چھ بجے سے پہلے کھانا نہیں ملے گا۔ ابھی کارٹون دیکھو۔''
ہیکل حیرت انگیز طور پر کُشن پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔
حوری کا اعتماد دیدنی تھا۔ وہ اپنی گورنس سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ' ہیکل کو ٹام اینڈ جیری لگا دیں۔''
گورنس نے تعمیل کی۔ ریموٹ کی مدد سے اس نے سامنے دیوار میں نصب بڑی اسکرین والا ایل سی ڈی ٹی وی آن کیا' اور چینل بدل کر مشہورِ زمانہ کارٹون ٹام اینڈ جیری لگا دیے۔
نقش اور ماہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ ہیکل پوری دلچسپی سے چوہے اور بلے کی بھاگ دوڑ دیکھنے لگا تھا۔
غزالہ اچانک کھڑی ہوگئیں۔ ''میں شام کی چائے اگر وقت پہ پیتی ہوں آپ لوگوں کو کم از کم چائے تو پینا پڑے گی۔'' اس دفعہ ماہم اور نقش بے بس ہوگئیں۔

''میں چائے لگواتی ہوں۔ آپ اتنی دیر حوری سے باتیں کریں۔''
''حوری اور ہیکل کی کمپنی بے حد دلچسپ ہے۔'' ماہم نے کہا تو غزالہ مسکراتے ہوئے لاؤنج سے باہر نکل گئیں۔ حالانکہ وہ چائے کے لیے حوری کی گورنس سے بھی کہہ سکتی تھیں مگر ان کی مروت اور اچھے اخلاق نے گورنس کو ملازمہ کا درجہ دینے سے روک دیا تھا۔
نقش' حوری کی طرف متوجہ تھی۔ اس نے غیر محسوس طور پر حوری کی سینگ نما چوٹیوں کو ہونٹوں سے چھوا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ کوئی اور بھی تو ان چوٹیوں کو چومتا تھا۔
''آپ اپنے بال لمبے کیوں نہیں رکھتیں حورالعین؟'' نقش نے اسے پورے نام سے مخاطب کیا تھا۔
''میرے چاچو کو میرے بال ایسے اچھے لگتے ہیں۔ وہ مجھے شینگوں (سینگوں) والی بلی بھی کہتے ہیں۔'' اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''اس لیے میں بال بڑے نہیں ہونے دیتی۔'' پھر وہ اپنے کندھوں پر جھکے نقش کے لمبے' گھنیرے بالوں کی طرف متوجہ ہوئی۔
''آنی! آپ کے بال کتنے لمبے اور پارے (پیارے) ہیں۔'' وہ نقش کی گود سے اتر کر سیدھی ہوئی اور اس کے بالوں کو چھونے لگی۔
حوری کی گورنس بظاہر ٹی وی کی طرف متوجہ تھی۔ اس نے اسکرین کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصے پہ بے آواز نیوز چینل لگا لیا تھا۔
حوری کے اس انداز پر قریب بیٹھی ماہم کو بھی پیار آیا تھا۔ اس نے جھک کر حوری کا گال چوما۔ ''آپ کی آنی کے بال ہی نہیں یہ خود بھی بہت پیاری ہیں۔'' اس کی آواز دھیمی ہوگئی۔ ''آپ انہیں اپنے پاس گھر میں رکھ لیں۔''
''آ...... ٹیک (ٹھیک) ہے۔'' حوری فوراً رضامند ہوگئی۔
نقش نے گھور کر ماہم کو دیکھا۔ وہ شوخی سے مسکرا رہی تھی۔
حوری اچانک چونکی۔ اس کی نظریں ٹی وی کے عین اوپر نصب دیوار گیر گھڑی کی طرف گئیں۔ وہ یکلخت ہی ان دونوں سے بے پروا نظر آنے لگی تھی۔
''چاچو کو فون کرنے کا ٹائم ہوگیا ہے۔'' وہ لاؤنج سے باہر کی طرف بھاگی۔ ہیکل نے اسے بھاگتے دیکھا تو کارٹون چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگا۔
کچھ دیر بعد حوری واپس آئی تو بلیوں کی خوراک کا ڈبا' ایک بڑا پیالہ اور ایک قیمتی سیل فون بہ مشکل اٹھائے ہوئے تھی۔ اس نے پہلے ہیکل کو خوراک دی پھر سیل فون پر اپنے چاچو سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔
گورنس غالباً کسی کام کی وجہ سے اٹھ کر باہر چلی گئی تھی۔
نقش اور ماہم قدرے آزادی اور پوری توجہ سے حوری کی طرف متوجہ تھیں۔ جو اپنے چاچو کو اپنے سارے دن کا احوال سنا رہی تھی۔ اسے ابھی باقاعدہ اسکول میں داخل نہیں کیا گیا تھا وہ گھر ہی میں گورنس سے پڑھ رہی تھی۔
حوری کے معصومانہ احوال میں اپنے تازہ سبق کا ذکر تھا' ہمسائیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر تھا' مما کی ڈانٹ اور ہیکل کی بھوک کا احوال تھا' اور آخر میں دو آنیوں' کا بھی ذکر تھا جن میں سے ایک کے بال بہت لمبے تھے۔ پھر ایک خیال آنے پر اس نے کہا تھا۔ ''چاچو! بڑے بالوں والی آنی کہتی ہیں کہ میں بھی اپنے بال لمبے کر لوں۔''

دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا وہ اسے بغور سن رہی تھی۔

نقش کے لیے یہ احساس بڑا سنسنی خیز تھا کہ ان چچا' بھتیجی کے درمیان اس کا بھی ذکر ہو رہا تھا۔

شامیر نے بھی غالباً بڑے بالوں والے آئیڈیے کو پسند کیا تھا' حوری کے پھولے گال کچھ اور پھول گئے۔ "پھر میں' آپ کی شینگوں والی بلی تو نہیں بن سکوں گی۔"

دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد وہ فوراً مطمئن ہو گئی۔ "ٹھیک ہے' بڑے بالوں والی بلی بھی ٹھیک ہے۔"

زیر تربیت کیڈٹ کی حیثیت سے شامیر کے پاس زیادہ ٹائم نہیں تھا۔ اس کا شیڈول خاصا ٹائٹ تھا۔ اس لیے یہ گفتگو جلد ہی ختم ہو گئی۔

البتہ حوری نے اپنی اور ریکل کی ایک مشترکہ تصویر بڑی مشاقی سے اتار کر اپنے چاچو کو سینڈ کر دی تھی۔ چار سال کی عمر میں اس کی استعداد حیرت انگیز تھی۔

فون بند کر کے وہ دوبارہ سے ان دونوں کی طرف آئی۔ نقش نے اسے گود میں بٹھایا تو اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔

ماہم نے اس کے ہاتھ سے سیل فون لیتے ہوئے کہا۔ "کتنا پیارا سیل ہے۔"

حوری نے فوراً فخریہ انداز میں کہا۔ "یہ میرا ہے مجھے چاچو نے گفٹ کیا تھا۔"

نقش نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ "بالوں کے متعلق چاچو سے کیا بات ہوئی؟"

حوری پر جوش ہو گئی۔ "چاچو نے کہا ہے' میں بال بڑے کر لوں۔ وہ مجھے بڑے بالوں والی بلی کہہ لیں گے۔"

اسی وقت ایک ملازمہ نے آ کر مداخلت کی اور چائے لگنے کی اطلاع دی۔

ماہم نے سیل فون دوبارہ سے حوری کو تھما دیا۔ اس کی نگاہیں نقش سے ملیں تو اس نے معنی خیز اشارہ کیا۔ نقش کا دل دھڑک اٹھا۔ ماہم نے شامیر کا نمبر پار کر لیا تھا۔

اچانک ہی نقش کی خیالی رو پلٹی۔ وہ واپس اپنے یخ بستہ خیمے میں آ گئی۔ مگر اس کے ذہن کی اسکرین پر ابھی بھی شامیر کے ڈرائنگ روم والی تصویر اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔

نقش نے آنکھیں بند کر کے تصور کو زیادہ جاندار بنایا۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک دلدوز آہ نکلی۔ نہ جانے وہ اپنے خیمے میں کیا کر رہا ہوگا۔ اس کی نیندیں اڑانے والا سو رہا ہوگا یا اس کی طرح جاگ رہا ہوگا۔

❁......❁......❁

شامیر نے حوری کی تصویروں والا فولڈر بند کیا۔ شاید بے خیالی میں اس کی انگلی اسکرین سے چھو گئی تھی فوراً ہی ان باکس کھل گیا تھا جہاں درجنوں کسی اجنبی لڑکی کے میسج موجود تھے۔ خوبصورت الفاظ' مرصع شاعری اور گھٹیا جذبات سے کوسوں دور یہ میسج اسے گزشتہ چند ماہ سے باقاعدگی سے موصول ہو رہے تھے۔ یہاں کسی سیلولر کمپنی کا نیٹ ورک نہ ہونے کی وجہ سے یہ سلسلہ رکا ہوا تھا۔

شامیر نے کبھی رپلائے کیا تھا اور نہ ہی بیک ٹو کال کی تھی مگر وہ الجھن کا شکار ضرور رہا تھا۔ کسی لڑکی کے اس کی زندگی میں آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اس کا خواہش مند تھا۔ اس لیے اس نے ان میسجز کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ البتہ پرانے زخم پھر سے تازہ ضرور ہو گئے تھے۔

آئی فون آف کر کے سونے کی غرض سے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ بہت دور کہیں ایوالانچ آیا تھا وا[illegible] برف کے سرکنے اور برفانی تودوں کے لڑھکنے کی مدہم مگر ہیبت ناک آواز دلوں پر لرزہ طاری کر رہی تھی۔ اس نے آیت الکرسی پڑھی اور اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور پھر نیند کی گہری وادیوں میں اترتا چلا گیا۔

❁......❁......❁

اگلے دن کا کرنل سلیم کا لیکچر حفاظتی انتظامات کے متعلق تھا۔ اس کے بعد الفا...... ون اور ٹو کو دوبارہ "چیلو۔ ٹو" کے گرد چکر لگانے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس دفعہ ان کے ساتھ رہنما نہیں تھے۔ حسب سابق ایک گروپ کو حنظلہ اور دوسرے کو نقش لیڈ کر رہی تھی۔

اس دفعہ انہیں جی' پی' آر' ایس مہیا کیے گئے تھے۔ یہ جدید ترین سہولت بھی حال ہی میں میسر آئی تھی۔ جی' پی' آر' ایس یا گلوبل پوزیشنگ سسٹم' سیٹلائٹ سے منسلک تھے۔ اس کے ذریعے کرۂ ارض پر کسی بھی جگہ اپنی درست ترین پوزیشن دیکھی جا سکتی تھی۔ آرمی کے قابل فخر الیکٹرونک انجینئرز نے اس آلے میں کچھ کارآمد تبدیلیاں کی تھیں اب اس کے ذریعے ہیڈ کوارٹر یا سب ہیڈ کوارٹر کو ے ڈے (ایمرجنسی مدد) کا پیغام اپنی درست ترین پوزیشن کے ساتھ بھیجا جا سکتا تھا جس کے سبب ریسکیو مشن سرعت کے ساتھ مدد کے طلب گار افراد تک پہنچ جاتا تھا۔

دونوں گروپس واپس لوٹے تو کل کے مقابلے میں وہ بیس اور پچیس منٹ جلدی پہنچے تھے۔ نقش کے الفا ٹو کو ون پر پانچ منٹ کی برتری حاصل تھی اور تھکن بھی کل کے مقابلے میں کم تھی۔ یا شاید جوش کے سبب انہیں تھکن محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ آج ہفتہ کی رات اور کل کا دن صرف اور صرف انہی کا تھا۔ [illegible] کی پابندی اور وقت کی بندشوں سے آزاد۔

شاید یہی وجہ تھی کہ کرنل سلیم نے رات کا کھانا کھاتے ہی "آفیسرز میس" چھوڑ دیا تھا کھانے کا بھی خصوصی انتظام تھا۔ منجمد حالت میں لائی گئی ٹراؤٹ مچھلی پکائی گئی تھی لیکن یہ صرف چکھنے کے لیے تھی۔ پیٹ بھرنے کے لیے نہیں۔ ٹراؤٹ مچھلی میں کانٹے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ کرن آرمی جوائن کرنے سے پہلے ہر سال شمالی علاقوں میں کیمپنگ کرتی رہی تھی۔ اسے ٹراؤٹ کھانے کا وسیع "تجربہ" تھا۔ اس نے اپنے حصے میں آنے والے دونوں ٹکڑے جلد ہی چٹ کر لیے تھے۔ پھر اس نے کن انکھیوں سے شامیر کی طرف دیکھا جو کانٹوں سے الجھ رہا تھا۔

"لاؤ شامیر! میں کانٹے نکال دوں۔" اس نے بڑے پرخلوص انداز میں پیش کش کی۔

شامیر چونکا۔ "نہیں...... شکریہ۔ میں نکال لوں گا۔" اس نے قدرے بے رخی سے کہا۔

کئی ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑی تھی۔ شجاع تو ہلکے سے کھنکھارنے سے بھی باز نہیں آیا تھا۔ کرن بری طرح کھسیا گئی تھی۔

نقش فوراً اس کی مدد کو آئی۔ "یار! میری ٹراؤٹ حاضر ہے۔ اس کے کانٹے چن دو۔"

کرن نے موقع غنیمت جانا اور نقش کی طرف گھوم گئی۔

نقش نے شامیر کی طرف دیکھا جو پوری توجہ سے کانٹے نکالنے میں مشغول تھا۔ حنظلہ کے حلق میں احتیاط کے باوجود کانٹا چبھا تو اس نے پلیٹ میں موجود باقی ماندہ مچھلی دور ہٹائی اور بڑبڑایا۔

"شاید اس لیے کمانڈر صاحب نے اس کو ہاتھ نہیں لگایا۔" پھر اس نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "ہے کوئی میرے حصے کی ٹراؤٹ کھانے والا۔"

اسی وقت زپ نیچے ہوئی اور اے' ڈی کی

گردن خیمے میں داخل ہوئی۔ ''جی صاحب! یہ ناچیز حاضر ہے۔''

شجاع نے فوراً ٹانگ اڑائی۔ ''نہیں میں نے آج تمہاری توند ملاحظہ کی ہے۔ اس میں مزید ٹراؤٹ ٹھونسنا فاقہ زدہ سپاہیوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ میں نے ان برف زاروں میں پہلی دفعہ توند والا سپاہی دیکھا ہے۔''

اے ڈی نے فہمائشی دانت نکال دیئے۔

حظلہ کی پلیٹ دو ہاتھوں سے ہوکر اے ڈی تک پہنچ گئی۔

شجاع نے کہا۔ ''کمانڈر صاحب کے دل کو جانے والا راستہ بھی یقیناً پیٹ سے ہوکر جاتا ہے۔ اس لیے تم بچے ہوئے ہو۔ ورنہ چلوٹو کا روزانہ ایک چکر تمہیں بھی لگانا پڑتا۔''

ٹراؤٹ مچھلی کے بعد انہیں سوپ پیش کیا گیا۔ اس کے بعد میدے کی بنی میٹھی اور گرم گرم ٹکیاں آ گئیں۔ جنہوں نے بہت مزہ دیا تھا۔

نقش محسوس کررہی تھی کہ کرن کو چپ سی لگ گئی تھی۔ مگر وہ کیا کرسکتی تھی۔ شاید اس کے ''مرض'' کا مناسب علاج یہی تھا پھر بھی پہلی دفعہ اسے شامیر پر غصہ آیا۔ وہ کسی معقول بہانے یا نرمی سے بھی انکار کرسکتا تھا اور کانٹے نکلوا بھی لیتا تو کیا تھا پھر شامیر کی ٹریجڈی کا سوچ کر غصہ قدرے مدھم ہوا مگر ختم نہیں ہوا۔ ایک لڑکی کے کیے کی سزا وہ ساری دنیا کی لڑکیوں کو دینے پر تلا ہوا تھا۔ یہ صریح انتہا پسندی تھی۔ پھر خود ہی وہ اپنی سوچ پر حیران رہ گئی۔ وہ پہلی دفعہ شامیر کے بارے میں تلخی سے سوچ رہی تھی۔ ورنہ وہ تو اس کے خیالات ''بدلنے'' کے مشن پر نکلی تھی جس میں ابھی تک اسے ذرا بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ قہوہ انہوں نے قدرے تاخیر سے پیا۔ اس دوران کاشف نے نقش پر بھرپور نگاہ ڈالی تو نقش نے تیوری چڑھا کر جواباً اسے گھورا۔ کاشف گھبرا گیا اور دوبارہ اسے ایسی نظر ڈالنے کی جرات نہیں ہوئی۔

وہ آفیسرز میس سے باہر نکل آئے۔ موسم آج قدرے بہتر تھا۔ ہوا بھی مدھم تھی اور آسمان پر بادل بھی ہلکے تھے۔ کہیں کہیں تو ستارے بھی نظر آرہے تھے۔ اس بلندی سے ستارے زیادہ واضح اور چمکدار نظر آرہے تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سپاہیوں نے ایک شامیانہ کھڑا کر کے اس کے نیچے ''کیمپ فائر'' کا زبردست اہتمام کیا ہوا تھا۔ یہ بات اچنبھے کا باعث تھی کہ انہوں نے جلانے کے لیے خشک لکڑی کہاں سے حاصل کرلی۔ بعد میں پتا چلا کہ برف کے نیچے دبی جھاڑیاں اس مقصد کے لیے استعمال کی گئی تھیں۔ ان گیلی جھاڑیوں کے نیچے بہ یک وقت کئی ''فیول ٹیبلٹ'' جلائی گئی تھیں۔ جن کے سبب انہوں نے پہلے سلگ کر پھر آخر کار آگ پکڑ ہی لی تھی۔ فیول ٹیبلٹس، مخصوص قسم کی ایندھنی گولیاں تھی۔ جو آگ دکھائے جانے پر ایک خاص وقت تک جلتی رہتی تھیں۔ اکثر ان سے کیمپ سے دور رات گزارنے والے ''ٹروپس کھانا اور چائے وغیرہ بنانے کا کام لیتے تھے۔

کرن تو سر درد کا بہانہ بنا کر اپنے خیمے میں چلی گئی۔ دیگر پانچوں آگ کی طرف بڑھے۔ قریب جانے پر اندازہ ہوا کہ آگ ایک اونچے پتھر کو برف سے صاف کر کے اس پر جلائی گئی تھی۔

پاکستان کی مختلف چھاؤنیوں سے بلند اور برفیلے علاقوں میں ریکی کی تربیت لینے کی غرض سے آنے والے سپاہیوں نے اپنے زیر تربیت افسران کا خوشدلی اور ادب سے استقبال کیا تھا اور انہیں بیٹھنے کے لیے آگ کے قریب جگہ دی تھی۔ ٹھٹھرتی سردی میں آگ کی قربت بہت بڑی نعمت تھی۔ انہوں نے یہاں آنے کے بعد پہلی دفعہ اپنے ہاتھ دستانوں سے نکالے اور انہیں آگ کے قریب کردیا۔

ان کی موجودگی کے سبب کچھ دیر تو سپاہی تکلف کا مظاہرہ کرتے رہے۔ خاص طور پر ایک خاتون زیر تربیت آفیسر کی وجہ سے انہیں چپ لگ گئی تھی۔ اس بات کو محسوس کر کے نقش نے خود ہی ان لوگوں سے پہلے تعارف اور پھر ہلکی پھلکی باتیں کیں تو ان کی جھجک دور ہونے لگی۔

ایک سپاہی نے دوسرے کو اونچی آواز میں مخاطب کیا۔ ''اوئے چانڈیو! چل اب شروع ہوجا۔ بہت دن ہوگئے ہیں تیری سریلی آواز کو سنے ہوئے۔''

اے ڈی بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے فوراً ایک لوہے کا تسلا اپنے سامنے کرلیا۔ اس کا مطلب تھا، گانے بجانے کا پروگرام پہلے سے طے تھا۔

چانڈیو نامی سپاہی، افسران کی موجودگی کے سبب اس فرمائش پر جھینپ سا گیا تھا مگر شجاع تو فوراً ہی اس کے سر ہوگیا تھا۔ نقش وغیرہ نے بھی اسے فورس کیا۔

کچھ دیر کے تذبذب کے بعد چانڈیو گانے کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ اے ڈی نے تسلے پر بڑے ماہرانہ انداز میں تال دی۔ چانڈیو نے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور سر کھینچا۔ رفتہ رفتہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ اے ڈی کی انگلیاں بھی آواز کے ہم آہنگ ہوگئیں۔

یہ ایک سندھی لوک گیت تھا۔ جس میں سندھ کی دھرتی پر بہنے والی سندھو ندی کا ذکر تھا۔ ان ملاحوں کا جو اپنی کشتیاں کھیتے ہوئے اونچی تانیں لگاتے تھے۔ ندی کے کنارے بسنے والے ایک گاؤں کا، جہاں رنگی چنریوں والی لڑکیاں ایک سرخ چنری والی کو دوبارہ ہنسنے بولنے پر مجبور کرنے کی کوشش میں ... اس سرخ چنری والی لڑکی کا محبوب کسی دور دراز

کی زمینوں کی طرف چلا گیا تھا۔ جس کی یاد میں وہ کونج کی مانند کرلاتی تھی۔

اس سرخ چنری والی لڑکی کے احساسات تھے جس نے اپنے محبوب کو اس طویل سفر سے روکنے کی غرض سے جو کچھ کہا تھا اس کا مفہوم تھا کہ ملے (ایک قدیم شہر کا نام) کی طرف نہ جاؤ' وہ بہت دور کا سفر ہے۔ جہاں جانے والے لوٹ کر کم ہی آتے ہیں۔

چانڈیو کی پرسوز تانوں نے سماں باندھ دیا تھا۔ شجاع کے علاوہ بھی سندھی سے نابلد تھے۔ مگر سندھی یکسر اجنبی زبان بھی نہیں تھی۔ انہیں کچھ نہ کچھ سمجھ آ ہی رہی تھی۔ جتنا کچھ سمجھ آ رہا تھا۔ وہ انہیں مبہوت کرنے کے لیے کافی تھا۔ شجاع البتہ پوری طرح لطف اندوز ہو رہا تھا اور مسلسل سر دھن رہا تھا۔

آسمان مزید صاف ہو گیا تھا۔ چانڈیو کی تانوں نے جیسے کچھ دیر ہوا کو بھی رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ سطح سمندر سے چودہ ہزار فٹ کی بلندی پر ستاروں سے روشن اس رات کو شامیانے کے نیچے جلنے والی آگ اور اس آگ کے گرد اپنے پیاروں سے سیکڑوں میل دور وطن کے ان رکھوالوں میں سے کئی کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ یہ وہ تھے جو اپنے پیچھے سرخ چنریوں والیاں چھوڑ کر آئے تھے۔

چانڈیو کی آواز نے کیمپ کمانڈر کرنل سلیم کو بھی اپنے خیمے میں سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر چانڈیو خاموش ہو گیا تھا دیگر افراد کھڑے ہو گئے تھے۔

کرنل سلیم نے مسکراتے ہوئے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چانڈیو کو گانے کے لیے کہا۔ اس نے خود بیٹھنے سے انکار کر دیا تھا۔ چانڈیو نے نئے جوش سے تان کھینچی۔ کرنل سلیم کچھ دیر کھڑے رہ کر آگ پر ہاتھ تاپتا رہا اور چانڈیو کی آواز سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پھر لوک گیت ختم ہو گیا اور کرنل سلیم نے اپنے خیمے کا رخ کیا۔ اس سے پہلے دیگر افراد کی طرح اس نے بھی تالیاں بجا کر چانڈیو کو داد دی تھی۔

کرنل سلیم کے جانے کے بعد شجاع نے باقاعدہ اٹھ کر چانڈیو کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ "یار! تمہارا منہ داڑھی اور مونچھوں میں چھپا ہوا نہ ہوتا تو میں تمہارا منہ چوم لیتا۔"

اس بات پر زوردار قہقہہ پڑا تھا۔ نقش مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسے کھڑا ہوتے دیکھ کر کاشف نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ حنظلہ بولا۔ "تم کہاں چل دیں۔ ابھی تو محفل پوری طرح سے جمی بھی نہیں۔"

"ابھی آتی ہوں۔ کرن کا پتا کر لوں۔ اس کے سر میں درد تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے شامیر کی طرف دیکھا جو ایک سپاہی سے محو گفتگو تھا۔ اس کے چہرے پر ازلی بے نیازی طاری تھی۔

شجاع نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "مجھے تو نہیں لگتا اس کے "درد" میں کوئی افاقہ ہوا ہو۔"

نقش نے اسے گھور کر دیکھا جبکہ کاشف اور حنظلہ کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

نقش اپنے اور کرن کے مشترکہ خیمے کی طرف بڑھ گئی۔ آگ پر چند گیلی لکڑیاں ڈال دی گئی تھیں جس کے سبب تیزی سے دھواں اٹھنے لگا تھا۔

شامیر سپاہی سے فارغ ہوا تو اس کے قریب موجود کاشف نے انگریزی میں کہا۔ "تمہیں' کرن کی پیش کش کو اتنے برے انداز میں مسترد نہیں کرنا چاہیے تھا وہ بیچاری تم میں دلچسپی لے رہی ہے۔"

شامیر کی پیشانی پر ناگواری کی شکن پڑ گئی۔ اس نے سرد انداز میں کہا۔ "میرا ردعمل مناسب تھا۔ ملکی وسائل جھونک کر ہمیں یہاں عشق و محبت کا کھیل کھیلنے کے لیے نہیں بھیجا گیا۔ میں اپنی "مچھلی" اور "زہرہ" کے کانٹے خود چن سکتا ہوں۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں خاص طور پر کسی لڑکی کی۔" اس نے بھی انگریزی میں جواب دیا تھا۔

کاشف نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "یار! میں محسوس کر رہا ہوں تم لڑکیوں سے الرجک ہو۔ میں نے ایک دفعہ بھی تمہیں خود سے نقش یا کرن سے مخاطب ہوتے نہیں دیکھا۔ کیا میں وجہ جان سکتا ہوں؟" آخری فقرہ اس نے بڑے گمبھیر انداز میں کہا تھا۔

شامیر بھرپور کوشش کرتا تھا کہ وہ اپنے رویے سے خود کو نارمل ہی ظاہر کرے۔ مثلاً یہاں اس کا بیٹھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے باوجود لڑکیوں کے معاملے میں اس کے گریز والے رویے کو محسوس کر لیا جاتا تھا۔ کئی ساتھی اس بارے میں اس سے استفسار کر چکے تھے مگر وہ ٹال جاتا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے کاشف کو ٹالنے کے لیے کہا۔

"تمہارا وہم ہے۔ اگر ایسا ہے بھی سہی تو اس کا جواب میں پہلے دے چکا ہوں۔"

مطمئن نہ ہونے کے باوجود کاشف خاموش ہو گیا تھا۔

نقش خیمے میں داخل ہوئی تو حسب توقع کرن آنسو بہا رہی تھی۔ نقش نے اسے ساتھ لگا لیا۔ ہمدرد کندھا میسر آتے ہی کرن کے آنسوؤں کی رفتار بڑھ گئی۔ نقش نے اس کی ٹوپی درست کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں ایک کٹھور کے لیے اتنے قیمتی آنسو ضائع کر رہی ہو۔"

وہ زیادہ شدت سے رونے لگی۔ نقش نے بھی اسے رونے دیا۔ اس کی شامیر کے لیے جذباتیت آنسوؤں کے راستے نکل جاتی تو اچھا ہی تھا۔

کچھ دیر بعد کرن نے اپنے آنسو یونیفارم کی وردی کے ساتھ آستین سے مسل دیے اور دھیرے سے بولی۔ "اس کے سینے میں دل نہیں پتھر رکھا ہے۔ اس کا رویہ صحت مندانہ نہیں ہے۔ کبھی کبھی وہ' مجھے ذہنی بیمار لگتا ہے۔"

نقش نے ایک چھوٹے تولیے سے اس کا چہرہ صاف کیا اور سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "وہ جو اور جیسا ہے' اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ایسے لوگوں کا بہترین علاج یہی ہے کہ انہیں مکمل طور سے نظر انداز کر دو۔"

"اب یہی کروں گی۔" کرن نے ایک عزم سے کہا۔

نقش نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ "اٹھ جاؤ...... ایک کٹھور دل کی وجہ سے یہ یادگار رات ضائع نہ کرو۔" کرن کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اس کے ساتھ کیمپ فائر میں شرکت پر رضامند ہو گئی۔

ان دونوں کو آتا دیکھ کر شجاع نے کہا۔ "جلدی سے آ جاؤ بھئی' دراصل جوان اپنے جونیئر افسران سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔"

"کس چیز کا مقابلہ؟" نقش نے پوچھا۔

"گیتوں کا...... ایک گیت ادھر سے آئے گا اور دوسرا ادھر سے۔"

سپاہیوں نے بڑے پرجوش انداز میں تالیاں بجائیں۔

نقش سمجھ گئی کہ یہ شرارت شجاع کی تھی۔ مگر اس سے مفر بھی نہیں تھا۔ پھر وہ یہ سوچ کر پرجوش ہو گئی کہ دیکھیں...... شامیر کیا سناتا ہے۔

مقابلہ فوراً ہی شروع ہو گیا۔ ٹاس افسران کی ٹیم ہار گئی۔ سو پہلا گیت انہیں سنانا پڑا۔ ساروں نے کھینچ کھانچ کر شجاع کو آگے کیا۔

شجاع نے عطاء اللہ خان نیازی کی گائی ایک

اردو غزل "اے لحد اپنی مٹی سے کہہ دے" کے چند اشعار عطاء اللہ کے انداز میں گا کر سنائے۔

شجاع پر زبردست ہوٹنگ ہوئی تھی۔ ہوٹنگ کی ابتدا کرنے والے اس کے ساتھی تھے۔ دیگر بعد میں شریک ہوئے۔ مگر عطاء اللہ کے انداز کی کاپی اس نے زبردست کی تھی جس کے سبب ہنس ہنس کر ان لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ گئے تھے۔

ابتدا میں کرن کھنچی کھنچی سی رہی تھی۔ پھر وہ بھی نارمل ہوگئی۔

اب سپاہیوں کی باری تھی۔ چانڈیو مورچہ سنبھال چکا تھا۔ اے ڈی کی انگلیاں تسلے پر متحرک ہوچکی تھیں کہ ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ شامیر کی طرف سے فرمائش ہوئی تھی۔

"چانڈیو! کچھ اردو سناؤ یار۔"

کان پر دھرا چانڈیو کا ہاتھ واپس آ گیا۔ چند لمحے وہ سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ "ٹھیک ہے صاحب!" پھر اس نے مدہم آواز میں اے ڈی کو غالباً تسلا بجانے کے حوالے سے کوئی ہدایت دی۔ اس کے بعد منی بیگم کی گائی شہرۂ آفاق نظم "اک بار مسکرا دو" چھیڑی۔

پسندیدگی کے اظہار کے طور پر تالیاں بجیں۔ شامیر کا انداز زیادہ پرجوش تھا۔ نقش کے سینے میں بھی میٹھی سی کسک جاگی تھی۔ یہ نظم اس کی پسندیدہ ترین تھی۔

چانڈیو کو نظم پوری یاد تھی حسب سابق اس نے سماں باندھ دیا تھا۔ خاص طور پر جب اس نے یہ بند پڑھے۔

ہونٹوں کی مسکراہٹ
بیچو خرید لوں گا
منظور ہے تو بولو
اَن مول دام دوں گا
......لیکن اک بار مسکرا دو!

اتنی تالیاں اور داد و تحسین کا شور بلند ہوا کہ کرنل سلیم کو اپنے خیمے سے باہر جھانکنا پڑا۔ چند لمحے جائزہ لینے کے بعد مسکراتے ہوئے اس نے خیمے کی زپ بند کرلی۔ خیمے کے اندر جلنے والی لائٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کام میں مصروف ہے۔ نقش نے کن انکھیوں سے جائزہ لیا تھا۔ شامیر نظم کے ہر ایک بند سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ غالباً اسے بھی یہ نظم بے حد پسند تھی۔ افسران کی باری پر کاشف نے عاطف اسلم کا "کچھ اس طرح تیری پلکیں، میری پلکوں سے ملا دے" سنایا۔ اس کی آواز خاصی اچھی تھی۔

سپاہیوں کی جانب سے ایک چکوالی نے ماہیے سنائے۔ افسران کی باری پر شجاع نے شامیر کا نام لیا تو بھی اس کے ہمنوا ہوگئے۔ کرن البتہ خاموش رہی تھی۔ نقش کو اپنی دھڑکنیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ مفر، مشکل تھا۔ سو شامیر کو کچھ سنانا ہی پڑا۔ اس نے "تارے ڈوب گئے نے...... رات مک گئی ہے" سنایا۔ اس کی آواز درد اور نغمگی لیے تھی۔ ابتدائی جھجک کے بعد اس نے بڑا ڈوب کر گایا تھا۔

نقش نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات قابو رکھے تھے۔ نہیں تو اس کا جی چاہ رہا تھا کہ آنکھیں بند کرلے اور اس کی آواز کے سحر میں کھو جائے۔

چانڈیو کے بعد سب سے زیادہ داد شامیر کو ملی تھی۔ نقش نے محسوس کیا کہ گانے کے بعد شامیر کچھ مغموم سا ہوگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی سرخی اتر آئی تھی۔ شاید اس گانے کے حوالے سے کچھ پرانی یادیں اور زخم تازہ ہوگئے تھے۔

یہ سلسلہ جاری رہا پھر نقش کی باری آ گئی۔ وہ کالج کے دنوں میں اچھا گاتی رہی تھی۔ اور اس بات کو بمشکل سال بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے پراعتماد آغاز کیا اور امراؤ جان ادا کی ایک غزل سنائی۔

یونہی کوئی مل گیا تھا سرِ راہ چلتے چلتے

جب اس نے یہ شعر گایا۔

شبِ انتظار آخر کبھی ہوگی مختصر بھی ......!!
یہ چراغ بجھ رہے ہیں میرے ساتھ جلتے جلتے

تو اس نے محسوس کیا تھا کہ شاید پہلی دفعہ شامیر نے محض ایک لمحے کے لیے بغور اس کی طرف دیکھا تھا۔ ورنہ وہ سر جھکائے رہا تھا۔ مگر اس کے ردھم میں ہلتے پاؤں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ غزل میں ڈوبا ہوا ہے۔

نقش کو بے پناہ داد ملی تھی۔ تالیوں کا شور مدھم ہوا تو شجاع نے کہا۔

"خاتون! اس داد سے آپ کو زیادہ پھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ رعایتی نمبروں کے ساتھ حوصلہ افزائی ہے۔"

نقش نے فوراً جواب دیا۔ "بے شک زیادہ مارکس بلکہ پہلی پوزیشن تو تم نے لی تھی۔" اس کا اشارہ شجاع پر ہونے والی ہوٹنگ کی طرف تھا۔

اس جواب پر کئی ہونٹ مسکرا اٹھے تھے۔ جبکہ شجاع اپنا ٹوپی پوش سر کھجانے لگا تھا۔

کرن نے اپنی باری پر سریلی اکھیوں والے "سنا ہے تیری اکھیوں سے، بہتی ہیں نیندیں اور نیندوں میں سپنے" سنایا تھا۔ محفل کے اختتام پر چانڈیو سے کچھ سنانے کی پرزور فرمائش ہوئی۔

چانڈیو نے پھر ایک سندھی لوک گیت سنا کر میلہ لوٹ لیا اور اس کے ساتھ ہی یہ یادگار محفل اختتام کو پہنچی تھی۔ آگ بجھ چکی تھی۔ ہر کسی نے اپنے خیمے کا رخ کیا تھا۔

سلیپنگ بیگ میں گھسنے کے بعد کرن نے توصیفی انداز میں کہا۔ "تم گاتی بہت اچھا ہو اور محفل میں نے بااعتماد بھی ہے۔"

"ہوں...... میں کالج کے فنکشنز اور دوستوں کی بہنوں اور بھائیوں کی شادیوں، مہندیوں پر گاتی رہی ہوں۔" پھر اس نے نگاہیں ترچھی کیں۔ "ویسے" سریلی اکھیوں والے "تم نے شامیر کے لیے گایا تھا نا؟"

کرن کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر ٹھہر گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ "ویسے مجھے اسی گانے کے زیادہ بول یاد تھے۔" پھر اس نے جلے کٹے انداز میں کہا۔ "ویسے اس کے لیے تو" کج رو اکھیوں والے" گانا چاہیے تھا۔"

اس کے اس انداز پر نقش بے اختیار ہنسی تھی کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ سو گئیں۔

نہیں، سوئی صرف کرن تھی۔ ہمیشہ کی طرف نقش کی آنکھوں میں تو اس ساحر کے حوالے سے یادوں کا میلہ سج گیا تھا۔ شامیر کی بھابی غزالہ کے محبت آمیز رویے نے خصوصاً نقش کو بہت متاثر کیا تھا۔ پہلی دفعہ نقش اور ماہم کو رخصت کرتے ہوئے انہوں نے ان سے دوبارہ آنے کا وعدہ لیا تھا۔

چند دن بعد وہ پھر پہنچ گئیں۔ اس کے بعد نقش نے کبھی کبھار اکیلا جانا بھی شروع کردیا۔ ایک دفعہ غزالہ بھی حوری سمیت ان کے گھر آئی تھیں اور ان کی ملاقات نقش کی امی سے ہوئی تھی۔ جنرل صاحب حسب معمول کینٹ تھے۔

نقش کی امی غزالہ سے بہت محبت سے پیش آئی تھیں۔ غزالہ نے انہیں جنرل صاحب سمیت اپنے گھر آنے کی دعوت دی تھی۔

حوری اب نقش سے کافی گھل مل گئی تھی۔ نقش نے دوبئی سے اس کے لیے کچھ کھلونے بھی منگوائے تھے جن میں ایک بہت پیاری گڑیا بھی تھی۔

نقش کی ایک آدھ دفعہ شامیر کے بڑے بھائی سمیر سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ شامیر سے خاصے بڑے تھے۔ وہ بھی نقش سے محبت و احترام سے پیش

آئے تھے۔

حوری کے لیے نقش کا اصل نام پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ اُسے صرف ''آنی'' اور کسی اور کو اس کے بارے میں بتاتے ہوئے ''لمبے بالوں والی آنی'' کہتی تھی۔

شامیر سے ہونے والی گفتگو میں بھی اب لمبے بالوں والی آنی کے حوالے ہوتے تھے ان سارے کھلونوں کی تصویریں بھی اس نے شامیر کو سینڈ کی تھیں جو وہ اُس کے لیے لائی تھی۔

ایک دن اچانک ہی حوری نے سیل فون کے کیمرے کا رخ اس کی طرف کیا۔ ''آنی! میں آپ کی تصویر چاچو کو بھیجنے لگی ہوں۔'' اس کی انگلی بٹن کو پش کرنے چلی تھی۔

نقش سے اور تو کچھ نہیں ہوسکا۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپالیا۔

بعد میں نقش نے وہ تصویر دیکھی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ کسی کے بھی دل کی دھڑکنوں کی لے کو تبدیل کرسکتی تھی۔

حوری اُس کے چہرہ چھپانے پر حیران ہوئی تھی۔ ''آپ نے اچی (اچھی) تصویر کیوں نہیں بنوائی۔'' ساتھ ہی ناراضگی کے اظہار کے طور پر اس کے گال بھی پھول گئے تھے۔

ایسے وقت نقش کو اس پر زیادہ پیار آتا تھا۔ نقش نے اسے چومتے ہوئے بہانہ تراشا ''یہ تصویر دیکھ کر تمہارے چاچو ڈر جائیں گے۔'' نقش اس کے کیوں اور کیسے جیسے سوالوں سے بچنا چاہتی تھی۔ معصوم حوری کو یہ سمجھانا بے حد مشکل تھا کہ اس کی تصویر چاچو کو بھیجنا مناسب نہیں ہے۔

چاچو کو ڈرانے کے خیال سے حوری پرجوش ہوگئی تھی۔ اس نے وہی تصویر سینڈ کردی تھی۔

غزالہ جہاندیدہ خاتون تھیں۔ ماہم کے کریدنے والے سوالوں سے انہوں نے اندازہ لگالیا تھا کہ ان دونوں میں سے کوئی شامیر میں دلچسپی لے رہی تھی اور شامیر کے گھر تک رسائی کے لیے ہی انہوں نے گھر کو ''اندر'' سے دیکھنے کا بہانہ تراشا تھا۔

پھر ان کی توجہ نقش کی طرف چلی گئی جس کی آمد و رفت ویسے تو جاری رہتی تھی مگر ویک اینڈ کو جب شامیر آیا ہوتا تھا وہ کبھی نہیں آتی تھی۔ انہوں نے دیکھا تھا کہ شامیر کے ذکر پر نقش بظاہر بے نیازی بن جاتی تھی مگر اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگانے لگتے تھے پھر ایک دفعہ انہوں نے اسے شامیر کی ڈرائنگ روم والی تصویر کو محویت سے تکتے دیکھا۔ اس پل اس کے چہرہ پر جو تاثر تھا وہ انہیں بتانے کے لیے کافی تھا کہ جنرل عاطف لودھی کی یہ لاکھوں میں ایک بیٹی اُس کے عام سی صورت والے دیور پر مرمٹی ہے۔

اتفاق سے نقش اس وقت ڈرائنگ روم میں اکیلی تھی۔ غزالہ نے اپنے جوتوں سے آواز پیدا کی تو اس کی نگاہ کا زاویہ تبدیل ہوگیا تھا مگر جو کچھ غزالہ نے دیکھنا تھا وہ دیکھ لیا تھا۔

(ان شاء اللہ باقی آئندہ ماہ)

افسانہ دوستی

رضوانہ کوثر

خونی رشتے مجبوری کے ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور ہر شخص اسے نباہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ البتہ دوستی کا رشتہ اختیاری ہوتا ہے اور اسے انتہائی سوچ سمجھ کر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس رشتے میں ذرا سی چوک انسان کو تباہی کے گہرے گڑھے میں لے جاتی ہے۔

''مے آئی کم اِن......'' کلاس شروع ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک بے حد خوب صورت آواز گونجی تو سب کی ہی گردنیں دروازے کی طرف گھوم گئیں۔

''اُف! اپالو دوبارہ زندہ ہوگیا؟'' کومل کی سرگوشی سائرہ کے کان میں گونجی تو اس نے تائید میں گردن ہلاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا' جواب میڈم نسبت آرا کی اجازت پا کر اپنی سیٹ کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''آپ کچھ لیٹ ہوگئے ہیں اس لیے ہم آپ کے تعارف سے محروم رہ گئے۔'' میڈم نسبت آراء جو اسٹوڈنٹس کے ساتھ اپنے دوستانہ رویے کی وجہ سے اسٹوڈنٹس کی کافی پسندیدہ شخصیت تھیں' شگفتہ انداز میں بولیں تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''یس میڈم! میرا نام ساحل خان ہے' میں پشاور یونیورسٹی سے مائیگریٹ ہوکر آیا ہوں۔''

''آواز بھی خاصی خوب صورت ہے۔'' کومل کی دوبارہ سرگوشی پر اس نے گھورا۔

''او کے! پلیز ٹیک یور سیٹ!''

''تھینک یو میڈم!'' وہ شکریہ ادا کرتا ہوا اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گیا اور میڈم نے اپنا لیکچر وہیں سے شروع کیا۔

''جیسا کہ ہم فرائڈ کی تھیوری ڈسکس کررہے تھے انسان خواب کب اور کن حالات میں دیکھتا ہے؟ جب ہم پریشان ہوتے ہیں یا کسی چیز سے خوف زدہ ہوتے ہیں تو ہمیں خواب بھی ایسے ہی نظر آتے ہیں جیسے کہ ہم کسی خوف کے زیر اثر ہیں یا کسی مافوق الفطرت چیز سے ہم بچنے کی کوشش کرتے ہیں' کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنی کسی ناآسودہ خواہش کو ہم خواب میں پورا ہوتے دیکھتے ہیں۔''

''لیکن میڈم میں ان سب باتوں سے آزاد ہوں کیونکہ نہ تو میں کسی چیز سے خوف زدہ ہوتا ہوں نہ ہی میری خواہش ادھوری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں بُرے خواب نہیں دیکھتا۔'' شوخ سے ارمان کی آواز اُبھری تو سب کے چہروں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''لیکن میڈم! میرے خیال میں اس دور میں کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ہر لحاظ سے آسودہ ہے کیونکہ فرائڈ کے خیال میں اگر کوئی یہ کہے کہ وہ خواب نہیں دیکھتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خواب تو دیکھتا ہے مگر آنکھ کھلنے سے پہلے ہی انہیں بھول بھی جاتا ہے۔'' سائرہ شاہ کی پُر اعتماد آواز ابھری تو میڈم نے تائید میں گردن ہلائی۔ اسی وقت گھنٹی بجنے سے موضوع کا تسلسل ٹوٹ گیا۔

❁......☆......❁

''اچھا سائرہ میں تو چلوں ورنہ پوائنٹ نکل جائے گا۔'' کومل شاہد نے بیگ کاندھے پر لٹکایا۔ ''مگر تم بھولنا نہیں' ٹھیک چھ بجے آجانا۔'' اس نے چلتے چلتے پھر کہا۔

''اچھا! ٹھیک ہے۔'' کومل کے جانے کے بعد وہ

بھی پارکنگ لاٹ کی طرف چلی آئی۔ جہاں ڈرائیور اس کا منتظر تھا۔

❁......☆......❁

"السلام علیکم!" گھر میں داخل ہوئی تو سامنے ہی لاؤنج میں امی اور بھابی کسی مسئلے پر زور و شور سے بحث کر رہی تھیں جب کہ رضا اپنی ڈنکی کا پوسٹ مارٹم کرنے میں مصروف تھا۔

"آ گئیں سائرہ؟" بھابی نے فی الفور اس کی جانب توجہ کی تھی۔

"نہیں بھابی! ابھی راستے میں ہی ہوں۔" وہ جواب دیتے ہوئے کھلکھلائی۔

"توبہ ہے اس لڑکی سے...... کیسی حاضر دماغ ہے۔" امی بڑبڑائیں۔

"تم کیا کر رہے ہو ڈیئر!" اس نے چار سالہ رضا کو گدگدایا۔

"پھوپو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس ڈنکی کو چلا کون رہا ہے؟" وہ تینوں ایک ساتھ ہنس پڑیں۔

"سائرہ! ہاتھ منہ دھولو میں کھانا لگاتی ہوں۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔" بھابی اٹھتے ہوئے بولیں۔

"بھابی! کھانا کھا کر میرے ساتھ بازار چلیں گی؟" اس نے پوچھا۔

"کیوں؟"

"آج شام کو کومل کی سالگرہ ہے اس کے لیے کوئی گفٹ لوں گی۔"

"بچے سالگرہ مناتے اچھے لگتے ہیں۔ یہ اتنی بڑی کومل کو کیا سوجھی!" بھابی سے پہلے ہی امی بول پڑیں۔

"افوہ امی! سالگرہ کیسی...... بس ایسے ہی مل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔ زیادہ لوگ تھوڑی ہیں بس ہم چند دوستیں ہی ہوں گی مگر تحفہ کیا دوں؟" وہ الجھن میں پڑ گئی تو امی نے اس کی مشکل آسان کی۔

"اب ایک چیز لینے کے لیے کیا بازار جاؤ گی ویسے بھی تمہارا بازار جانا تمہارے بھائی کو پسند نہیں جو بھی منگوانا ہے ڈرائیور سے کہہ دو لے آئے گا یا پھر وہ جو پچھلے ہفتے چار ریڈی میڈ سوٹ خریدے تھے۔ ان ہی میں سے ایک پیک کر کے دے دو۔" امی کے کہنے پر اس نے تائید طلب نگاہوں سے بھابی کی طرف دیکھا تو انہوں نے کندھے اچکائے۔

"چلیں ٹھیک ہے۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بھابی! آپ کھانا نکال لیں میں ابھی آئی۔" وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"پتا نہیں اس لڑکی کو کب عقل آئے گی؟ اتنی بڑی ہو گئی مگر طبیعت کا بچپنا اب تک نہیں گیا۔ ہزار بار کہا ہے کہ یونیورسٹی کی دوستیاں وہیں تک محدود رکھا کرو۔" امی کی بڑبڑاہٹ جاری ہو گئی تھی۔

❁......☆......❁

"اچھا امی! اب میں جا رہی ہوں ڈرائیور ابھی گھر گیا تو نہیں نا۔"

"ڈرائیور چلا گیا ہے حنان نے کہا ہے کہ وہ تمہیں چھوڑ بھی دیں گے اور لے بھی آئیں گے ڈرائیور کے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔" امی نے کہا۔

"ٹھہرو! پہلے میں تمہاری نظر تو اتار دوں۔" بھابی نے شرارتی لہجے میں کہتے ہوئے اسے غور سے دیکھا۔ گرین نیٹ کی قمیص اور دوپٹا جس پر کہیں کہیں نگ چمک رہے تھے۔ لائٹ پنک شلوار ہلکا پھلکا میک اپ کیے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں میری خوب صورتی سے کس کو انکار ہے بھلا!" اس نے گردن اکڑائی تو بھابی نے اسے ایک دھپ رسید کر دی۔ اسی وقت حنان بھائی کمرے سے نکلے۔

"تیار ہو گئیں؟"

"جی بھائی!" اس نے فی الفور مؤدب ہو کر گردن ہلائی۔

"آ جاؤ پھر!" وہ سائیڈ ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گئے۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ بھائی کے ساتھ جانا پڑے گا تو میں پروگرام کینسل ہی کر دیتی۔" وہ ہولے سے بڑبڑائی پھر چادر سے سر کو ڈھکتی امی کو خدا حافظ کہتی گاڑی میں جا بیٹھی جہاں حنان کا موڈ آف تھا۔

"دیکھو سائرہ یہ آنا جانا دوستیاں وغیرہ ذرا کم کرو مزاج میں سنجیدگی پیدا کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ تم گاؤں کی حویلی میں ہوتیں تو کوئی پرندہ تک تمہاری شکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ تو کچھ بابا جان کی نرمی اور کچھ شہری ماحول کی وجہ سے تمہیں اتنی آزادی ملی ہوئی ہے کہ تم یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہو لیکن وہاں کی دوستیاں وہیں تک رکھو۔ سہیلیوں کو گھر بلانے یا ان کے گھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔" حسب توقع بھائی کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔

"جی بھائی!" اس کی مری مری آواز نکلی۔

"اب جاؤ میں ایک گھنٹے بعد لینے آ جاؤں گا۔" انہوں نے کومل کے گھر کے سامنے گاڑی روک دی تو وہ کڑھتی ہوئی اتر گئی تھی۔

❁......☆......❁

"پتا ہے سائرہ! رات کو تمہارے واپس آنے کے بعد بڑا مزا آیا۔ ہم لوگوں نے گھی کے ڈبے کا ڈھول بنا کر خوب گانے گائے میوزیکل چیئر کھیلی ایسا لگ رہا تھا کہ دوبارہ بچپنے میں چلے گئے تھے مگر تم اتنی جلدی کیوں چلی گئی تھیں؟" اگلے دن کومل اپنی سالگرہ کی روداد سنا رہی تھی۔

"بس یار! جانے دو بتایا تو تھا تمہیں کہ صرف ایک گھنٹے کی اجازت ملی ہے۔" وہ اکتائی ہوئی آواز میں بولی۔ "معلوم بھی ہے کہ ہمارے گھر کا ماحول کتنا پابند ہے اور میرے حنان بھائی تو پورے ہٹلر ہیں۔ یہ مت کرو وہ مت کرو یہاں نہ جاؤ وہاں نہ جاؤ۔ بس ہر وقت پابندیاں ہی پابندیاں...... تمہارے ہاں جانے کی اجازت بھی مشکل سے ملی تھی اور بھابی نے سفارش کی تھی مگر ان کا موڈ آف ہی تھا۔"

"اچھا چھوڑو اس موضوع کو یہ بتاؤ کہ آج میڈم نسبت آراء انسانی جبلت پر لیکچر دیں گی تم نے کچھ پڑھا ہے؟" اس نے کومل سے پوچھا۔

"نہیں! کل تو اتنی مصروفیت تھی موقع ہی نہیں ملا......" بیل کی آواز پر دونوں اپنی کلاس کی طرف چلی آئیں۔ جہاں کچھ دیر پہلے ان کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔

"انسانوں میں مختلف قسم کی جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جبلت فرار جبلت تنفر جبلت حصول وغیرہ۔ جبلت فرار سے مراد یہ ہے کہ ہم کسی جگہ سے گزر رہے ہیں اور وہاں ہمیں ناگوار بو محسوس ہو تو ہم اپنے قدم تیز کر دیتے ہیں یعنی وہاں سے جلدی گزر جانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں کوئی شے پسند آتی ہے تو ہم اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ سب آپ انٹر میں پڑھ کر آئے ہوں گے اور جب ماسٹرز کریں گے تو مزید تفصیل سے پڑھیں گے۔" میڈم اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں پڑھا رہی تھیں۔

"مگر میڈم! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم کسی چیز کو محض پسندیدگی کی بنا پر حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ وہ شے ہماری ضد بن جائے۔" ساحل خان کی خوب صورت گمبھیر آواز کلاس روم میں گونجی۔

"جی ہاں! ایسا ہو سکتا ہے مگر پھر ہم اس کو ایک

صحت مند معاشرتی رویہ نہیں کہہ سکتے۔''

''اس کے خیالات تو بڑے خطرناک ہیں۔'' کومل، سائرہ کے کان میں تقریباً گھس گئی۔ وہ لیکچر کے دوران خاموش بیٹھ ہی نہیں سکتی تھی۔ یونہی کھسر پھسر کرتی رہتی تھی۔ اس نے پلٹ کر اسے گھورا تھا اور وہ سر جھکا کر لیکچر نوٹ کرنے لگی۔

''سنو سائرہ! میں کل یونیورسٹی نہیں آؤں گی، تم ضروری لیکچر نوٹ کر لینا، میں تم سے لے لوں گی۔'' کلاس ختم ہونے کے بعد دونوں کینٹین کی طرف جا رہی تھیں جب کومل نے گویا اطلاع دی۔

''یہ تم روز روز چھٹیاں کیوں کرنے لگی ہو؟'' اس نے اسے گھورا۔

''یار! وہ بات یہ ہے کہ کل میرے سسرال والوں کی دعوت ہے، ہوسکتا ہے کہ شادی کی تاریخ ٹھہر جائے۔'' کومل کے گال گلابی ہونے لگے۔

''اوہو تو یہ بات ہے۔'' اس نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

''بکو مت!'' کومل بُری طرح جھینپ گئی۔ سائرہ سنجیدہ ہوگئی۔

''اگر میڈم کی کلاس نہ ہوتی تو میں بھی چھٹی کر لیتی۔''

''مگر اب تو مجبوری ہے نا! ایک دن گزار لینا اکیلے...... یا پھر ایسا کرنا کہ صرف میڈم کی کلاس لے کر واپس گھر چلی جانا۔'' کومل کا مشورہ اس کے دل کو بھایا۔''

❁......☆......❁

اگلے دن میڈم کی کلاس لینے کے بعد وہ کینٹین میں چلی آئی۔ ڈرائیور آج چھٹی پر تھا۔ اسے لنچ ٹائم میں حنان نے پک کرنا تھا۔ جب تک کا وقت کیسے گزارا جائے؟ وہ کوک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' بھاری سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ساحل خان اپنی تمام تر وجاہتوں سمیت اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹھیے پلیز!'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے آج آپ اکیلی نظر آرہی ہیں؟'' اس نے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! آج کومل کو کچھ مصروفیت تھی۔ آپ کو کچھ کام تھا مجھ سے؟'' اس نے کہا۔

''جی ہاں! اصل میں آپ کلاس کی کافی سرگرم طالبہ ہیں جب کہ میں تھوڑا سا نکما واقع ہوا ہوں، اس لیے میں نے سوچا کہ آپ سے لیکچرز کے سلسلے میں تھوڑی مدد لے لی جائے۔'' وہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ہوں! میرے پاس میڈم کے سارے لیکچرز ہیں، آپ لے لیجیے گا۔'' وہ رسان سے بولی۔

''اصل میں، میں نے پشاور یونیورسٹی سے مائیگریشن کروائی ہے اور کچھ دوسری وجوہات کی بنا پر میری کچھ کلاسز مس ہوگئی ہیں تو مجھے نفسیات جیسے مشکل موضوع کو سمجھنے میں کچھ دشواری پیش آرہی ہے۔ اس لیے میں آپ کی مدد چاہتا ہوں۔'' اس نے تفصیل بتائی۔

''ہاں ہاں! کیوں نہیں...... مجھے خوشی ہوگی اگر میں آپ کی مدد کر سکوں۔'' اس نے خلوص سے گردن ہلائی کہ وہ بھلا کیسے جان سکتی تھی کہ مقابل کے دل میں کیا ہے۔

''بہت بہت شکریہ!'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک نظر گھڑی پر اور ایک نظر اس کے صبیح چہرے پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اچھا خدا حافظ!'' اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد اس نے بھی باہر کا رخ کیا۔

❁......☆......❁

''ٹھہر گئی تمہاری شادی کی تاریخ......؟'' دوسرے دن دونوں فری پریڈ میں لان میں بیٹھی تھیں جب اس نے کومل سے پوچھا۔

''ہاں! فائنل سمسٹرز کے فوراً بعد......'' کومل نے بتایا۔

''تو تم آفرز مکمل نہیں کرو گی؟''

''کروں گی کیوں نہیں، شادی کے بعد پڑھنا منع ہے کیا؟'' کومل چمک کر بولی۔

''بس پڑھ چکیں تم شادی کے بعد...... شادی کے بعد ذمے داری اتنی بڑھ جاتی ہے کہ پڑھائی وڑھائی دھری رہ جاتی ہے سب......'' اس کی بات درمیان میں ہی جب وہ ہولے سے چلائی۔ تو اس نے بھی سامنے دیکھا۔ ''ہائیں! یہ تو اِدھر ہی آرہا ہے۔'' کومل کے لڑبڑانے پر اس کو ہنسی آگئی۔ ساحل خان ان کے قریب آ کر رک گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر دونوں کو ہیلو کہا، کومل کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی تھی۔

''یہ رہے آپ کے نوٹس!'' سائرہ نے کہا ساتھ ہی کاغذوں کا پلندہ اس کی طرف بڑھایا۔

''شکریہ! آپ نے میری بڑی مشکل حل کر دی ورنہ مجھے اتنا سارا وقت لائبریری میں کتابیں کھنگالنے میں ضائع کرنا پڑتا۔'' وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ کی اردو بہت صاف ہے۔'' اس کی بات کے اختتام پر سائرہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''اصل میں ہم لوگ ہیں تو پٹھان لیکن والد صاحب گھر میں زیادہ تر اردو ہی بولتے ہیں اس لیے میری اردو صاف ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''ساحل!'' آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔ ارمان اسے بلا رہا تھا۔ دونوں سے ایکسکیوز کرتا چلا گیا۔

''کیا بات ہے بڑی بے تکلفانہ گفتگو ہو رہی تھی۔'' اس کے جاتے ہی کومل نے اسے گھورا۔

''کل تم نہیں تھیں تو اس نے نوٹس مانگے تھے، اب وہ ہی لینے آیا تھا۔'' اس نے سرسری انداز میں بتایا تو کومل اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گئی مگر بولی کچھ نہیں۔

''ویسے یہ کتنا ڈشنگ ہے نا! اور اوپر سے ڈریسنگ بھی غضب کی کرتا ہے، مجھے لگتا ہے کہ تم اس کی شخصیت سے متاثر ہو رہی ہو۔''

''ہاں!'' اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

پھر یوں ہوا کہ سائرہ شاہ اور ساحل خان ہر جگہ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے۔ کینٹین میں، لان میں، لائبریری میں...... جانے کیا باتیں تھیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتیں۔ ساحل کے دوستوں کا تو خیر گروپ تھا مگر اس کی واحد دوست کومل پھر پس پشت چلی گئی۔ اس دن بھی سردیوں کی چمکیلی دھوپ میں گھاس پر بیٹھی ساحل کی کسی بات پر بے تحاشا ہنس رہی تھی کہ کومل نے اسے پکارا مگر وہ الٹا اسے ہی بلانے لگی۔

''آؤ نا کومل! وہاں کیوں رک گئیں۔''

''نہیں! میں نہیں آرہی تم اِدھر آؤ۔'' اس نے ساحل کو مکمل نظر انداز کرتے ہوئے وہیں کھڑے کھڑے اسے بلایا۔ وہ ساحل کی طرف معذرت خواہانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ کومل اس کا بازو دبوچتے ہوئے ایک طرف لے گئی۔

''تمہیں پتا ہے، تم آگ سے کھیل رہی ہو؟'' وہ اس کی طرف متاسفانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' اس نے تجاہل عارفانہ برتا۔

''یہ سب کیا ہے؟'' کومل نے غصے سے ساحل کی

طرف اشارہ کیا۔

"کچھ نہیں! ہم بس اچھے دوست ہیں۔"

"یہ تم نے لڑکوں سے دوستی کرنا کب سے شروع کردی؟" وہ اس کے پُرسکون انداز پر بھڑ کر بولی۔

"یار! جب تم نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے تو مجھے کسی کی کمپنی تو چاہیے تھی نا!"

"تم خوب اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے تمہارا ساتھ کیوں چھوڑا ہے' مجھے اپنی ساکھ کی بہت پروا ہے' ہمارے والدین نے ہمیں یہاں پڑھنے کے لیے بھیجا ہے کیونکہ وہ ہم پر اعتبار کرتے ہیں اور تم ایسی حرکتیں کرکے ان کا اعتماد مٹی میں ملا رہی ہو؟" کئی دنوں سے وہ یہ سب کچھ برداشت کررہی تھی' آج برداشت جواب دے گئی تو وہ پھٹ پڑی۔ اسے قطعاً سائرہ اور ساحل کی دوستی پسند نہ تھی۔

"کیوں...... کیا غلط کررہی ہوں میں؟" اب کے سائرہ کا لہجہ بھی تیز ہوا۔

"اگر یہ غلط نہیں ہے تو تم اپنے بھائی کے سامنے بھی اس سے اتنی ہی بے تکلفی سے گفتگو کرسکتی ہو جس طرح ابھی کررہی تھیں' اسے اپنے گھر بلا سکتی ہو یا اس کے گھر جاسکتی ہو؟ بولو!" غصے سے کومل کی سانس پھول گئی۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ڈیپارٹمنٹ کی سب سے ریزرو لڑکی جس کی چادر بھی اس کے سر سے نہیں سرکتی تھی' اس طرح رنگ بدلے گی۔"

"شٹ اپ کومل! میرے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال نہ کرو' میں جانتی ہوں کہ میں کچھ غلط نہیں کررہی۔" اس نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نہیں جانتیں سائرہ! تم نہیں جانتیں۔" بہت بے بس لہجے میں کومل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے کانوں میں ارمان کی آواز گونجنے لگی۔

"سائرہ شاہ! ڈیپارٹمنٹ کی سب سے ریزرو اور اسٹرانگ لڑکی کا چیلنج دیتا ہوں تمہیں۔" ارمان ڈیپارٹمنٹ کا سب سے اوباش لڑکا تھا۔ جس نے کئی بار سائرہ کی طرف پیش قدمی کی تھی اور ہر بار منہ کی کھائی تھی' اب ساحل خان کو چیلنج دے رہا تھا۔ "تمہیں اپنی پرسنالٹی اور خوب صورتی پر بڑا غرور ہے نا! یہیں اس کلاس میں تمہارے سامنے ناک سے سات لکیریں کھینچوں گا اگر تم کامیاب ہوگئے تو......"

کلاس ختم ہوئے کافی دیر ہوچکی تھی' جب ہی کومل کو یاد آیا کہ وہ اپنی فائل تو کلاس میں ہی بھول آئی ہے' وہی لینے واپس آئی تھی کہ یہ سب آوازیں اس کے کان میں پڑیں تو وہ دروازے کے باہر ہی رک کر ان کی باتیں سننے لگی اور پھر الٹے قدموں سے لوٹ آئی تھی اور تب سے پریشان تھی۔ یہ ہی وجہ تھی جس نے اسے ساحل سے نفرت کرنے پر مجبور کردیا تھا کہ جس کا ظاہر جتنا خوب صورت تھا باطن اتنا ہی بدصورت تھا اور اب وہ سائرہ شاہ کے معصوم اور صبیح چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ تم بھی وہی نکلیں ناں عام سی حوا کی بیٹی! جو بنا سوچے سمجھے محبت کے جھوٹے فریب میں آگئی۔ کاش میں تمہیں بتاسکتی کہ آگ پانی کا جو کھیل تم کھیل رہی ہو اس میں مات سراسر تمہاری ہے۔" وہ ایک دکھ سے سوچتی چلی گئی۔

❁......☆......❁

شام کو ہاتھ منہ دھو کر وہ کچن میں چلی آئی۔

"لائیں بھابی! میں چائے بنالوں' آپ دوپہر سے کچن میں لگی ہوئی ہیں۔ ویسے کیا کیا بنالیا؟"

"دہی پھلکیاں اور چھولے تیار ہیں۔ رول اور شامی کباب تلنے باقی ہیں۔ تم تو جانتی ہو کہ امی کو بازار کی چیزیں زیادہ پسند نہیں ہیں۔" بھابی نے جواب دیا۔

"ویسے اب کی بار چچی جان بہت دنوں کے بعد آرہی ہیں؟"

"ہاں بس زوار کی جاب کی وجہ سے امی کو فرصت ہی نہیں ملتی۔ کوئی اور ہے بھی نہیں کہ گھر کو سنبھالے۔ وہ تو اب زوار کی شادی کا مسئلہ نمٹانا چاہتی ہیں اور یوں بھی زوار کو کچھ روز کی چھٹیاں ہیں تو انہوں نے سوچا کہ کوئی لڑکی دیکھ لیں۔" بھابی نے پوری تفصیل بتائی۔

"ہوں! جب ہی تو آپ اتنی خوش نظر آرہی ہیں؟ ہمیں تو کبھی اتنی مزیدار چیزیں بنا کے نہیں کھلائیں۔" اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

"اچھا! میں نے کبھی تمہیں کوئی مزیدار چیز بنا کے نہیں کھلائی؟" بھابی نے اس کا کان کھینچا تو وہ ہنس پڑی۔

"میں تو مذاق کررہی تھی ورنہ آپ تو اتنی اچھی ہیں کہ لگتا ہی نہیں بھابی ہیں' میری سہیلیاں تو اتنے بھیانک نقشے کھینچتی ہیں اپنی بھابیوں کے کہ کیا بتاؤں......!" وہ کان سہلاتے ہوئے بولی۔

"بات یہ ہے سائرہ کہ نہ ہر جگہ بہوئیں خراب ہوتی ہیں' نہ ہر جگہ سسرال والے۔ یہ تو لو اور دو والا معاملہ ہے پھر ہم اچھے تو سب اچھے۔" بھابی سنجیدہ ہوئیں اور ہمارا تو ڈبل رشتہ ہے' تم تو میری پیاری سی تایازاد بہن ہو اور اب نند بن کر تو مجھے اور بھی پیاری ہوگئی ہو۔" بھابی نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگایا تب ہی باہر سے آوازیں آنے لگیں۔

"ایسا لگتا ہے چچی جان آگئیں؟" وہ دونوں باہر کی طرف لپکیں۔ چچی جان امی سے گلے مل رہی تھیں' ان دونوں کو ایک ساتھ بانہوں میں بھرلیا۔

"کیسی ہیں میری بیٹیاں!" انہوں نے باری باری دونوں کی پیشانی چومی۔

"ہم ٹھیک ہیں۔" دونوں یک زبان ہوکر بولیں تو صولت بیگم ہنس دیں۔

"بھابی! آپ بیٹھ جائیں' میں چائے نکال لیتی ہوں۔" وہ کہتے ہوئے کچن میں چلی آئی۔ خوش گوار ماحول میں چائے پی جارہی تھی۔

"امی! میں نے اس کو کئی سالوں کے بعد دیکھا ہے' تب تو یہ کافی چھوٹی ہوتی تھی' سڑ سڑ ناک صاف کرتی رہتی تھی۔" زوار کا اشارہ سائرہ کی طرف تھا۔ جس کی نظریں اس کے خوب صورت چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

"زوار بھائی! ناک تو میں ابھی بھی صاف کرتی ہوں' فرق یہ ہے کہ پہلے سب کے سامنے کرتی تھی' اب اکیلے میں کرتی ہوں۔" اس نے اپنی بات کے اختتام پر زوردار قہقہہ لگایا تو سب ہی ہنس پڑے اور زوار کا دل اس کے گالوں میں پڑے ڈمپلز میں اٹک گیا۔

"توبہ ہے' اس سے کوئی جیت سکتا ہے بھلا!" امی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"رہنے دیں بھابی جان! یہی تو دن ہیں اس کے ہنسنے کھیلنے کے......" چچی جان اسے پیار سے دیکھتے ہوئے بولی تھیں پھر کتنا وقت گزرا معلوم ہی نہ ہوسکا۔

❁......☆......❁

رات کو وہ جانے کن خیالوں میں گم آپ ہی آپ مسکرائے چلی جارہی تھی۔ جب امی اس کے کمرے میں چلی آئیں۔

"امی آپ آیئے نا!" اس نے سیدھے ہوکر امی کے لیے بیڈ پر جگہ بنائی۔

"کیا کررہی تھیں بیٹا!"

"کچھ نہیں امی! ایسے ہی بیٹھی تھی' نیند نہیں

آ رہی۔"
"بیٹا! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔"
"جی امی! ضرور کریں۔" وہ سعادت مندی سے بولی۔
"تمہیں پتا ہے تمہاری چچی کس لیے آئی ہیں؟" جواب میں اس نے امی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ "اصل میں تمہاری چچی نے تمہیں زوار کے لیے مانگا ہے' گھر کا لڑکا ہے' دیکھا بھالا ہے' اچھی جاب ہے۔ تمہارے بابا اور بھائی تو بالکل راضی ہیں حالانکہ مجھے پورا اعتماد ہے کہ تمہاری مرضی بھی وہی ہوگی جو ہماری مرضی ہوگی لیکن پھر بھی میں نے سوچا کہ تم سے پوچھ لوں' تمہاری چچی کہہ رہی تھیں کہ اگلے چاند کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں۔" وہ اپنی دھن میں کہے جا رہی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے امی کو دیکھتی رہ گئی۔ "بیٹا! میں بہت خوش ہوں۔ زوار ہر لحاظ سے تمہارے لائق ہے اور یہ وقت تو ہر لڑکی پر آتا ہے' ماں باپ کا گھر چھوڑنا ہی پڑتا ہے۔" امی اس کی خاموشی سے جانے کیا سمجھیں جب کہ وہ سُن ہوتے دماغ کے ساتھ ان کی باتیں سُن رہی تھی۔ امی اس قدر خوش اور پُر امید تھیں کہ وہ چاہنے کے باوجود کچھ نہ کہہ سکی اور اگلی صبح وہ سُتے ہوئے پریشان چہرے کے ساتھ یونیورسٹی آئی تھی' اس کی نظریں ساحل کو تلاش کر رہی تھیں کہ اسے کومل' رمشہ اور عالیہ کے ہمراہ کلاس کی طرف جاتی ہوئی نظر آئی تھی۔ کومل کی نظر اس پر پڑ چکی تھی وہ سیدھی اس کی طرف آئی۔
"کیا بات ہے سائرہ! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔
"کومل!" اس سے ضبط نہ ہوا اور آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ گئے۔ کومل بُری طرح گھبرا گئی وہ اسے نسبتاً سنسان جگہ پر لے آئی۔
"ہوا کیا ہے' بتاؤ تو سہی......؟"
"کومل! امی نے میری بات طے کر دی ہے۔" اس نے روتے روتے سر اٹھا کر بتایا۔
"واقعی!" اس کے منہ سے خوشی کی ہلکی سی چیخ نکلی۔ "تو اس میں رونے والی کون سی بات ہے۔" سائرہ نے زخمی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"تم تو سب جانتی ہو کومل!" وہ بے بسی سے بولی۔
"دیکھو میری جان! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی' ہو سکتا ہے کہ جو کچھ تم سمجھ رہی ہو' وہ سچ نہ ہو' محض دھوکا ہو۔" کومل نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔
"مگر اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ فائنل سمسٹرز کے بعد اپنے ممی ڈیڈی کو لے کر ہمارے گھر آئے گا رشتہ مانگنے کے لیے...... تم کسی بھی طرح امی کو جب تک کے لیے روک دو پلیز!" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا۔
"شٹ اپ سائرہ! تم جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو' تم سمجھتی ہو کہ تم سائرہ شاہ جعفری' سید عارفین شاہ جعفری کی بیٹی کی شادی اس ساحل خان کے ساتھ ممکن ہے؟" کومل نے گہری سانس لے کر اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "اور کیا تمہارے ماں باپ مان جائیں گے؟ ہو سکتا ہے وہ پہلے سے شادی شدہ ہو' ان لوگوں کے ہاں تو بہت جلدی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ تم دونوں اپنی اپنی برادری اور قبیلہ کی عزت کے درپے ہو' اگر میں اس کے ماں باپ کو فون کر کے بتا دوں کہ ان کا بیٹا کیا گل کھلا رہا ہے تو وہ خود اسے گولی مار دیں گے کیوں کہ یہ لوگ عزتوں پر مرنے مارنے والے لوگ ہوتے ہیں۔" اس سفاکی سے حقیقت بیان کرنے پر بس اس کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ کومل نے تھوڑی سانس بھری۔
"وہ تمہارے ساتھ مخلص نہیں ہے سائرہ! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم کسی شے کو محض پسندیدگی کی بنا پر حاصل نہ کریں بلکہ وہ شے ہماری ضد بن جائے۔" ساحل کے الفاظ کومل کے ذہن میں گونج گئے۔
"تم محض اس کی ضد ہو اور کچھ نہیں۔" مگر وہ یہ سب صرف سوچ کر رہ گئی کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی۔
"تمہارے ماں باپ تمہارا بُرا نہیں سوچ رہے سائرہ! تم شادی کر لو یہ ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔ تمہیں ہماری بچپن کی دوستی کا واسطہ!" بڑا ہی ملتجی لہجہ تھا کومل کا اور سائرہ شاہ کچھ کہہ تو نہ سکی چپ چاپ آنسو صاف کرتی پلٹ گئی تھی۔

❁......☆......❁

اور کیا ہوتا اگر زندگی اپنے پسندیدہ ساتھی کے ہمراہ گزر جاتی' اس کو تو گزرنا ہی تھا۔ ہنسی خوشی یا رو کر...... اگر من چاہے راستے پر گزرتی تو کتنی آسان ہوتی اور اب کتنی مشکل تر تھی...... اور کتنا مشکل ہوتا ہے آنسوؤں کو چھپا کر چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ سجانا...... کتنی دعائیں مانگی تھیں میں نے ساحل کے ساتھ کی۔ مگر ساری رد ہو گئیں۔ کیوں بھلا...... میری قسمت اتنی خراب کیوں ہے؟" وہ کب سے بستر پر اوندھی لیٹی اول فول سوچے جا رہی تھی کہ زوار شاہ کمرے میں داخل ہوا۔
"سائرہ! چلو ہم بازار چل رہے ہیں۔" اس کی آواز پر وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔ "کیا ہوا' طبیعت خراب ہے؟" اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھامتے ہوئے پوچھا تو وہ حیران ہی تو رہ گئی۔ اتنی محبت تھی اس کی آنکھوں میں کہ وہ اس کی جگر جگر کرتی آنکھوں سے نگاہ چرا گئی۔
"نہیں تو! بس ایسے ہی سستی ہو رہی تھی۔" وہ آنسو [illegible] سے بولی۔
"کیا بات ہے! تم اتنی سنجیدہ کیوں ہو گئی ہو' ایک دم...... تم تو ہنستی کھلکھلاتی اچھی لگتی ہو۔ پتا ہے امی نے جو تمہیں میرے لیے پسند کیا تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ تم ہر وقت کھلکھلاتی رہتی ہو۔ وہاں اپنے گھر میں امی اکثر کہتی تھیں کہ میں گھر کی خاموشی سے ہول جاتی ہوں' بہو آئے تو کچھ رونق ہو اور بہو بیگم ہیں کہ شادی ہوتے ہی سنجیدگی کے سارے ریکارڈ توڑنے لگی ہیں۔" اس نے شرارت سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ تھامے۔
"ارے نہیں! شادی کے بعد لڑکی میں تھوڑی تبدیلیاں تو آتی ہی ہیں' اب میں ہر وقت کیا اچھل کود کرتی اچھی لگوں گی؟" اس نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔
"اچھا! اب تیار ہو جاؤ' کل ہمیں یہاں سے اپنے گھر روانہ ہونا ہے' کچھ ضروری چیزیں خریدنی تھیں بازار سے...... تم کو بھی جو چاہیے وہ لے لینا' میں نیچے انتظار کر رہا ہوں۔" وہ پیار سے اس کا گال تھپتھپاتا اٹھ کھڑا ہوا۔ کتنے اچانک اور بالکل غیر متوقع طور پر زندگی کا دھارا پلٹ گیا تھا۔ اس کے اندر جانے کتنی سسکیاں اور آہیں دم توڑ گئی تھیں۔ احتجاج کرتی تو کس بل بوتے پر کہ ساحل خان تو ان دنوں اسے ڈھونڈنے سے بھی نہ ملا تھا۔ جانے کہاں گم ہو گیا تھا اور وہ جانتی تھی' اپنے روایت پسند گھرانے سے سر ٹکرا ٹکرا کر خود تو لہولہان ہو سکتی ہے مگر ان سے اپنی بات نہیں منوا سکتی۔ سو شکست اس کا مقدر ٹھہری' تمام امیدیں ایک ایک کر کے دم توڑ گئی تھیں۔ زندگی جیسے خوشی کا مفہوم ہی بھول گئی تھی۔
ڈرائیونگ کے دوران راستے بھر زوار شاہ چہکتا رہا۔ اس کا چہرہ اندرونی خوشی کا غماز تھا۔ وہ جانتی تھی اسے پا کر وہ سرشار تھا۔ مختلف گھریلو ضروری اشیاء کی خریداری کے بعد سائرہ ایک کھلونوں کی دکان میں

داخل ہوگئی۔

"رضا کے لیے کھلونے لےلوں ورنہ وہ کہے گا پھوپو اس کے لیے بازار سے کچھ نہیں لائیں؟" اس نے زوار کی طرف دیکھا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ساتھ دکان میں داخل ہوگیا۔ دکان مختلف ملکی وغیر ملکی کھلونوں سے سجی تھی۔

"وہ سیل سے چلنے والی پولیس کار دکھائیے۔" اس نے دکان دار سے فرمائش کی اور دکان دار نے اسے آن کیا تو اس میں مختلف قسم کی لائٹس جلنے کے علاوہ "اٹینشن پولیس" کی آوازیں آنے لگیں۔ سائرہ نے اسے پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔

"بابا جانی! مجھے بھی یہی والی کار چاہیے۔" اس نے کسی بچے کی آواز پر مڑ کر دیکھا اور گویا پتھر کی ہوگئی۔ پانچ چھ سال کا بچہ ساحل خان کا بازو ہلا کر کہہ رہا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی چادر سے منہ چھپاتے ہوئے رخ موڑ گئی تھی۔

"ایک یہ کار لے لیتے ہیں اور ایک یہ گن......" زوار نے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر بے ساختہ گھبرا گیا۔ "کیا ہوا؟ کیا ہوا سائرہ!" وہ اسے بے قرار سا شانوں سے تھامتے ہوئے بولا۔

"زوار! مجھے چکر آرہے ہیں، مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جارہا۔" وہ اس کے شانے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

"چلو! چل کر گاڑی میں بیٹھو۔" وہ اسے سہارا دے کر باہر لے آیا اور اب گھر آ کر کتنی ہی دیر وہ ایزی چیئر پر آگے پیچھے جھولتی ہوئی یہی سوچے جارہی تھی کہ کیا تھا جو یہ پردہ اب بھی نہ اٹھتا۔ کل تو اس کو شہر سے چلے ہی جانا تھا۔ اتنا بڑا تمانچہ تو اس کے منہ پر نہ پڑتا اور ایک سال وہ اسے بے وقوف بناتا رہا اور وہ بنتی رہی۔

"وہ تم سے مخلص نہیں۔ ہوسکتا ہے تم اس کی ضد ہو، ہوسکتا ہے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ ہو۔" مختلف موقعوں پر کہے گئے کومل کے جملے اس کے کانوں میں گونج رہے تھے تب ہی ہلکی سی دستک کے ساتھ بھابی کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ سیدھی ہوکر بیٹھ گئی۔

"ٹھیک تو ہو سائرہ! زوار نے بتایا کہ وہاں مارکیٹ میں تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تھی؟"

"ہاں بھابی! ایک دم سر گھومنے لگا تھا۔" اس نے امڈ امڈ کر آتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بے وقوف لڑکی! اکثر ایسا ہوتا ہے جو کچھ ہم زندگی سے چاہتے ہیں وہ ہمیں نہیں ملتا لیکن اس کمی کے باعث ہمیں ان چیزوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو ہمیں میسر ہیں۔" بھابی کے گہرے جملے پر اس نے بے حد شپٹا کر ان کا چہرہ غور سے جانچا تھا۔

"کیا انہیں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے؟ انہوں نے ایسی بات کیوں کی اور اب جب کہ میں ان کے بھائی کی بیوی ہوں، میرے بارے میں جان لینے کے بعد یہ میری کتنی عزت کریں گی اور اگر اپنے بھائی کو بتادیا تو میرا مستقبل کیا ہوگا......؟ اُف! اس نے بے حد کراہ کے سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"ہوسکتا ہے کہ خدا نے ہمارے بارے میں جو فیصلہ کیا ہو وہ اس سے بہتر ہو جو ہم اپنے لیے چاہ رہے ہوں......" بھابی کی بات ابھی جاری تھی۔

"بھابی پلیز! آپ کو جو کہنا ہے کھل کر کہیں۔" اس نے بے حد الجھ کر ان کی بات کاٹی تھی۔

"تم بے حد خوش نصیب ہو سائرہ کہ تمہیں کومل جیسی مخلص اور سمجھ دار دوست ملی۔ ایک دن تمہاری غیر موجودگی میں وہ مجھ سے ملنے آئی تھی اور راز داری کا وعدہ لے کر اس نے مجھے سب کچھ بتادیا۔ میری امی نے تو اس نیت سے تمہیں کہ تمہیں زوار کے لیے مانگ لیں لیکن کومل نے مجھے ساحل خان کی اصلیت بتادی تھی تب میں نے ہی شور مچایا، ورنہ ان کا ارادہ اتنی جلدی شادی کا نہ تھا۔ مجھے بھائی کی شادی کا بہت ارمان ہے اس لیے اتنی جلدی شادی ہوگئی۔" وہ بھابی کے انکشاف پر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھے چلی گئی۔

"ساحل خان کی اصلیت......؟"

"ہاں! وہ محض ایک شرط جیتنے کے لیے تم سے فلرٹ کررہا تھا اور تم میری طرف سے بھی مطمئن رہو میں روایتی بھابیوں کی طرح تم سے جرح یا طعنہ بازی نہیں کروں گی، یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ تمہارا راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔ میں بخدا کبھی تم پر یہ ظاہر نہ کرتی کہ میں ساحل کے بارے میں سب جانتی ہوں مگر دیکھ رہی ہوں کہ تم ابھی ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو اور تم نے اپنی اچانک شادی کو ابھی تک ٹھیک سے قبول نہیں کیا اس لیے مجھے تم سے آج تفصیل سے بات کرنی پڑی۔ اب تم یہ بتاؤ کہ تم اس وقت اتنی پریشان کیوں نظر آرہی ہو؟" اور اسے تو گویا رونے کے لیے کسی کاندھے کی تلاش تھی سو ضبط نہ کرسکی اور آنسوؤں کے درمیان جو کچھ دیکھا تھا کہہ سنایا۔

"ہاہ......! اچھا ہوا کہ تم نے اس کا اصل روپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔" بھابی نے گہری سانس بھری۔ "بس سائرہ! خدا کی مرضی تمہاری مرضی سے بہتر نہ تھی؟" اور اسے اپنے تمام سوالات کے جوابات خود مل گئے۔ واقعی خدا کے فیصلے انسانوں کے فیصلے سے لاکھ درجے بہتر ہوتے ہیں۔ بس انسان ہی سمجھ نہیں پاتا۔ "تم کو تو خدا کا شکر بجالانا چاہیے کہ اس نے تمہیں ساحل خان سے بچا کر زوار جیسے محفوظ ہاتھوں میں دیا۔ زوار تم سے بہت محبت کرتا ہے۔ میں زوار کی تعریف اس لیے نہیں کررہی ہوں کہ وہ میرا بھائی ہے بلکہ اس لیے کررہی ہوں کہ وہ واقعی قابلِ تعریف ہے اور اس کی محبت کا اندازہ یوں لگالو کہ اس وقت بھی بے چارہ نیچے بیٹھا تمہارے لیے پریشان ہورہا ہے، اب اپنے آنسو صاف کرلو میں اسے بھیجتی ہوں۔" بھابی اٹھ کھڑی ہوئیں تب ہی زوار شاہ نے دروازے سے جھانکا۔

"اندر آجاؤ؟ لو بھئی خود ہی آگئے۔" بھابی ہنسیں۔ "آجایئے سنبھالیے اپنی دلہن کو......" کہتی ہوئی ساتھ ہی بھابی کمرے سے نکل گئیں۔

"ویسے یار! ابھی ہماری شادی کو صرف ایک ہفتہ ہی ہوا ہے نا!" زوار اس کے مقابل بیٹھ کر اس کا نرم و نازک ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

"جی...... ہاں......!" اس نے ناسمجھی کے انداز میں گردن ہلائی۔ "اور ایک ہفتے کے اندر اندر آپ کو چکر آنے لگے؟ کیا اتنی جلدی خوش خبری سنانے کا ارادہ کرلیا؟" بے حد شرارتی لہجہ تھا زوار شاہ کا۔

"اوہ زوار! آپ بھی بس......" وہ جھینپ کر بے تحاشا سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ زوار کے چوڑے سینے میں خود کو چھپا گئی اور اس کے زندگی سے بھرپور قہقہے نے اسے ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کرنے پر مجبور کردیا کہ جس نے زوار شاہ کی محبت کے ہمراہ اسے کومل جیسی دوست سے بھی نوازا اور اسے گہری کھائی میں گرنے سے پہلے ہی بچالیا تھا۔

اعتبار شرط

غلط بیانی دو دلوں کے درمیان بدگمانی پیدا کردیتی ہے۔ بعض اوقات یہ چھوٹی سی بدگمانی کتنی دوریوں کا سبب بن جاتی ہے کہ فاصلے پاٹنے میں ناکوں پسینہ آجاتا ہے

بہار کے تمام رنگ سموئے ہوئے وہی اسٹائلش سوٹ جو اس کی سالگرہ پر دینے کے لیے میں نے بے حد شوق سے خریدا تھا اس وقت میرے ہاتھ میں تھا اور غصے سے میری بری حالت تھی۔ میں کل کس کرب سے دوچار تھا...... کس کس طرح خود پر ضبط کیا ہوا تھا یہ میں ہی جانتا تھا......؟

لب بھینچتے ہوئے سوٹ میں نے پوری قوت کے ساتھ دیوار پر دے مارا تھا۔ اس وقت میں جس قدر طیش میں تھا اگر وہ میرے سامنے ہوتی تو شاید میں اسے بھی یوں ہی دیوار پر دے مارتا۔ کتنی ہی دیر میں کمرے میں ادھر سے ادھر چکراتا پھرا تھا...... شدید غم وغصے اور رنج وملال سے میری بری حالت تھی۔ پاگلوں کی طرح کمرے میں چکراتے ہوئے اچانک میری نگاہ سائیڈ ٹیبل پر رکھی کتاب میں سے جھانکتے کارڈ پر پڑی تھی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے نکال لیا تھا اور پھر کتنی ہی دیر میں ساکت وجامد کھڑا خالی خالی نگاہوں سے کارڈ پر جگمگاتے ان لفظوں کو گھورتا رہا جو اس وقت مجھے اپنا منہ چڑاتے محسوس ہو رہے تھے۔

مائی لائف! ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔
میں اپنا آج، اپنا کل تمہارے نام کرتا ہوں
میں اس جیون کا ہر اک پل تمہارے نام کرتا ہوں
خزاں، سردیاں، گرمی، بہاریں، بارشیں، جاڑا
میں ہر موسم کا ہر پل تمہارے نام کرتا ہوں
میرا گزرا ہوا کل تو میرے ماضی کا حصہ ہے
میں اپنا آج، اپنا کل تمہارے نام کرتا ہوں
تمہارے بن یہ ہر اک پل مجھے بے چین رکھتا ہے
میں اپنا دل جو ہے بے کل تمہارے نام کرتا ہوں

میں نے جنون کے عالم میں کارڈ کے پرزے پرزے کر کے اسے یوں پھینکا تھا کہ ہر طرف اس کے ٹکڑے بکھر گئے تھے۔

اس کارڈ کی طرح میرا دل بھی تو ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ کارڈ کے ٹکڑے ہر طرف بکھرے نظر آرہے تھے جب کہ اپنے دل کی حالت صرف میں ہی جانتا تھا۔

......☆☆☆......

کل جب میں آیا تھا تو کس قدر خوش تھا، کتنا مسرور تھا، میں نے اپنے آنے کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی۔ ایک دم اس کے سامنے آ کر اس کی حیرانی سے پھیلی آنکھیں دیکھنے کا خیال مجھے بے حد محظوظ کر رہا تھا۔ حیرت اس کی شفاف آنکھوں کو انوکھا سا دل موہ لینے والا تاثر دیتی تھی۔ مسکراہٹ سے کھلے چہرے اور دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے اس کا دروازہ ناک کیا تھا۔

''یس کم آن۔'' فوراً ہی اس کی دلکش آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی اور میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا تھا۔ وہ سامنے ڈھیروں کتابیں کھولے کچھ لکھ رہی تھی۔

''اسفند! آپ......'' سیاہ بالوں کے ہالے میں اس کا خوب صورت چہرہ کچھ اور گلابی ہو گیا اور حیرانی سے دلکش آنکھیں میرے دل میں ہلچل مچانے لگی تھیں۔ دل کسی گستاخی پر آمادہ تھا مگر میں نے اسے ڈپٹ دیا اور اس کا حال احوال دریافت کرنے لگا۔ ہاں نگاہیں ضرور اس کے ایک ایک نقش کی بلائیں لے رہی تھیں۔ وہ بھی اپنی ساری بے پروائی اور بے نیازی بھول کر محجوب سی کھڑی تھی۔ سیاہ ریشمی پلکیں گلابی رخساروں پر لرزتی بے حد حسین منظر پیش کر رہی تھیں۔

''اگر یہ رقیب روسیاہ اجازت دیں تو کچھ ٹائم اس بندۂ ناچیز کی نذر کر دیجیے۔'' میں نے کتابوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے حد شوخی سے اسے دیکھا...... اور وہ بنا کچھ کہے میرے پیچھے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔

''کیا پیئیں گے؟''

''مے دیدار یار۔'' میرا لہجہ بھی مدہوش سا تھا وہ کسی طرح سرخ ہو گئی تھی۔

یوں کنفیوز سی وہ مجھے بے حد اچھی اور اپنی اپنی سی لگ رہی تھی اور اپنی تو وہ تھی ہی۔ آخر سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اس کے جملہ حقوق میں نے اپنے نام کروائے تھے۔

''اچانک کیسے آ گئے آپ؟'' چند پرفسوں لمحوں کے بعد اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ عجیب ہوتی ہیں شہر کی پڑھی لکھی لڑکیاں۔ مجال ہے جو بندے کو کچھ مدہوش ہو لینے دیں۔ میں دل میں جھنجلایا تب ہی اس کے سیل فون کی بپ بجی تھی اور وہ معذرت کرتے ہوئے فون سننے لگی۔

''ریلیکس فرح پلیز! کچھ بتاؤ بھی تو......'' میں قالین میں دھنسے اس کے بے حد سفید سفید پاؤں دیکھ رہا تھا۔ اس کے پریشان لہجے پر چونک کر سیدھا ہوا۔

''دیکھو تم آرام سے اس کو ساری بات بتاؤ وہ ضرور سمجھ جائے گا، ہاں...... یہی خامی ہوتی ہے ان مڈل کلاس لوگوں میں۔ ذرا ذرا سی بات کو بہت بڑا مسئلہ بنا لیتے ہیں یہ لوگ۔ اینی وے تم پریشان مت ہو۔ جب تم غلط نہیں ہو تو ڈٹ کر مکمل اعتماد کے ساتھ اسے پوری بات بتاؤ۔ اگر تم رونی صورت اور لرزتے کانپتے لہجے میں اس سے بات کرو گی تو وہ تمہیں غلط ہی سمجھے گا۔ جب تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو تم کیوں بار بار اپنی صفائی دے رہی ہو...... اُفوہ فرح! بہت غصہ آرہا ہے مجھے تم پر۔'' میں جو بڑی محویت کے ساتھ گویا اس کے ایک ایک نقش کو ازبر کر رہا تھا۔ اس کی تیز آواز نے میری محویت کو توڑ دیا۔

پتہ نہیں دوسری طرف کون محترمہ تھیں جسے وہ لمبا چوڑا لیکچر دے رہی تھی۔ میں بے زار ہوا اور اسی بے زاری میں نہ چاہتے ہوئے بھی پوری توجہ سے اس کی باتیں سننے لگا۔

''بس پوری بات اسے بتاؤ اور سنو۔ اس کے بعد اسے فون مت کرنا۔ میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ جب آج وہ تم پر اعتماد نہیں کر رہا تو کل کیسے کرے گا؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اس رشتے پر دوبارہ سے غور کر لو۔ محبت کا یہ مطلب نہیں کہ انسان خود کو یوں ڈی گریڈ کر لے۔ کم از کم میں تو ایسی محبت کے ہاتھوں کبھی بلیک میل نہ ہوں۔''

میں جو پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھا اس کے آخری الفاظ اور چہرے پر پھیلی سختی نے مجھے کچھ بے چین سا کر دیا تھا مگر کیوں...... میں سمجھ نہیں پایا اور سمجھ تو میں یہ بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے دل میں میرا کیا مقام تھا...... حالاں کہ منگنی سے قبل میں نے اس

سے بات کی تھی لیکن اس کے رویے نے مجھے کوئی خاص مطمئن نہیں کیا تھا۔ اس کے چہرے پر قوس قزح نہیں پھیلی تھی۔ شرم سے پلکیں رخساروں پر سایہ فگن نہیں ہوئی تھیں۔ بس وہ حیران تھی' بے تحاشہ حیران...... یوں جیسے میری بات اس کے لیے قطعاً غیر متوقع ہو۔ عجیب من موجی سی' بے پرواسی لڑکی تھی۔

گو میں نے لفظوں میں اپنی محبتوں کو۔ اپنی شدتوں کو بیان نہیں کیا تھا مگر میری نگاہوں سے سب اداؤں سے تو سب کچھ عیاں تھا پھر محبت ایسا جذبہ کب ہے جو صرف زبان سے ہی بیان کیا جائے تو ظاہر ہو مگر اس کی حیرت تو مکمل بے خبری کا اظہار تھی۔

"اسفند بھائی...... آئی مین......" حیرانی سے مجھے دیکھتی وہ ایک لمحے کے لیے چپ ہوئی تھی اور حیرت کا یہ تاثر جو اس کے چہرے کو ایک عجیب سی دلکشی عطا کر رہا تھا۔ پہلی بار مجھے اچھا لگا تھا۔

"دیکھیے ناں...... یہ فیصلے اتنی جلدی تو نہیں ہوتے اور پھر میں تو ابھی گریجویشن کر رہی ہوں۔ شادی کے بارے میں تو ابھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ ماسٹرز کرنے کے بعد......"

"صاف کہو میں تمہیں پسند نہیں......" میری انا کو زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔

"نہیں' نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"یہی بات ہے۔"

"کمال ہے۔ آپ جانے کیوں ایسا سمجھ رہے ہیں۔ اچھا فیملی بیک گراؤنڈ...... ہائیلی ایجوکیٹیڈ' ہینڈسم اور ویل ڈریسڈ' آپ کو کون ناپسند کر سکتا ہے۔" اس نے فوراً کہا تھا اور میرا دل جیسے کچھ اور بوجھل ہو گیا تھا۔ میں نے عجیب سی کیفیت میں گھرتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"کسی کی نہیں تم اپنی بات کرو۔" میرا لہجہ خود بخود اکھڑ سا ہو گیا تھا۔

"اپنی......" اس نے بغور مجھے دیکھا تھا۔ اوپر سے نیچے تک...... یوں کہ ایک لمحے کے لیے تو میں نے خود کو بالکل چغد محسوس کیا تھا۔

"خاصے ہیرو ٹائپ بندے لگ رہے ہیں۔ اوپر سے ہماری پیاری پھپھو جانی کے لاڈلے بیٹے ہیں اب آپ کو ناپسند تو نہیں کیا جا سکتا نا...... مجبوری ہے......" شوخ سے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے آنکھوں میں شریری چمک لیے مجھے دیکھا تھا۔ نم نم سے گلابی لبوں پر دبا دبا تبسم تھا۔ میرا دل ایک دم کھل اٹھا تھا اور میں نے خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا تھا۔

"لیکن یاد رہے...... شادی کے لیے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ میرے ماسٹرز کرنے تک۔" اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا تھا اور چند لمحوں کے لیے میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

مجھے اس کی یہ بے باکی بری نہیں لگی تھی لیکن میرا دل شدت سے چاہ رہا تھا کہ ایک لمحے کو وہ شفق رنگ چہرے کے ساتھ پلکیں جھکا کر کھڑی ہو جاتی...... مگر مجھے لگتا تھا ایسا کبھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے جیسے شرمانا آتا ہی نہیں تھا۔

"سوری اسفند! آپ بور ہو رہے ہوں گے۔" یہ فرح تھی۔

"مائے بیسٹ فرینڈ...... آپ اس سے نہیں ملے۔ جب ہماری منگنی ہوئی تھی تو یہ لندن گئی ہوئی تھی۔ بہت پیاری سی ہے۔ آپ سے ملواتی لیکن آج کل بے حد پریشان ہے۔"

"کیوں پریشان ہے؟" مجھے یہ پوچھنا اچھا نہیں لگا تھا جب کہ اس کی باتوں سے معاملے کی نوعیت کی

سمجھ میں آ رہی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں شکی مزاج شخص کے ساتھ کبھی شادی نہیں کرنی چاہیے نہ تو وہ خود خوش رہتا ہے نہ دوسری کو رہنے دیتا ہے۔ یہ کوئی بات ہے کہ انسان محبت کا دعویٰ بھی کرے اور محبوب پر بھروسہ بھی نہ کرے حالاں کہ اعتماد تو محبت کی اولین شرط ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟" اس نے پوچھا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"ہماری مشترکہ فرینڈ ہے شمائلہ۔ ان کا گھرانا پرانے خیالات رکھتا ہے۔ اس کا نکاح اپنے کزن سے ہو چکا ہے مگر ملنے ملانے پر پابندی ہے۔ اس نے ویلنٹائن ڈے پر فرح کے توسط سے پھول اور کارڈ شمائلہ کو بھجوائے تھے۔ یہ چیزیں دیتے ہوئے فرح کے منگیتر محسن نے اسے دیکھ لیا۔ بس ساری محبت...... سارے وعدے ختم......" وہ طنزیہ ہنسی تھی۔

"کیا بس اتنی ہی ہوتی ہے آدمیوں کی محبت...... پانی کے بلبلے کی مانند۔" اس نے ایک دم میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔

"سب کی نہیں مائی ڈیئر۔" محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے میں نے کہا تھا۔

اس لمحے میری آنکھوں میں محبت کا جو ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن تھا اس سے اس کا بچ نکلنا کیسے ممکن تھا لیکن وہ بڑے آرام سے بچ نکلی تھی۔

"میں آپ کے لیے کچھ منگواتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ کچن کی جانب بڑھ گئی اور میں عجیب سی تشنگی لیے کر اس کی پشت دیکھتا رہ گیا تھا۔

"آخر وہ کھلتی کیوں نہیں؟ اس کے دل میں جو ہے ظاہر کیوں نہیں کرتی......؟ اس کا رویہ عام لڑکیوں سے اس قدر مختلف کیوں ہے لیکن عام لڑکی ہے......؟" میرے دل نے تاویل دی تھی۔ فوراً

وہ ٹرے اٹھائے مسکراتے ہوئے واپس آئی تھی۔

"یہ تنویر بھی بڑے کام کا آدمی ہے۔ دیکھا آپ نے کس قدر ایکٹیو ہے ہمارا شیف۔ آج بیلا اور کاشف بھائی لنچ پر آ رہے ہیں اور کھانے کے علاوہ ٹائم کوئی بھی ہو آپ کی پسند ایک ہی ہے۔" انار کے جوس کا گلاس میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا تھا اور عین اسی لمحے باہر سے آفاق ماموں کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ممانی جان دروازہ کھول کر باہر نکلی تھیں اور میں جو چند لمحے اکیلے میں اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا اس سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ کچھ دیر میرے پاس بیٹھنے اور سب کا حال احوال پوچھنے کے بعد ماموں اور ممانی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"آپ فریش ہو جاؤ اسفند! بیلا اور کاشف بھی پہنچنے والے ہوں گے اور آفاق آپ ذرا فون تو کریں۔ یہ نویلہ اور عارض کہاں رہ گئے ہیں......" ممانی جان نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا اور کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ ماموں بھی سیل فون پر نمبر پش کرتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"میں نے رشک سے انہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے بھی نکلتے ہوئے قد کے ساتھ آرمی کی فل یونیفارم میں وہ بے حد وجیہہ و شکیل اور جوان لگ رہے تھے۔ کسی طرح بھی تو نہیں لگتا تھا کہ وہ چار نوجوان بچوں کے والد ماجد تھے۔ شاور لینے کے بعد خاصی دیر میں نے تیار ہونے میں لگائی تھی ورنہ عموماً میری تیاری صرف چند منٹ کی ہوتی تھی۔

"میں اپنا آج اپنا کل تمہارے نام کرتا ہوں۔ میں اس جیون کا ہر اک پل تمہارے نام کرتا ہوں۔" گنگناتے ہوئے میں نے آخری بار آئینے میں

اپنے سراپا پر نگاہ ڈالی تھی اور بے حد مسرور انداز میں کمرے سے نکل آیا تھا۔ میرے بہکے بہکے قدم زمین پر تھے لیکن دل جیسے ہواؤں میں اڑ رہا تھا لیکن آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی زمین نے جیسے میرے قدموں کو جکڑ لیا تھا یا پھر کسی غیر مرئی طاقت نے میرے وجود کو پتھر کے مجسمے میں تبدیل کر دیا تھا۔ میں نے ہٹنا چاہا تھا اس منظر سے مگر کامیاب نہیں ہوا تھا۔
شاید یہ کوئی ڈراؤنا خواب ہو میں پلکیں جھپکوں اور یہ منظر غائب ہو جائے مگر نہیں...... نہ یہ کوئی خواب تھا نہ خیال تھا...... یہ ایک اٹل اور بے حد تلخ حقیقت تھی۔

سامنے صوفے پر اس بے حد اسمارٹ سے لڑکے کے کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھی وہ اڑا ایبلا ہی تھی۔ اس کا ہاتھ اس لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے چہرے کی بے تحاشہ چمک' آنکھوں کی انوکھی سی دمک' پلکوں کی کپکپاہٹ...... محبتوں کی شدتوں اور جذبوں سے معمور میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا جو کچھ نظر آ رہا تھا جو کچھ میرا دماغ مجھے سمجھانا چاہ رہا تھا۔ میں اسے جھٹلانا چاہ رہا تھا مگر جھٹلا نہیں پا رہا تھا۔
اور لڑکے نے جانے کیا کہا تھا کہ اس کے لب مسکرانے لگے تھے اور میری نگاہ ان مسکراتے لبوں پر جم کر رہ گئی تھی۔ شرمیلی سی وہ مسکان جسے دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس کر رہ گئی تھیں۔ اس کے لبوں پر سجی تھی مگر کسی اور کے لیے۔ میرے اردگرد جیسے اک الاؤ دہک اٹھا تھا جس میں ہر جذبہ جل کر خاکستر ہونے کو تھا۔
میں نے اپنی تمام تر توانائیوں کو مجتمع کرتے ہوئے اپنے جسم کو حرکت دی تھی اور قدموں کو گھسیٹتے واپس سیڑھیاں چڑھ کر گیسٹ روم میں چلا آیا تھا۔ میرے خون میں جیسے ابال سے اٹھ رہے تھے۔ لب دانتوں سے کچلتے ہوئے مٹھیاں بری طرح بھینچے ہوئے میں خود پر قابو پانے کی سعی کر رہا تھا ورنہ میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دوں۔ مار مار کر اس کا خوب صورت چہرہ بگاڑ دوں اور اپنا دل...... جو اس لڑکی کا اسیر تھا اسے نوچ کر پھینک دوں...... مگر کچھ بھی تو میرے بس میں نہیں تھا سوائے اپنی رائیگاں محبتوں کے ماتم کے......

......☆☆☆......

"صاحب جی! کھانے پر سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" شیف مجھے دوسری بار بلانے آیا تھا۔
بھوک کس کافر کو تھی اور پھر جو بندہ غم کھا رہا ہو اور غصہ پی رہا ہو اور اسے کسی اور چیز کی حاجت ہی کہاں ہوتی ہے مگر سب لوگ کھانے پر میرا انتظار کر رہے تھے تو مجھے جا کر کچھ نہ کچھ زہر مار کرنا ہی تھا کیونکہ مجھے یہ قطعاً گوارا نہیں تھا کہ مجھے گاؤں کا گنوار سمجھا جائے۔ بالوں میں برش پھیرتا خود پر جبر کر کے میں کمرے سے نکل آیا تھا۔
"السلام علیکم!" ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہوئے میں نے سب کو مشترکہ سلام کیا تھا پھر فرداً فرداً سب سے ملا تھا۔
"کیا بات ہے اسفند! کچھ سست سے لگ رہے ہو؟ کیا ہوا ہے؟" میرے چیئر پر بیٹھتے ہی آفاق ماموں نے پوچھا تھا اور ٹیبل پر یک دم خاموشی چھا گئی تھی۔ سب کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر اندر ہی اندر شدید جھنجلاہٹ محسوس کرتا بظاہر میں شائستگی سے مسکرایا تھا اور پھر تھکن کا عذر تراشتے ہوئے تھوڑا سالن اور سلاد اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بے دلی سے کھانے لگا تھا۔
کسی کی نگاہوں کی تپش مجھے مسلسل اپنے چہرے پر محسوس ہوتی رہی تھی اور یہ نگاہیں کس کی تھیں یہ جانتا تھا۔ ضبط کی تمام تر کوشش کے باوجود میری پیشانی شکن آلود ہو گئی تھی اور کنپٹیاں بری طرح سلگنے لگی تھیں۔ میں نے بمشکل چند لقمے زہر مار کیے تھے اور معذرت کرتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔
اٹھتے ہوئے میری نگاہ غیر ارادی اس کی نگاہوں سے جا ٹکرائی تھی۔ وہ الجھن آمیز نگاہوں سے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر پھیلتی بیزاری اور ناگواری کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی اور سر جھٹکتے ہوئے ڈائننگ روم سے نکل آیا تھا۔ اس وقت میرا ذہن شدید اضطراب و انتشار کا شکار تھا کسی بھی قسم کا استفسار گوارا نہیں تھا۔ اس وقت میرا دل کسی سے ملنے یا کسی قسم کی بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اسی لیے میں موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھاتا چپکے سے باہر نکل آیا تھا۔ ہاں چوکیدار کو اندر بتانے کا کہہ دیا تھا۔
پھر سیاہ بل کھاتی سڑک پر گاڑی دوڑاتا خالی الذہنی کی سی کیفیت میں جانے کس طرف نکل آیا تھا سوچے سمجھے کیے جانے والے کاموں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ سڑک کے کنارے گاڑی روکتے ہوئے میں نے سوچا تھا۔ ثرالے سے تعلق جوڑتے ہوئے بھی تو میں نے کچھ نہیں سوچا تھا۔ دل کے معاملے میں انسان بے اختیار ہو جاتا ہے لیکن زندگی کے فیصلے عقل کو پس پشت ڈال کر صرف دل کی خواہش پر کرتے ہوئے کیے جائیں تو خسارہ یوں ہی مقدر بن جاتا ہے جیسے میرا بنا تھا۔ کتنا سمجھایا تھا بی جان نے۔
"اسفند بے شک ثرالے میرے بھائی کی بیٹی ہے لیکن اس کے اور ہمارے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یاد رکھو ماحول کا اتنا فرق زندگی کے ہر موڑ پر مشکلات پیدا کرتا ہے۔ ابھی تو تمہیں

محبت کے جوش میں محسوس نہیں ہو رہا لیکن بعد میں یہی فرق ایک خلیج بن سکتا ہے۔ ایسی خلیج جسے مٹانا تم دونوں کے لیے مشکل ہو جائے گا۔" وہ مجھے سمجھا رہی تھیں لیکن میں جیسے کچھ بھی سمجھ نہیں پارہا تھا پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کچن کی طرف لے گئی تھیں۔ میں نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"خاموشی سے ماسی برکتے کو نماز پڑھتے دیکھو پھر تم سے بات کرتی ہوں۔" میں اچھے سے کچن کی پچھلی طرف بنے برآمدے میں نماز پڑھتی ماسی برکتے کو دیکھنے لگا تھا۔ پتہ نہیں بی جان کو کیا خیال آیا تھا ماسی برکتے کو دیکھنے لگا تھا پتہ نہیں بی جان کو کیا خیال آیا تھا۔ ماسی برکتے نماز پڑھ رہی تھی۔ برسوں سے پڑھتی تھی اس میں ایسی کون سی انوکھی بات تھی۔ ادھر ماسی برکتے نے سلام پھیرا تھا ادھر بی جان مجھے واپس لے آئی تھیں۔

"ہاں کیا دیکھا تم نے...... کیسی نماز پڑھ رہی تھی؟"

"ویسے ہی جیسے سب پڑھتے ہیں۔"

"پھر تم نے غور نہیں کیا...... رکوع سے سیدھی کھڑی نہیں ہوئی کہ سجدے میں چلی گئی اور سجدے سے اٹھ کر سیدھا ہو کر بیٹھنے کے بجائے ذرا سا سر اوپر کر کے دوبارہ ٹھک سے سجدے میں...... جب کہ میں نے اسے کئی مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی ہے کہ جو شخص نمازوں کو اپنے وقت پر ادا کرے، وضو بھی اچھی طرح کرے، خشوع وخضوع سے بھی پڑھے، کھڑا پورے وقار سے ہو پھر اسی طرح رکوع وسجدہ بھی اچھی طرح سے اطمینان کے ساتھ کرے۔ غرض ہر چیز کو اچھی طرح ادا کرے تو وہ نماز نہایت روشن اور چمک دار بن جاتی ہے اور نمازی کو دعا دیتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تیری بھی ایسی ہی حفاظت کرے جیسی تو نے میری حفاظت کی...... اور جو نماز کو برے طریقے سے پڑھے۔ وقت کا بھی خیال نہ رکھے، وضو بھی اچھی طرح نہ کرے، رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرے تو وہ نماز بری صورت سے رنگ میں نمازی کو بددعا دیتی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے بھی ایسا ہی برباد کرے جیسا تو نے مجھے ضائع کیا۔ اس کے بعد وہ نماز پرانے کپڑے کی طرح لپیٹ کر نمازی کے منہ پر ماردی جاتی ہے...... جب بھی میں یہ حدیث یاد دلاتے ہوئے برکتے کو سمجھاتی ہوں۔ یہ ڈرتی ہے، خوف زدہ ہوتی ہے اور آئندہ ٹھیک پڑھنے کا عہد کرتی ہے لیکن اگلے دن پھر ٹھیک سے نہیں پڑھتی کیوں......؟

اس کے پاس جواز ہے۔ بی بی ساری زندگی [illegible] بے بے کو یوں ہی نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ خود بھی یوں ہی پڑھی ہے۔ یاد ہی نہیں رہتا اور ویسے ہی پڑھ جاتی ہوں۔ اتنی پرانی عادت ہے آہستہ آہستہ ہی بدلے گی تو اسفند میرے بچے۔ برسوں کی عادت چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اللہ کے خوف سے بھی مشکل [illegible] آتی ہے تو ویسے تو...... پھر تم اور ثرالے دونوں ہی حد جذباتی ہو...... دونوں میں تحمل نام کو نہیں پھر تمہارا ارادہ بھی یہیں زمینوں پر کام کرنے کا ہے۔ نہیں اسفند مجھے یہ کسی طرح بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا میرے بچے۔"

لیکن میں تو جیسے پاگل ہو رہا تھا۔ دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ صرف اور صرف ثرالے...... ہر بات کے جواب میں میرا پاگل پن یہی پکارتا تھا۔ ہر طرف مجھے اس کا چہرہ نظر آتا تھا۔ اپنی طرف بلاتا تھا اور میں خود پر جیسے ہر اختیار کھو چکا تھا جو لپکا چلا جاتا تھا۔

محبت شاید نام ہی بے اختیاری کا ہے ورنہ [illegible] حیات کے لیے تو میرے ذہن میں ایک واضح [illegible]

[illegible] سلجھی ہوئی کچھ شوخ اور قدرے سنجیدہ سی لڑکی کا [illegible]ور تھا کہ میرے ماحول سے وہی میچ کرتی تھی۔ [illegible] بی جان کے معیار پر وہی پوری اترتی تھی لیکن [illegible]ت جب محبت کی آجائے تو انسان ذات پات، شکل صورت، عادات واطوار اور معیار سب بھول جاتا ہے۔ یہی کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔

اپنی زندگی کا وہ خوب صورت ترین دن جو اب بدصورت ترین لگ رہا تھا تمام تر جزئیات کے ساتھ میرے ذہن کی اسکرین پر محفوظ تھا۔ بی جان ٹھیک نہیں تھیں اور بابا جان احمد بھائی سے ملنے انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ ایسے میں خالہ زاد بیلا کی شادی میں شرکت کی ذمہ داری بی جان نے مجھے سونپی تھی...... میں ایسی تقریبات میں شرکت کا شوقین نہیں تھا لیکن اب ایسی بھی بات نہیں تھی کہ ضرورت کے تحت بھی شریک نہ ہوتا۔ کسی نہ کسی کو تو شرکت کرنا تھی۔ بابا جان اور بی جان کے بعد میں ہی [illegible] تھا۔

میرا ارادہ تو صرف شادی میں شرکت کا تھا لیکن بی جان کے اصرار کی وجہ سے مجھے مہندی کی تقریبات میں شرکت کرنا پڑی تھی۔ راستے میں [illegible] گاڑی خراب ہو گئی تھی اور میں چونکہ گھر سے [illegible] ٹائم پر نکلا تھا کہ بمشکل تقریب سے کچھ پہلے [illegible]تا...... اب اچھا خاصا لیٹ ہو گیا تھا اور اس وقت [illegible] پر گاڑیوں کی لمبی قطار کے پیچھے گاڑی روکے [illegible] جھنجلاہٹ کا شکار تھا کیونکہ گیٹ کے اندر مہندی سجے تھال اٹھائے لڑکیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

میں نے ایک نظر اپنے کپڑوں پر ڈالی تھی۔ چار [illegible] ڈرائیو کے بعد میری نفاست پسند طبیعت کو گوارا نہیں تھا کہ میں اس حلیے میں ان سب سجی سجائی لڑکیوں کے سامنے جا کھڑا ہوتا مگر یوں گاڑی پارک کیے ان سب کے نکلنے کا انتظار بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ دل ہی دل میں جھنجلاتے ہوئے میں کچھ دیر رنگ برنگے پیراہنوں میں لپٹے دلکش اور حسین چہروں کو دیکھتا رہا تھا پھر بے خیالی میں گاڑی گیٹ کے سامنے لے آیا تھا اور گاڑی رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر میرے برابر آ بیٹھی تھی۔ شہد رنگ بالوں کے ہالے میں چمکتا دمکتا چہرہ اور خوشبوؤں میں بسا سراپا...... میں حق دق سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"اوہ گاڈ! اریج بھائی رئیلی مجھے تو آپ پر ترس آ رہا ہے کہ کہاں دل لگایا ہے آپ نے...... اس قدر سست ہیں تالی آپی...... توبہ جیسے آ رہی ہیں نا تو ابھی یہ سیٹ ان بنیش نی بی نے کور کر لینی تھی۔" ایک ہی سانس میں کہتی ہوئی وہ مڑی تھی اور پھر اس کا منہ ایک دم بند ہوا تھا۔ پھیلی پھیلی نگاہوں سے مجھے دیکھتی وہ جیسے پتھر کا مجسمہ بن گئی تھی۔

اور میرا دل...... بس اس ایک لمحے میں......

صرف ایک پل میں ان حیران سے پھیلی آنکھوں میں کھو گیا تھا۔ میں سحر زدہ سا اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے سراپا سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو مجھے بے خود کیے دے رہی تھی تب ہی جیسے ایک دم اس پتھر کے مجسمے میں جان پڑ گئی تھی۔ اس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا اور بنا میری طرف دیکھے تیزی سے گاڑی سے اتر گئی تھی۔ ایک قدم آگے بڑھایا تھا پھر جانے کیا خیال آیا تھا یا میرے دل کی طلب تھی جو واپس کھینچ لائی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ ایکچوئیلی اریج بھائی کے پاس بھی بلیک کرولا ہے تو جلدی میں، میں یہ سمجھی کہ شاید وہ......" بے حد اعتماد سے کہتے کہتے وہ یک دم خاموش ہوئی تھی۔ شاید میرے کھوئے کھوئے اور بے خود سے انداز نے چونکایا تھا کہ جیسے تیزی سے آئی تھی

اسی تیزی سے پلٹ گئی تھی لیکن میرا دل بھی جیسے اپنے ساتھ ہی لے گئی تھی۔

حالاں کہ ایک سے ایک خوب صورت لڑکی وہاں موجود تھی لیکن پوری تقریب کے دوران بس وہی میری توجہ کا مرکز و محور بنی رہی تھی...... نہ دل کہیں اور مائل ہوا اور نہ نگاہ کہیں اور اٹھی تھی اور کہاں تو رخصتی کے فوراً بعد میرا ابھی رخصت ہونے کا پروگرام تھا اور کہاں ولیمے کے بعد بھی کام کا بہانہ کرکے دو دن میں وہیں دھرنا دے رہا تھا۔ حالاں کہ میں جانتا تھا کہ میری بی جان اور بابا جان کے نزدیک اپنی بہو کا تصور اس سے یکسر مختلف تھا...... مگر میرا دل...... یہ تو جیسے کسی ضدی بچے کی طرح مچل مچل کر اپنی ہی منوانا چاہتا تھا اور پھر اس نے اپنی منوا کر ہی چھوڑی تھی اور ٹھیک چار ماہ کے بعد جب میں نے ایک شاندار سی تقریب میں اسے منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی تو یوں شاداں فرحان تھا جیسے پوری دنیا فتح کرلی تھی۔

کس قدر نادان تھا میں، کیسا گھاٹے کا سودا کیا تھا میں نے...... کہاں دل لگایا تھا...... کس قدر آرام سے دھوکا کھایا تھا جس قدر سوچتا تھا غم و غصہ بڑھتا تھا...... لیکن کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا اور نہ سمجھ میں آنے والی تو یہ بھی تھی کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا تھا...... اگر وہ کسی اور کو چاہتی تھی تو اس نے مجھے کیوں اپنایا تھا؟ آخر اسے کیا مجبوری تھی...... جب کہ اس پر کوئی زبردستی، کسی قسم کا جبر اور کوئی دباؤ نہیں تھا...... میں نے خود اس سے اس کی رائے لی تھی...... اس نے اپنی مرضی سے...... اپنی خوشی سے...... مگر خوشی کا اظہار کب کیا تھا اس نے...... یہ تو میں پاگل تھا جو اپنے پاگل پن میں جانے کیا سمجھ بیٹھا تھا اور اب دل کے زیاں پر ماتم کناں تھا۔

☆☆☆

اس وقت لان میں ماموں، ممانی، نویلہ، عارض بھائی، بیلا اور کاشف بیٹھے تھے جب اس کے سیل فون کی بپ بجی تھی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا تھا۔ نمبر پر نگاہ ڈالی تھی اور پھر اٹھ کر اندر چلی گئی تھی۔ یقیناً اسی لڑکے کا فون تھا۔ میرے خون میں جیسے ابال سے اٹھنے لگے تھے۔ لب دانتوں تلے کچلتے ہوئے جانے کیسے میں نے اندر کی کیفیت پر قابو پایا تھا ورنہ دل تو یہ چاہ رہا تھا ہر چیز کو تہس نہس کر دوں۔ مار مار کر اس کا خوب صورت چہرہ بگاڑ دوں یا پھر اپنا دل...... جو اس لڑکی کا اسیر ہوا تھا اسے نوچ کر کہیں پھینک دوں۔

مگر میں کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے ضبط کرنے کے...... اور خود پر جبر کرنے کے سوا اس وقت کچھ نہ تھا جب کچھ دیر بعد وہ ہنستی مسکراتی میرے کمرے میں آئی تھی۔

"اسفند! آپ آ نہیں رہے؟ سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں...... رضی اور ایمی بھی آگئے ہیں۔ عارض بھائی کی جیب خالی کروانے کا پروگرام ہے سب کا...... جلدی سے آجائیں ابھی راستے میں انی کو بھی پک کرنا ہے......"

"محترمہ آپ تشریف لے جائیں۔ مجھے کہیں نہیں جانا اور دوبارہ اس کمرے میں آنے سے گریز کیجیے گا۔ میں اپنی پرائیوسی میں ہر کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا۔" کاٹ دار نگاہیں اس کے چہرے پر جماتے ہوئے میں نے انتہائی درشت لہجے میں کہا تھا۔ وہ چند لمحے ہکا بکا سی مجھے دیکھتی رہی تھی پھر ایک دم پلٹی تھی اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔

اگلے دن میں رات گئے واپسی کے ارادے کے ساتھ صبح سویرے گاڑی لے کر نکل گیا تھا۔ موبائل میں نے آف کر دیا تھا تا کہ میرے نہ پہنچنے پر سب بار

بار فون نہ کریں...... آخر میں اسپیشل اس کی سالگرہ پر تو اتنی دور سے آیا تھا...... لازماً وہ سب میرا انتظار کرتے اور میرے نہ آنے پر مجھ سے رابطے کی سعی کرتے لیکن مجھے اب کسی کی پروا نہیں تھی۔

رات گئے جب میں گھر لوٹا تو مارے تھکن کے میرا برا حال تھا۔ گاڑی پورچ میں کھڑی کرتے ہوئے میں جلد از جلد اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر گر جانا چاہتا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھول کر تھکے تھکے قدموں سے میں اندر داخل ہوا تھا اور اپنے کمرے میں جانے کے لیے سیڑھیوں کی جانب بڑھا تھا۔ تب ہی میری نگاہ اٹھی تھی اور اس کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتے منظر نے میرے قدموں کو ساکت کر دیا تھا۔ خون میری کنپٹیوں میں جوش مارنے لگا تھا۔ وجود میں جیسے ابال سے اٹھنے لگے تھے۔ شدید طیش کی حالت میں، میں تیزی سے آگے بڑھا تھا پھر بری طرح ٹھٹک گیا تھا۔

"فرح کی بچی! اسٹوپڈ کیا خود کو بھی ان سگرٹوں کے ساتھ پھونکنے کا ارادہ ہے؟" سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے وہ تیز آواز میں کہہ رہی تھی اور میں حیران و ششدر سا جینز اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں ملبوس، بوائے کٹ بالوں والی اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کو سائیڈ سے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔

میں ایک دم جیسے ہلکا پھلکا ہو کر ہواؤں میں اڑنے لگا تھا لیکن یہ کیفیت چند لمحے ہی رہی تھی۔ اپنا گزشتہ رویہ یاد آتے ہی اس کے بارے میں، میں کیا کیا سوچتا رہا تھا...... کس قدر بدگمان ہو گیا تھا یہ خیال آتے ہی احساس ندامت سے میرا سر جھک گیا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی کہ انسان محبت کا دعویٰ بھی کرے اور محبوب پر اعتماد بھی نہ کرے حالاں کہ اعتماد تو محبت کی اولین شرط ہے۔" اس نے کہا تھا اور میں سو فیصد اس سے متفق تھا پھر میں نے یہ کیا کیا تھا...... بالکل فرح کے منگیتر محسن والا کردار ادا کیا تھا...... اور اگر وہ یہ سب جان لے تو...... اس سوچ کے ساتھ ہی میری پیشانی نم سی ہو گئی تھی تب ہی میری نگاہیں اٹھی تھیں اور لاؤنج کی آرائش سے ہوتی ہوئی دیوار پر جم گئی تھیں۔

"ہیپی برتھ ڈے ٹو ڈالے۔"

میرے لبوں نے بے آواز پڑھا تھا اور ندامت کے ساتھ ساتھ ایک گہرا ملال بھی آن ملا تھا۔ کتنے خوب صورت لمحے تھے جو اپنی بدگمانی کی نذر کر دیے تھے میں نے...... تاسف سے سوچتے ہوئے میں دبے پاؤں واپس پلٹا تھا اور اپنی گاڑی میں آ بیٹھا تھا۔ میں اپنی نگاہوں میں بے شک چھوٹا ہو گیا تھا لیکن اس کی نگاہوں میں سربلند رہنا چاہتا تھا۔

گیٹ سے نکلتے ہی گاڑی کو فل اسپیڈ سے دوڑا لیا تھا۔

مجھے جلد از جلد کیک اور ڈھیر سارے پھول خریدنے تھے۔ کارڈ خریدنا تھا اور اس پر وہ خوب صورت اشعار لکھنے تھے جو میں پھاڑ کر پھینک چکا تھا لیکن میرے دل پر لکھے ہوئے تھے۔

اس قدر لیٹ ہونے پر، موبائل کے آف ہونے پر...... کوئی موزوں سا عذر تراشنا تھا اور خود سے عہد کرنا تھا کہ آئندہ اس کے اور میرے درمیان کوئی غلط بیانی ہوگی نہ بدگمانی...... کام زیادہ تھے اور وقت کم تھا لیکن شکر کا مقام یہ تھا کہ گزرا نہیں تھا۔

برادرم عمران احمد
السلام علیکم!
اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مبین میں فرمایا ہے۔ بے شک انسان خسارہ میں ہے۔ کیونکہ ہم بہت ہی ناشکرے ہیں۔ یہ بات عام مشاہدے میں ہے کہ ہم خوشیوں پر تو اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس پر کبھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے لیکن جب بھی ذرا سی تکلیف ہوجائے تو اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ زیر نظر کہانی بھی ایک ایسے ہی شخص کی ہے جسے اچانک ہدایت مل گئی تھی۔
والسلام
محمد سلیم اختر
راولپنڈی

زاہد علی ایک سرکاری ادارے میں کلاس ون کا آفیسر تھا۔ سرکاری گاڑی' رہائش اور سرکاری ملازم بھی ملے ہوئے تھے۔ اسے دنیا کی ہر آسائش میسر تھی۔ خوب صورت بیوی تھی۔ تین بچے تھے۔ گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مگر وہ اپنے مذہب سے بہت دور تھا۔ نماز اور روزے کی اسے پرواہی نہ تھی۔ جمعہ والے دن دفتر سے جلدی چھٹی ہوجاتی تھی۔ مگر وہ نمازِ جمعہ ادا کرنے کے بجائے دفتر میں ہی بیٹھا رہتا اور شام ڈھلے گھر لوٹتا۔ اس کے دفتر کا چپراسی اس سے بہت تنگ تھا۔ اس کا باقی ماتحت اسٹاف بھی اس سے نالاں ہی رہتا تھا۔ کیونکہ وہ انہیں سہولتیں دینے کے بجائے انہیں خوامخواہ تنگ کرتا تھا۔ خاص کر چھٹیوں کے معاملے میں وہ بہت ہی سخت تھا۔ کسی کا کوئی عزیز فوت ہوجاتا تو تب بھی اسے مشکل سے ہی چھٹی ملتی تھی۔ ایک اسٹاف ممبر کو اس کی شادی پر اسے صرف دو دن کی چھٹی دی تھی۔ اسٹاف والے ہر وقت اس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ ایک وہ تھا کہ اسے کسی کی پرواہی نہ تھی۔ وہ کسی کے سکھ میں شریک ہی نہ ہوتا تھا۔ گھر والوں سے بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ بیوی اور بچے بھی اس سے کنی کتراتے رہتے تھے۔

●......●......●

ماہِ رمضان کی آمد آمد تھی۔ اس کی بیوی باقاعدگی سے نماز پڑھتی تھی اور اب رمضان کے استقبال کی وہ جوش و خروش سے تیاریاں کر رہی تھی۔ وہ پورے ماہ کا سودا سلف پہلے ہی لے آئی تھی۔ مگر زاہد کو تو پرواہی نہ تھی۔ اس کو تو رمضان کی فکر ہی نہ تھی۔ اس رات وہ ساکت و صامت گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی اس کی بیوی اپنے بستر پر موجود نہیں تھی لیکن قریب ہی سے اس کی مدہم اور پرسوز آواز سنائی دی۔ وہ خالق کائنات سے سرگوشیوں میں مصروف تھی اور جائے نماز پر بیٹھی اپنے خاوند کے لیے خیر و برکت' رزق بے حساب اور اللہ کی خوشنودی اور رضا کی طلب گار تھی۔ زاہد نے سکوتِ شب میں اپنی بیوی کی سرگوشیاں پہلے بھی سنی تھیں۔ وہ سوچتا' عجیب مجذوب عورت ہے۔ پھر کروٹ بدل لیتا اور گہری نیند کے مزے لوٹنے لگتا لیکن اس رات وہ کروٹ نہ بدل سکا۔ اس کی آنکھوں سے نیند بھی اڑ گئی۔ ایک عجیب سا احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا اور اس کا دل اور دماغ ایک مسحور کن لذت سے آشنا ہو چلے۔ کمرے میں بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نورانی ہاتھ نے اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر کر رحمت کے بند دروازے کھول دیے ہیں۔ جیسے ہولے ہولے بادِ صبا محوِ خرام ہو۔

وہ چپ چاپ بستر میں لیٹا رہا۔ جیسے وہ سو رہا ہو۔ شاید وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس حسین و جمیل نورانی دنیا کے احساس سے باہر نکل آئے۔

اچانک رات کے اس پچھلے پہر سارا گھر جاگ اٹھا۔ چہل پہل کا عجیب سا سماں تھا لیکن زاہد کے لیے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہ تھی۔ اس کا مشاہدہ تو وہ ہر سال ایک مدت سے کرتا آیا تھا۔ آج بھی اس کی بیوی اور بچے بابرکت رمضان کی پہلی سحر کا استقبال جوش و خروش سے کر رہے تھے۔ ایک عجیب و غریب احساس نے اسے چپ سی لگا دی۔ ورنہ وہ بیوی بچوں کو ڈانٹ پلا دیتا ہر سال رمضان میں اس کا یہی وتیرہ ہوتا تھا۔

''خاموش ہوجاؤ' کبھی تو آرام کرلینے دیا کرو۔ جب بھی دیکھو شور مچ رہا ہے۔ راتوں کی نیند حرام کردی ہے۔'' لیکن آج کی رات وہ کچھ نہ بولا۔ اس کی تو کیفیت ہی بدل چکی تھی۔ وہ بستر میں گم صم لیٹا بچوں کی مترنم آوازوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ان کے محبوب ترین مہینے کا آغاز تھا اور وہ بھی اس استقبال میں ان کے ساتھ شریک ہوجانے کی نامعلوم سی آرزو پہلو میں دبائے خاموش لیٹا تھا۔ اس کا جی چاہا یہ استقبالیہ سحر کبھی ختم نہ ہو۔

کبھی بچے دسترخوان پر بیٹھے میٹھی میٹھی باتوں میں مشغول تھے۔ ننھا بلال بھی روزہ رکھنے کے موڈ میں تھا۔ عالم مسرت میں اس کی آواز سب آوازوں سے بلند تھی۔ زاہد نے سنا بلال اپنی توتلی زبان میں ماں سے کہہ رہا تھا۔ ''امی! ابو بھی ہمارے ساتھ ہی روزہ رکھیں گے نا؟''

ماں نے آہستہ سے کہا۔ ''نہیں بیٹے ابو تمہارے تھکے ہوئے ہیں۔''

''امی! کیا ابو ہمیشہ ہی تھکے ہوتے ہیں۔ وہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں انہیں بھی جگائیں وہ بھی ہمارے ساتھ روزہ رکھیں گے۔'' ننھے بلال نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

ماں کسمسا کر خاموش ہوگئی۔

بلال نے ٹھیک ہی تو کہا تھا۔ زاہد بالکل صحیح سلامت اور صحت مند تھا۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کی زبان سے یہ تنقید سن کر تڑپ اٹھا۔ اس کا احساس بیدار ہونے لگا۔ اس قسم کے حادثے سے وہ زندگی میں پہلی بار دوچار ہوا تھا۔ آج سے قبل اس نے رمضان کی اہمیت یا روزے کے فلسفے پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ اس نے تو آج تک تجربہ کے طور پر بھی روزہ نہیں رکھا تھا۔

●......●......●

وہ بچپن میں ہی ماں باپ کے سائے اور مناسب تربیت سے محروم ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے چچا کے گھر پرورش پائی تھی۔ اس کا چچا نہایت ہی خوشحال اور دولت مند تھا۔ جس کے احساسات کی دنیا عام انسانوں سے بہت مختلف تھی۔ وہ کہتا تھا۔ دین اور دنیا اکٹھے نہیں چل سکتے۔ شعائر دین کی بجا آوری اس مہذب دنیا میں ناممکن ہے۔ سب کچھ بھی ہو زاہد کو آج تک بھوکا پیاسا رہنے کا تجربہ نہ ہوا تھا۔ مگر آج پہلی بار وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ آخر ہر سال رمضان کے مہینے میں بیوی اور بچوں کی مسرت و شادمانی کا راز کیا ہے؟ روزانہ بارہ چودہ گھنٹے کھانے پینے سے محروم رہنے میں انہیں کون سی لذت محسوس ہوتی ہے؟

اسے گزشتہ برس کا واقعہ خوب یاد تھا۔ اس کا بیٹا دانیال جس نے دسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ غروب آفتاب سے ذرا پہلے پیاس کی وجہ سے بے حال ہوگیا لیکن کسی نامعلوم جذبے کے تحت اس نے پیاس کی شدت پر قابو پائے رکھا۔ اس نے دانیال کو بہت سمجھایا۔ ٹھنڈے پانی کے دو چار گھونٹ پی لے لیکن وہ نہ مانا اور اس سال بھی اس نے ارادہ کیا کہ اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو دوپہر کے کھانے میں شریک ہونے پر رضا مند کرلے گا لیکن ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اس کی جرأت نہ کرسکا۔

اور خبر نہیں آج اسے کیا ہوگیا تھا کہ رات کے پچھلے

پہر بچوں کے شور وغل کے باوجود اس کی قوت احتجاج بھی چھن چکی تھی۔ یہ کیسا عجیب وغریب احساس تھا کہ کوئی انجانی قوت اسے یہ کہنے پر مجبور کر رہی تھی کہ میں خالصتاً اللہ کے لیے کل کے روزے کی نیت کرتا ہوں۔

یہ جملہ وہ کئی برسوں سے اپنی بیوی کی زبان سے سنتا چلا آیا تھا لیکن آج سے پہلے اس نے کبھی ان الفاظ پر غور نہیں کیا تھا۔

اس نے بستر میں لیٹے لیٹے لمبا سانس لیا۔ وہ ایک اہم فیصلہ کر چکا تھا اور اس شخص کی طرح مطمئن اور پرسکون نظر آیا۔ جس نے اپنے کندھے سے بھاری بوجھ اتار پھینکا ہو۔ اس کی زندگی میں ایک عجیب سا تغیر ہو چکا تھا۔ اس کی توجیہہ اس کے ذہن میں نہ آ رہی تھی۔ آخر شب کے ایک مختصر لمحے نے اس کے جذبات کا دھارا ہی بدل دیا تھا۔

وہ صبح سویرے خوش وخرم اور ہلکا پھلکا بستر سے نکلا۔ اس کی بیوی نے حسب عادت اس کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہی ہو۔

''ہم سب کا تو روزہ ہے کیا آپ کے لیے ناشتا لے آؤں۔'' اس کو معلوم تھا اگر اس نے پہل کر کے پوچھ نہ لیا تو دیر تک پھوہڑ عورت ہونے کے طعنے سننا پڑیں گے لیکن آج اسے یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اس نے ناقابل یقین لیکن حیرت افزا مسرت سے اپنے شوہر کو یہ کہتے سنا۔ ''میرے لیے ناشتا تیار نہ کرنا۔ آج میرا روزہ ہے۔''

بلال کہیں قریب ہی بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ معصومانہ انداز میں بستر سے اچھل کر باہر نکلا اور تالیاں بجاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''ابو کا روزہ ہے ابو کا روزہ ہے۔''

اور اس سے پہلے کہ باقی بچے بھی بلال کی اس تعجب انگیز خوشی میں شریک ہو جائیں۔ زاہد کپڑے بدل پہن کر دفتر جا چکا تھا۔

● ● ●

زاہد فطرتاً ہی تیز مزاج افسر تھا۔ بہت جلد غصے میں آجاتا تھا۔ لیکن آج اس کی حالت میں عجیب تبدیلی در آئی تھی۔ اس نے گھر سے دفتر پہنچنے تک کئی ایسی باتیں خاموشی سے گوارا کرلیں جن کا وہ عادی نہ تھا۔ گاڑی میں خاموش پرسکون انداز میں بیٹھا رہا۔ آج اسے دفتر کے چپراسی پر بالکل غصہ نہ آیا۔ جو عادتاً اس کے استقبال کے لیے کسی تھکے ماندے انداز میں اٹھا تھا۔ بلکہ اس نے خود پہل کر کے اسے سلام کیا۔ محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور ماہ رمضان کی آمد کی مبارک باد دی۔ پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر پانچ سو کا ایک نوٹ نکالا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔ شام کو گھر جاتے وقت افطاری کے لیے کچھ لے جانا بچے خوش ہوں گے اور پھر زاہد علی چپراسی کو حیرت میں ڈوبا چھوڑ کر اپنے دفتر میں داخل ہوا۔ باہر اس کا چپراسی اپنے ساتھی سے تعجب انگیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آج صاحب بدلے بدلے نظر آتے ہیں۔ ضرور کوئی بات ہے۔''

''اچھا کیا آج صاحب نے تمہیں دیکھتے ہی جھڑکیاں نہیں دیں؟ تعجب ہے۔''

اور پھر تھوڑی ہی دیر میں چپراسی کی یہ بات پورے دفتر میں پھیل گئی۔ ہر ایک زاہد صاحب کے مزاج کی تبدیلی ہی کی بات کر رہا تھا اور حیرانی کا اظہار بھی کر رہا تھا۔ دفتر کا سپروائزر روزمرہ کی ڈاک اور چند ضروری لیٹرز پر دستخط کرانے کی غرض سے صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ سپروائزر بے چارہ روزانہ کی طرح آج بھی سخت الفاظ سننے کے لیے آیا تھا۔ جانور، نکما انسان، بے وقوف، کند ذہن وغیرہ وغیرہ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے صاحب کو نہایت ہی پرسکون اور غیر جذباتی انداز میں کہتے سنا۔

''رحمن صاحب! آپ روزے سے ہیں۔''

''ہاں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

''بہت خوب اللہ تعالیٰ آپ کو بہت سے ایسے رمضان مبارک کرے۔''

''جناب آپ کو بھی رمضان مبارک ہو۔'' اس نے جرأت سے کہا۔

''شکریہ اچھا جائیے یہ لیٹر دوبارہ ٹائپ کروا کر لائیے۔ رمضان شریف کا تقاضا ہے۔ ہم اصلاح کے پہلو پر زیادہ توجہ دیں۔'' زاہد نے نرمی سے کہا۔

''بہت اچھا جناب۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔''

پورا دن دفتر کے سارے ملازموں میں اپنے ظالم افسر کے اخلاق اور عادات میں اس عظیم انقلاب پر تبصرے جاری رہے کسی نے کہا۔ ''ممکن ہے آج صاحب کا روزہ ہو۔'' دوسرے نے فوراً ٹوکا۔ ''تم نے بھی حد کر دی۔ یہ ناممکن ہے صاحب تو آج تک کسی بھی ایسے نیک کام کے قریب نہیں پھٹکے۔''

''چلو چپراسی سے پوچھتے ہیں۔''

چنانچہ چپراسی کو بلایا گیا اور اس تبدیلی کے بارے میں اس کی رائے طلب کی گئی۔ اس نے جواب دیا۔

''بالکل ٹھیک ہے صاحب کا آج روزہ ہے۔ میں ان کے لیے قہوہ لے کر گیا تو انہوں نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور صرف یہ کہا۔ بھئی ماہ رمضان شروع ہو چکا ہے۔'' اور تھوڑی ہی دیر بعد اسٹاف کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ زاہد علی پہلی بار اسٹاف کے کمرے میں آیا۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے مصافحہ کیا۔ سب کی خیریت پوچھی ماہ رمضان کی مبارک دی اور پہلے ہی یہ پیشکش کر دی کہ جو بھی اعتکاف میں بیٹھنا چاہے اسے میں پورے ایک ماہ کی چھٹی دوں گا۔

ظہر کے بعد اسے قدرے نقاہت کا احساس ہوا اور سر بوجھل سا ہو گیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے سو جائے لیکن اس نئے احساس نے ان سب کیفیتوں پر قابو پالیا۔ وہ خود بھی حیران تھا کہ اس کی قوت ارادی میں کس قدر شدت آ چکی ہے۔ وہ سگریٹ کا عادی تھا۔ ہر وقت ایک آدھ ڈبیا اس کی جیب میں موجود رہتی تھی۔ ذرا دیر کے لیے ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ ایک آدھ کش لے یہاں کون دیکھ رہا ہے لیکن اس نے فوراً ان نفسانی خواہشات کا تصور ذہن سے جھٹک دیا۔ اس گھڑی اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک طاقت ور انسان ہے اور انسان کی قوت کا اندازہ صرف اس کے مضبوط جسم سے نہیں ہوتا۔ بلکہ طاقت کا اصل منبع اور مرکز اس کے ارادے کی پختگی اور عزم کی بلندی میں پوشیدہ ہے اور کمتر درجے کی خواہشات نفس پر قابو پا کر بلند تر آرزوؤں اور تمناؤں کا حصول ممکن ہو سکتا ہے اور یقیناً روزہ عزم اور ارادہ کی تربیت اور عظیم مقاصد کے لیے نفس کو برانگیختہ کرنے کا اہم ترین ذریعہ ہے۔

یہ وہ حقائق تھے جنہیں زاہد علی مدتوں سے سنتا چلا آ رہا تھا لیکن آج خود اس کے تجربے نے اسے ان پر باقاعدہ ایمان لانے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

پچھلے پہر وہ خوش وخرم ہنستا مسکراتا گھر لوٹا۔ اس کی بیوی زاہد کا اچھا موڈ دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھی۔

پھر وہ کچھ دیر کے لیے سو گیا۔ پھر تر وتازہ ہو کر اٹھا اور بیوی بچوں کے ساتھ افطاری کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔ آج اسے شاید زندگی میں پہلی مرتبہ۔ سائرن یا موذن کی آواز کا انتظار تھا اور جوں ہی اس نے غروب آفتاب کے وقت سائرن اور ساتھ ہی اذان کی آواز سنی۔ اسے بے پایاں مسرت اور شادمانی کا احساس ہوا۔ جو ہر انسان اپنی عزیز ترین اور بلند ترین آرزو کی تکمیل پر محسوس کرتا ہے۔ اسے بھی اپنی آرزو کی تکمیل کا احساس ہونے لگا اور پہلی مرتبہ اسے اس جملے کا حقیقی مفہوم سمجھ میں آیا تھا۔

''رمضان شریف مبارک! اللہ تمہیں ایسے کتنے ہی رمضان مبارک کرے۔''

اس نے بچوں اور بیوی کے ساتھ مل کر افطاری کی اور پھر اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ گئے۔

☐

قسط نمبر 8

شہناز بانو

دنیا میں فساد کا محرک زن' زر' زمین رہی ہے۔ دنیا کا پہلا قتل بھی عورت ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نیا سلسلہ وار ناول ہمارے موجودہ دور کی کہانی ہے۔ اس کے بیش تر کردار ابھی تک بقید حیات ہیں۔ کچھ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرچکے ہیں۔ جب کہ بعض کے دامن میں صرف پچھتاوے باقی رہ گئے ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ وقت کی گرد نے ان کی شناخت تک گم کردی ہے۔

اس طویل داستان میں محبت اور نفرت کے تمام رنگ اپنی پوری شدت کے ساتھ موجود ہیں۔ کہیں مجبوری' بے بسی اور مفلسی کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں تو کہیں جابروں اور ظالموں کے سماعت شکن قہقہے گونجتے ہیں۔ کہیں قانون اپنے روایتی انداز میں مظلوموں کی عزت و جان سے کھیلتا نظر آتا ہے تو کہیں جابروں کی دہلیز پر ماتھا ٹیکتا دکھائی دیتا ہے۔

تحیر اور ایکشن پسند قارئین کے لئے نئے افق کی دلکش و دلچسپ سلسلے وار کہانی

رشنا میری جانب ترحم نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں اس کے اس طرح دیکھنے سے الجھ سا گیا اور پوچھا۔

''مجھے بتاؤ تو سہی کہ آخر یہ غضنفر کون ہے' میں نے بار بار اس کا نام سنا ہے لیکن آج تک اس کا دیدار نصیب نہیں ہوا۔''

اس کے حسین لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں پر پڑنے والے ڈمپل اس کے حسن میں مزید اضافہ کررہے تھے' لمحہ بھر کو میں اس کے حسن میں کھو سا گیا اور اسے یک ٹک دیکھنے لگا۔

''اے..... کہاں کھو گئے!'' اس نے اس بات کو محسوس کر کے کہ میں اس کے حسن کے آگے مبہوت ہوگیا ہوں' میرے آگے چٹکی بجا کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''آں..... ہاں! کہیں نہیں۔'' میں نے ہڑبڑا کر کہا اور جھینپ کر ہنس دیا۔ ''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' میں نے کہا۔

''سوال کر کے تم نہ جانے کہاں کھو گئے تھے تو میں کیا جواب دیتی۔'' اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

''جب تم جیسا مکمل حسن کا شاہکار سامنے ہو تو پھر کسی اور بات کا ہوش ہی کہاں رہتا ہے۔'' میں نے بھی شوخ لہجے میں کہا' لیکن وہ فوراً ہی سنجیدہ ہوگئی اور بولی۔

''یہ باتیں اپنے وقت پر اچھی لگتی ہیں کام کے وقت کام ہی مناسب ہوتا ہے۔''

''اچھی طرح سے جانتا ہوں۔'' میں نے بھی سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں تو میرے سوال کا جواب.....؟''

''غضنفر کون ہے اور درپردہ وہ تم سے کس طرح سے کام لے رہا ہے۔ یہ تمہیں وقت آنے پر خود ہی معلوم ہوجائے گا' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو ظاہر کردے۔ فی الحال میں تمہیں کوئی بھی بات بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔''

''لیکن رشنا اس طرح تو میں ذہنی الجھن کا شکار رہوں گا اور ہر دوسرے شخص پر شک کروں گا کہ کہیں

یہ تو غضنفر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔
''تم اس بارے میں سوچو ہی مت' نہ سوچو گے اور نہ ہی الجھن ہوگی۔'' اس نے کہا پھر بولی۔
''اچھا اب مجھے جانا ہوگا۔ تم یہ سم لے لو اور اسے ایک دوسرے موبائل فون پر لگا لو' یہ موبائل فون تمہیں ہر وقت اپنے پاس رکھنا ہوگا' یہ بھی یاد رہے کہ فون ہمیشہ آن رہے اور اس پر صرف میری ہی کال آئے گی اور تم اسی نمبر سے مجھے کال کرو گے' صرف کام کی بات...... ! سمجھ گئے یا اور......''
''بس!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''میرے لیے صرف ایک دفعہ کی بات کافی ہوتی ہے۔''
''ویری گڈ۔'' اس نے پرمسرت لہجے میں کہا۔
اور پھر اس نے پرس سے نکال کر مجھے سم دی جسے میں نے سنبھال کر رکھ لیا۔ تو وہ بولی۔ ''موبائل تمہیں نواب صاحب دے دیں گے۔''
اور پھر وہ چلی گئی' اس کے کمرے سے جاتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے ایک دم بہت سی روشنی کم ہوگئی ہو' میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ گزاری ہوئی وہ رنگین رات مجھے ساری عمر یاد رہنے والی تھی۔
میں دانستہ اس کے پیچھے باہر نہیں گیا کہ ہوسکتا ہے کہ نواب صاحب کو اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہوں۔ اگر میں چلا گیا تو وہ انہیں اچھا نہیں لگے گا۔''
میرے پاس فی الحال کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لیے لیٹ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ ایک انڈین موووی آرہی تھی میں وہ دیکھنے لگا۔
آدھا گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ میرا بلاوا نواب صاحب کی جانب سے آگیا تو میں ٹی وی آف کرکے باہر آگیا۔ ملازم نے کہا کہ نواب صاحب اپنے روم میں آپ کو یاد فرمارہے ہیں' نواب صاحب کا کمرہ کون سا ہے یہ مجھے معلوم نہیں تھا وہاں تک رسائی میں نے ملازم کے ذریعے کی۔
نواب صاحب کے روم میں قدم رکھتے ہی میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ کمرہ کسی شہنشاہ کی خواب گاہ معلوم ہورہا تھا۔ ایسی خواب گاہ کم از کم میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔
نواب صاحب کا بیڈ اتنا نرم و ملائم تھا کہ وہ اس میں دھنسے ہوئے تھے۔
ریشمی جھالروں والے قیمتی اور نفیس پردے' قیمتی آبنوسی لکڑی کا فرنیچر' اعلیٰ معیار کے ڈیکوریشن پیس اور قیمتی سینریاں دیواروں پر آویزاں تھیں۔ ایک قد آور پوسٹر ایک برہنہ حسینہ کا تھا۔
میں نے کمرے میں قدم رکھا تو ایسا لگا جیسے میرے پیر زمین میں دھنس گئے ہوں۔ میں نے بے ساختہ گھبرا کر نیچے نگاہ کی تو میرے پیروں تلے نفیس قیمتی دبیز قالین تھا۔
سب سے عجیب بات جو مجھے لگی وہ یہ تھی کہ دو حسین اور جوان لڑکیاں نواب صاحب کے اس کمرے میں موجود تھیں جو ناکافی لباس میں تھیں ایک اس کی پنڈلیوں کو سہلا رہی تھی۔ دوسری سرہانے بیٹھی ملائمت سے ان کے مختصر سے بال جو سر پر موجود تھے ان میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔
''آؤ شمروز رک کیوں گئے......'' نواب صاحب نے مجھے دیکھ کر کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے کہا تو میں سحر زدہ سا اندر داخل ہوگیا۔
''بیٹھو!'' انہوں نے آبنوسی کرسی جو بیڈ سے نزدیک تھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو میں بیٹھ گیا۔
''آپ نے یاد فرمایا تھا نواب صاحب!''
''ہاں!'' انہوں نے مجھے جواب دیا پھر لڑکیوں کو ہاتھ کے اشارے سے باہر جانے کے لیے کہا۔ وہ فوراً

ہی بیڈ سے اتر کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ دونوں نے نہایت قیمتی سلک کا مختصر سا لباس پہنا ہوا تھا۔
''یہ میری خادمائیں ہیں۔ منع بھی کروں لیکن میری خدمت کرنا اپنا فرض سمجھتی ہیں۔'' نواب صاحب نے کہا تو میں محض سر ہلا کر رہ گیا۔
نواب صاحب کا یہ روپ میں پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا' کبھی سنا تھا کہ نواب لوگ بہت عیاش ہوتے ہیں' لیکن ان کے بارے میں تو مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ اپنے دادا کے سجادہ نشین ہیں' لوگوں کو ان سے بڑی عقیدت ہے' وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے تمام مسائل کا حل ان ہی کے پاس ہے' کوئی ذرا آ کر ان کے ایسے عشرت کدوں کا حال دیکھے' نواب صاحب کی شخصیت اب میرے سامنے کھلتی جارہی تھی۔
''تمہیں رشنا نے کوئی سم دی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔
''جی ہاں!'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔
''یہ سامنے ٹیبل پر ایک موبائل پڑا ہے تم اسے اٹھا لو اور وہ سم اس میں لگا لینا' میری جانب سے تمہیں اجازت ہے کہ تمہارا جب جی چاہے تم اپنی اس نئی دوست سے ملنے کے لیے جاسکتے ہو' اس سے ملاقات کرسکتے ہو' یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ خود بھی تمہیں بلانا چاہے' تم فوراً چلے جانا۔''
''بہت بہتر نواب صاحب۔'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔
''ہمیں تم بہت ہی پسند آئے ہو' اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے خاص آدمیوں میں شامل ہوجاؤ۔ ویسے تو زیادہ تر ہم تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھنا پسند کریں گے' دراصل ہمیں ہائی بلڈ پریشر کی شکایت رہتی ہے تم ڈاکٹر بھی ہو' ہمارا خیال رکھو گے' ویسے تو ہمارا ذاتی ڈاکٹر بھی موجود رہتا ہے' لیکن تمہاری بات اور ہے۔'' نواب صاحب نے کہا۔
''آپ کی ذرہ نوازی ہے۔'' میں نے نیاز مندی سے کہا اور موبائل فون میز سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔
''ایک بات بتاؤ شمروز کیا مجھ سے ملنے سے پہلے تم میرے نام اور ذات سے واقف تھے؟'' نواب صاحب نے پوری طرح اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا' پھر نرم و ملائم تکیے کا سہارا لے کر اسے اپنی کہنی کے نیچے رکھ کر نیم دراز ہوگئے۔
''معاف کیجیے گا' میں آپ کے نام سے واقف نہیں تھا۔'' میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔
''حیرت ہے کیا تم اخبار نہیں پڑھتے اور ٹی وی نہیں دیکھتے' ہم سے تو ایک دنیا واقف ہے۔ نواب سطوت الاسلام...... ہم نے ایک سیاسی پارٹی بھی جوائن کی تھی' پھر اسے چھوڑ دیا کچھ مزا نہیں آیا۔''
''دراصل نواب صاحب مجھے سیاست سے قطعی دلچسپی نہیں ہے' رہی بات اخبار پڑھنے اور ٹی وی دیکھنے کی' تو میری مصروفیات کچھ اس قسم کی تھیں کہ مجھے ٹائم ہی نہیں ملتا تھا' بس کبھی کبھار کوئی اخبار ہاتھ لگ گیا تو پڑھ لیا' یہی حال ٹی وی کا بھی ہے' کبھی فرصت ملی تو انٹرٹیمنٹ کا کوئی پروگرام دیکھ لیا۔ میں نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں میں حاصل کی' میرے بابا کی شدید خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں اسی لیے اپنی ساری توجہ صرف اور صرف پڑھائی پر لگادی' پھر ہاسپٹل جوائن کرلیا' وہاں شفٹوں میں ڈیوٹی ہوتی تھی' بس یہی مصروفیات تھیں میری' ہوسکتا ہے جن دنوں اخبارات میں آپ کا چرچا ہورہا ہو' میری نگاہ سے ان دنوں اخبار ہی نہ گزرے ہوں اور اب تو سیاسی لیڈروں سے مجھے شدید نفرت ہے' میں ان ہی کی سفاکی کا شکار ہوا ہوں۔ شریف بن کر زندگی گزارنی چاہی تو زمانے

نے مجھے ہڑپ کرنا چاہا اس لیے شرافت چھوڑ دی' میں سمجھ گیا ہوں کہ اس ملک میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظام رائج ہے۔ اس لیے میں نے آپ کی لاٹھی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔" میں مسلسل بولتا رہا پھر ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو' شرافت میں کچھ نہیں رکھا' لیکن اگر شریف ہونے کے ساتھ ساتھ آپ دولت مند بھی ہوں تو سب آپ کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اب تمہارے پاس طاقت تو ہمارے ذریعے آہی گئی ہے دولت بھی ہم تمہیں بے تحاشا دیں گے' اس کے علاوہ حسن وشباب بھی تمہارے قدموں میں ہوگا' بس ہم جو کام تمہارے سپرد کریں' اسے اپنی پوری ایمانداری سے انجام دو' لیکن اس کے بارے میں اپنے دماغ میں کسی سوال کو مت آنے دو' یاد رکھو بعض دفعہ آگہی انسان کو بہت سی الجھنوں میں گرفتار کردیتی ہے' میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لیے بہت بے چین ہو' ابھی ہمارا تو کوئی کام نہیں ہے اس لیے تمہاری چھٹی ہے' تم اگر یہ کام کرنا چاہتے ہو تو کرلو...... اس کے بارے میں معلومات ہم تمہیں دیں گے' پھر جس طرح تم کرنا چاہو کوئی مدد ہم سے چاہیے تو وہ بھی دے دی جائے گی۔" نواب صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"آپ مجھے صرف ان دونوں کے بارے میں معلومات مہیا کردیں' بدلہ لینے کا پلان میرا خود کا ہوگا۔" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"ہم یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنا پلان خود بناؤ' کام تو تم اپنا کرو گے' لیکن اس میں ہماری خوشی بھی شامل ہے' ابھی ہم نے تمہیں بتایا تھا کہ ہم نے ایک سیاسی جماعت سے وابستگی حاصل کی تھی' پھر علیحدگی اختیار کرلی' علیحدگی اختیار کرنے کی وجہ سردار شیر افضل ہی تھا' شیر زادہ خٹک اس کا چچازاد ہے' دونوں شادی شدہ ہیں لیکن اولاد صرف شیر افضل کی ہے وہ بھی ایک بیٹی ہے' جوان ہے لیکن اس کے بارے میں سنا ہے کہ ذہنی مریض ہے' یہ بھی سنا ہے کہ وہ جنات کے زیر اثر ہے' اور اس کی بیوی بہت سے مولوی ملاؤں پیروں فقیروں اور مزاروں پر اپنی بیٹی کا علاج کرواتی رہی ہے' لیکن اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوا ہے' شیر افضل بھی اپنی اکلوتی بیٹی سے بہت محبت کرتا ہے اور اس کے لیے پریشان بھی ہے۔"

نواب صاحب خاموش ہوئے تو میرا دماغ تیزی سے کام کرنے لگا' جتنی دیر میں سوچتا رہا تھا نواب صاحب خاموش رہے شاید وہ جانتے تھے کہ میرے ذہن نے کام شروع کردیا ہے اور پھر میں ایک بہت مربوط پلان بنانے میں کامیاب بھی ہوگیا۔ میں نے سر اٹھایا تو نواب صاحب مسکرانے لگے اور بولے۔

"پلان بن گیا؟"

"جی نواب صاحب!" میں نے پرجوش لہجے میں کہا۔

"ہم تم سے تمہارا پلان نہیں پوچھیں گے لیکن صرف اتنا پوچھیں گے کہ اگر تمہارے پلان کو کامیاب بنانے میں ہم تمہاری کوئی مدد کرسکیں تو ضرور بتاؤ۔"

"جی نواب صاحب! ابھی آپ نے بتایا تھا کہ آپ کی بہت سی خادمائیں ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی تیز طرار اور ذرا بڑی عمر کی عورت جو قابل اعتبار بھی ہو تو مجھے دے دی جائے۔" میں نے کہا۔

"بالکل مل جائے گی' رہی بات قابل اعتبار کی تو یہ لوگ صرف دیکھ اور سن تو سکتی ہیں لیکن ان کے منہ میں زبان نہیں ہے' میرا مطلب ہے کہ زبان ہونے کے باوجود یہ کچھ بھی نہیں بولیں گی۔ اس کے علاوہ کچھ اور......" نواب صاحب نے کہا۔

"کچھ جدید اسلحہ ایسا کہ جس کو آسانی سے چھپایا جاسکے۔" میں نے کہا۔

"مل جائے گا۔" نواب صاحب نے اطمینان سے کہا۔

میں دل میں بہت خوش تھا۔ شیر افضل سے انتقام لینے کے بعد میں پرسکون ہوسکتا تھا' میں نے نواب صاحب سے پوچھا۔

"اگر آپ کو میری بات بری لگے تو پیشگی معذرت چاہتا ہوں یہ بتایئے کہ جہاں انسان کے بہت سے دوست ہوتے ہیں وہاں دشمن بھی ہوتے ہیں۔ آپ کے بھی ہوں گے یا پھر سارے ہی لوگ آپ کے معتقد ہیں یا کچھ لوگ آپ کو برا بھی سمجھتے ہوں گے' کیا ایسا ہے؟"

"ہاں بھئی ظاہری بات ہے کہ جہاں میرے اچھے دوست ہیں' وہاں دشمن بھی ہیں' حاسد بھی ہیں اور وہی لوگ میرے بارے میں مختلف باتیں پھیلاتے رہتے ہیں لیکن میں ان بے ہودہ باتوں کی قطعی پروا نہیں کرتا جس کا جو دل چاہے میرے بارے میں کہتا رہے لیکن میں جیسا ہوں' ویسا ہی ہوں اور میرا اپنا زندگی گزارنے کا طریقہ ہے' اب تم اپنے آپ کو لے لو' جیسا کہ تم نے ابھی دیکھا کہ دو لڑکیاں میری خدمت کررہی تھیں۔ اب تم باہر جاکر لوگوں سے یہ کہنا شروع کردو کہ نواب صاحب ایک عیاش انسان ہیں' اس کے بنگلے میں صرف جوان اور حسین لڑکیاں ملازم ہیں تو میں کیا کروں۔ میری تو یہ خادمائیں ہیں' اپنی خوشی سے میری خدمت کرتی ہیں اور ویسے بھی' میں کوئی فرشتہ تو نہیں ہوں ایک انسان ہی ہوں اور وہ بھی مرد......! اور مرد کی بھی ضرورت ہوتی ہے' ایسی ضرورت جسے صرف عورت ہی پوری کرسکتی ہے۔"

نواب صاحب بول ہی رہے تھے کہ ان کے بلیک بیری پر کوئی ای میل آگئی۔ تو وہ خاموش ہو کر اسے پڑھنے لگے پھر جواب ٹائپ کرنے میں مصروف ہوگئے اور میں خاموشی سے بیٹھا ان کی صورت کو تکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کیسا ہے' مجھے حیرت بھی ہورہی تھی کہ یہ نامی گرامی شخص اپنے بارے میں کسی کی رائے کو کوئی اہمیت نہیں دیتا' اپنے آپ کو ہر طرح کا عمل کرنے میں حق بجانب سمجھتا ہے۔ اس میں ایسا بے ہودہ اور نامعقول رویہ اپنانے کا حوصلہ بھی ہے یہ ایسی خصلت ہے جو صرف غیر معمولی انسانوں میں ہی پائی جاتی ہے۔ یہ دل کی بات دل میں رکھنے کا بھی قائل نہیں ہے' اپنے بارے میں کتنی سچائی سے مجھے بتادیا' نوابی شان اور ایک لیڈر ہونے کی صفات اس کی گھٹی میں پڑی ہیں' اس نے روایت کی انگلی نہیں پکڑ رکھی' وہ روایت جو اس کے آباؤ اجداد کی تھی' وہ پیر تھے یہ تو اپنے لیے خود نئی راہیں نکالتا ہے' یہ اپنے فیصلے خود کرتا ہے کہ اس کو کس سمت اور کس راستے پر چلنا ہے لوگوں کا اس کی حرکتوں کے بارے میں کیا خیال ہے اس بات کو اس نے اپنے لیے کبھی بوجھ بننے نہیں دیا' اس نے لوگوں کو مجبور کردیا ہے کہ وہ جیسا ہے اسے ویسا ہی قبول کیا جائے۔ اس کی کارگزاریوں کی تہہ میں اعتماد کارفرما ہوتا ہے اور اس اعتماد کی بدولت اس نے بہت سے مخالفین سے بھی منوالیا ہے کہ وہ جو کچھ بھی کررہا ہے ٹھیک کررہا ہے اور ایسا کرنا اس کا حق ہے۔ اس پر جو بھی کیچڑ اچھالے گا وہ پھسل کر منہ کے بل گر جائے گا۔

جیسا کہ اس نے ابھی بتایا تھا سیاسی پارٹی جوائن کرکے چھوڑ دی اور اس کی وجہ شیر افضل تھا' اس پر اعتراض کرنے کے بعد جب اس نے سیاسی پارٹی سے علیحدگی اختیار کرلی' تب بھی شیر افضل اس کے پاس آیا اور اس کے سارے رعب و دبدبے کے ساتھ

اس کی ذات کو قبول کیا۔

نواب کی سیاسی ناچاقی کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی' میں سمجھ گیا کہ نواب ان لوگوں میں سے ہے' جن کو اپنی عزت وآبرو عزیز ہوتی ہے۔ جب اس پر باتیں بنیں تو اس نے مصالحت سے انکار کردیا۔ اس کو سیاست میں اعلیٰ عہدوں کی بھی پیش کش ہوئی لیکن نواب اس قسم کے معمولی عہدوں کا طلب گار نہیں تھا۔ اقتدار سے اقتدار کی خاطر چمٹے رہنا اس کے مسلک میں شامل نہیں تھا' بلکہ اسے ضرورت تھی ہی نہیں۔

میں سوچوں میں گم تھا' میری سوچوں کا محور نواب کی پرکشش اور شاندار شخصیت تھی' تب ہی نواب صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"سوری شمروز! ایک ضروری میل آ گئی تھی' اس کا جواب ابھی فوراً دینا بھی ضروری تھا۔"

"کوئی بات نہیں نواب صاحب' کام کو اپنے وقت پر ہی کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"تمہاری سوچ ہمیں پسند آئی' خیر چھوڑو ان باتوں کو اب کیا ارادہ ہے؟" نواب صاحب نے کہا۔

"میں آج ہی سے اپنے پلان پر عمل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ مجھے اس عورت سے ملوادیں' جس کے لیے میں نے کہا تھا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم اپنے روم میں جاؤ' دوپہر کے کھانے پر ہماری ملاقات ہوگی۔ میں اس عورت کو ابھی تمہارے روم میں بھجواتا ہوں۔"

میں نواب صاحب کے روم سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ایک حسین پینتیس سالہ مناسب شکل وصورت کی خاتون میرے کمرے میں آئی اور بولی۔

"مجھے نواب صاحب نے بھیجا ہے۔ آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے.....!"

میں نے ایک ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ یہ عورت میرے کام کے لیے مناسب ہے۔ شکل سے بھی تیز اور خود اعتماد دکھائی دے رہی تھی۔

"ہاں آؤ..... ادھر بیٹھ جاؤ' مجھے تم سے کام ہے لیکن پہلے اپنا نام بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"میرا نام راکھی ہے.....!"

"راکھی!" میں اس کا نام سن کر حیران رہ گیا اور پوچھا۔

"ہندو ہو۔"

"جی ہاں۔"

"نواب صاحب کے پاس کیسے..... میرا مطلب ہے کب سے ہو' پاکستان ہی کی ہو یا پڑوسی ملک سے آئی ہو؟" میں نے ایک ساتھ کئی سوال کرڈالے۔

"بس جی اپنے نواب صاحب کو جو چیز جہاں بھی پسند آجائے فوراً اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ میں بھارت کی ہوں۔ ایک مرتبہ نواب صاحب وہاں آئے تو شکلا صاحب کے ہاں مجھ پر نگاہ پڑگئی۔ میں نواب صاحب کو پسند آ گئی' انہوں نے شکلا صاحب سے مجھے مانگ لیا' جب سے میں یہاں ہوں۔"

"کتنا عرصہ ہوا؟" میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے جو نواب صاحب اسے انڈیا سے اپنے ساتھ لے آئے' اس کا سر سے پاؤں تک بغور جائزہ لیا' اور اس جائزے کے بعد میں سمجھ گیا کہ نواب صاحب کی نظر کرم کیوں اس پر مائل ہوئی۔

"تین سال ہوگئے۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

وہ ایک بہت گداز جسم کی مالک تھی' اس عمر میں بھی اس کا جوبن غضب کا تھا' خیر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی' میں مطلب کی بات پر آ گیا۔

"ایکٹنگ کرلیتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جی.....!" اس نے حیرت سے کہا۔

"فکر نہ کرو..... میں کوئی فلم ڈائریکٹ نہیں کررہا' بس تمہیں میرے ساتھ کہیں جانا ہے اور تھوڑی بہت اداکاری کرنی ہوگی..... کرلوگی؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل کرلوں گی' جیسا آپ کہیں گے..... آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" اس نے اعتماد سے پر لہجے میں کہا۔

پھر میں نے اطمینان سے بیٹھ کر اپنا سارا پلان سمجھایا' جو اس نے فوراً ہی سمجھ لیا' ساری بات سننے کے بعد وہ بولی۔ "آپ کو وہاں کسی چھوٹے موٹے گھر کی ضرورت تو ہوگی' کیا آپ کے پاس اس کا انتظام ہے یا مجھے کرنا پڑے گا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ مکان کی ضرورت پڑے گی یا ویسے ہی کام نہیں چل سکتا۔" میں نے اس سے سوال کیا۔

"کام تو آپ چلاسکتے ہیں' لیکن کسی کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے کیونکہ آج کل کوئی اتنی جلدی کسی اجنبی پر اعتماد نہیں کرتا۔" اس نے کہا۔

"میرے اوپر اعتماد دلانا تو تمہارا کام ہے' اب یہ تمہارے اوپر منحصر ہے کہ تم کتنی جلدی اور کس طرح ان کا اعتماد حاصل کرسکتی ہو۔ دیکھو ہمیں بہت سارا وقت نہیں چاہیے' میں جلد از جلد اپنا مطلب حاصل کرکے وہاں سے لوٹ آنا چاہتا ہوں۔ نہ جانے کب نواب صاحب کو میری ضرورت پڑ جائے اور وہ مجھے واپس بلالیں۔ اس طرح تو مجھے اپنا کام ادھورا چھوڑ کر آنا پڑے گا اور میں ایسا نہیں چاہتا' بار بار جانے آنے سے کوئی ہم پر شک بھی کرسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے! لیکن میرا خیال ہے کہ اگر مکان کا بندوبست ہوجائے تو زیادہ بہتر ہے۔ میری بات کی تصدیق وہ لوگ کروا بھی سکتے ہیں۔" اس نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

"تمہاری بات میں وزن تو ہے' تو پھر مکان کا انتظام بھی تمہیں ہی کرنا پڑے گا' کیونکہ میرے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔" میں نے صاف کہہ دیا۔

"او کے میں کرلوں گی۔ لیکن اس کام میں ایک دو دن لگ سکتے ہیں۔ ویسے چلنا کب ہے؟" اس نے آمادگی ظاہر کرکے مجھ سے جانے کا پوچھا۔

"جتنی جلدی مکان کا انتظام ہوجائے گا' اتنی جلدی ہم روانہ ہوجائیں گے۔" میں نے کہا۔

"میں ایک بات اور سوچ رہی ہوں شمروز صاحب....." اس نے سوچوں میں ڈوبے ڈوبے کہا۔

"ہاں بولو..... تم کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے کہا۔

"ہمیں ایک دو بندے اپنے ساتھ اور رکھنے ہوں گے' خالی ہم دونوں کے جانے سے بات نہیں بنے گی.....!"

"وہ کس لیے؟" میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ نے جو ذمہ داری میری لگائی ہے' اس کے لیے کہہ رہی ہوں۔ بس آپ اپنا کام کرنا اور مجھے میرا کام کرنے دینا' مجھے پتا ہے کہ مجھے کیا اور کس طرح سے کرنا ہے۔" اس نے کہا تو میں نے اس کی بات مان لی۔

اگلا دن گزر گیا' جو میں نے کمرے میں رہ کر سوچ بچار میں گزارا' نہ تو راکھی آئی اور نہ ہی نواب صاحب نے مجھے یاد کیا۔ دوسرے دن دوپہر کو راکھی آئی اور بولی۔

"شمروز صاحب سارا انتظام ہوچکا ہے' مکان بھی ہمیں مل گیا ہے' مکان کیا ہے' بس ایک چھوٹا سا

کمرہ ہے اس کا ایک چھوٹا سا صحن ہے جہاں کچن اور باتھ روم بنا ہوا ہے میں نے دلاور خان سے کہہ دیا ہے کہ وہ ہماری آمد کی ساری تیاریاں کر کے رکھے اور میک اپ مین بھی آ گیا ہے جو آپ کا حلیہ یکسر بدل دے گا اور کسی کو یہ گمان تک نہیں ہوگا کہ یہ آپ کی اصل شکل نہیں ہے۔"

"یہ دلاور خان کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اپنا ہی بندہ ہے۔ وہ اس گھر میں رہتا ہے جہاں ہم جا رہے ہیں اس نے آج ہی سے اس علاقے میں یہ بات پھیلانی شروع کردی ہے کہ اس کے گھر ایک بہت بڑے بزرگ تشریف لا رہے ہیں۔ وہاں جانے کے بعد آپ کو کیا کرنا ہے یہ آپ جانیں میری حیثیت تو آپ کی خادمہ اور مریدنی خاص کی ہوگی اور میں ہی شیر افضل کی حویلی میں آپ کا پیغام بھی لے کر جاؤں گی۔" راکھی نے کہا۔

راکھی میری توقع سے بھی زیادہ ہوشیار عورت تھی وہ میرا پلان فوراً سمجھ گئی اور ہر کام عین میری پسند کے مطابق بھی ہو رہا تھا۔

"ٹھیک ہے راکھی ہم صبح ہی صبح روانہ ہو جائیں گے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"فلائٹ کا ٹائم دیکھنا ہوگا کہ اسلام آباد یا پنڈی کی فلائٹ جتنی جلدی ہو سکے ہمیں مل جائے۔ اس سے آگے کا سفر ہمیں بائی کار کرنا ہے۔" راکھی نے بتایا۔

"ہمارے ساتھ جو لوگ جانے والے ہیں انہیں تم نے تیار کرلیا ہے اور ساری بات بھی سمجھا دی ہے ناں۔" میں نے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ صرف شرمیلا عابد اور کمال جا رہے ہیں۔ سب لوگ تیار ہیں بلکہ ان لوگوں کو میں نے پہلے ہی روانہ کردیا ہے میں آپ کا ضروری سامان پیک کردوں گی۔ اسلحہ اور رقم کے لیے نواب صاحب نے حمیدہ کو ہدایت کردی ہے آپ جا کر ان سے مل لیں اور جو بھی چاہیے اور جتنا چاہیے ان سے لے سکتے ہیں۔ نواب صاحب نے انہیں ہدایت کردی ہے کہ آپ کی ہر ڈیمانڈ پوری کی جائے۔" راکھی نے مجھے بہت ہی اہم بات بتائی۔

ابھی وہ میرے پاس ہی کھڑی تھی کہ اس کا سیل فون بجنے لگا تو وہ بولی۔

"میں نے جہاز کی سیٹ کے لیے کہا تھا اس کا فون ہے پھر اس نے فون آن کر کے کان سے لگایا اور چند لمحوں تک خاموشی سے سنتی رہی۔ پھر "اوکے" کہہ کر فون بند کردیا اور مجھ سے بولی۔

"راشد کہہ رہا ہے کہ کل صبح سات بجے کی فلائٹ ہے ہمیں پانچ بجے ہی ایئرپورٹ پہنچنا ہوگا۔ اور ابھی سے تیاریاں شروع کرنی ہوں گی۔"

میں بہت زیادہ ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا کتنے عرصہ کے بعد میں اس علاقے میں جاؤں گا جہاں میں نے آنکھ کھولی ان گلیوں کو دیکھوں گا جہاں میرا بچپن گزرا بابا اور اماں کا وہ گھر تو ویران پڑا ہوگا۔ سب کچھ کتنی جلدی اور اچانک ہی ختم ہوگیا۔ یہ سوچ کر ہی میری آنکھیں جلنے لگیں۔

میں نے آپ کے لباس تیار کروا لیے ہیں جو آپ کو وہاں پہننے ہوں گے بس آپ جلدی رات کے کھانے سے فارغ ہو جائیے گا تاکہ میں میک اپ مین کو بلوا لوں۔ اسے بھی اپنا کام کرنے میں تین سے چار گھنٹے تو لگیں گے۔" راکھی نے کہا اور چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں بستر پر ڈھے سا گیا۔ میرے ہاتھوں اور پیروں میں اینٹھن سی ہونے لگی رہ رہ کر شیر افضل اور شیر زادہ کی شکلیں میری آنکھوں کے سامنے آ رہی تھیں۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اپنے تصور ہی میں ان کا چہرہ بگاڑ دوں جس طرح شیر افضل نے فتح محمد کے ذریعے میری فائزہ کو برباد کیا تھا میں بھی شیر افضل کی بیٹی کا وہی انجام کروں گا اور مرنے سے پہلے شیر افضل کو معلوم ضرور ہوگا کہ اس کی جوان بیٹی کی عزت برباد کرنے والا اور اس کو اپنے ہاتھوں ختم کرنے والا کون ہے؟

میں آ رہا ہوں شیر افضل تو انتظار کرنا اپنے بابا ماں اور جوان بھائی کی موت کا بدلہ اور جوان بہن کی بے حرمتی کا بدلہ لینے آ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ظلم و ستم تو نے صرف مجھ پر ہی نہیں کیے اور بھی مجھ جیسے بہت سے مظلوم ہوں گے اور وہ بھی اسی طرح بے بس اور مجبور ہوں گے جیسا کہ کبھی میں تھا لیکن آج میں بے بس اور مجبور نہیں ہوں بلکہ تجھ سے بھی زیادہ طاقت ور ہوں۔ میں سوچ رہا تھا اور میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ ماتھے کی رگ جو دونوں ابرو کے درمیان سے نکل کر سر کے بالوں میں غائب ہو جاتی ہے غصے کی حالت میں پھول کر موٹی ہو جاتی ہے میرے جبڑے ایک دوسرے کے ساتھ سختی سے جڑے ہوئے تھے اور آنکھیں خوں رنگ ہو رہی تھیں۔ خون کھول کر کنپٹیوں میں ٹکریں مار رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں میں نے اپنے آپ کو نارمل حالت میں کیا اور خود کو سمجھایا کہ شمروز اس وقت غصہ کر کے اپنی انرجی ضائع مت کرو۔

رات کا کھانا میں نے اپنے کمرے میں ہی کھایا پھر دس بجے کے قریب راکھی دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بھی تھا اس نے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا بکس اٹھایا ہوا تھا مجھے دیکھ کر مسکرایا اور سلام کیا۔

میں نے راکھی کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس نے بتایا کہ یہ ایک میک اپ مین ہیں اور اپنے کام کے ماہر ہیں ان کا نام نواب صاحب نے لیا تھا۔ انہوں نے ہی انہیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔

نواب صاحب کا نام سن کر میں مطمئن ہوگیا کہ اگر انہوں نے بھیجا ہے تو یقیناً اپنے کام کا ماہر ہوگا۔

اس میک اپ مین کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم بات جو مجھے بعد میں پتا چلی وہ آگے آپ کو بتاؤں گا۔

مجھے اس نے ایک کرسی پر بٹھا دیا اور چھوٹی ٹیبل پر اپنا بکس کھول کر رکھ دیا۔ اس میں مختلف قسم کے لوشن کریمیں وِگز اور بھی نہ جانے کیا کیا الم غلم بھرا ہوا تھا میں نے ان چیزوں کے بارے میں استفسار کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ ان کی طرف دھیان مت دیں۔ بس پرسکون ہو کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائیں جب میں آپ سے آنکھیں کھولنے کے لیے کہوں پھر کھولیے گا۔"

میں نے اس کی ہدایت پر آنکھیں بند کرلیں اور کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکا دیا ایک مرتبہ پہلے بھی جب میں گلشن اقبال والے فلیٹ میں تھا تب بھی ایک میک اپ مین آیا تھا اور اس نے میرے چہرے پر میک اپ کر کے ضروری تبدیلیاں کی تھیں بعد میں میں نے اپنا حلیہ اور بجنل ویسا ہی بنا لیا تھا میک اپ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

"یہ میک اپ میں ایسا کر رہا ہوں جو چوبیس گھنٹے ایسا ہی رہے گا آپ سو جائیں کھائیں پئیں بھاگیں دوڑیں کوئی فرق نہیں پڑے گا بس آپ کلی کر سکتے ہیں لیکن چہرہ دھونے کی کوشش مت کیجیے گا اس سے میک اپ ختم تو نہیں ہوگا بس بگڑ جائے گا۔"

اس نے میک اپ کرنے کے دوران کہا اور میں نے سوچا کیا ہے اگر میں دو چار دن منہ نہیں دھوؤں گا تو کوئی فرق تو نہیں پڑے گا۔

پھر اس نے مجھ سے آنکھیں کھولنے کے لیے کہا اور میری آنکھوں میں بلیک کلر کے لینس لگا دیئے کیونکہ میری پتلیوں کی رنگت گرے کلر کی تھی‘ رنگ میرا گورا تھا جسے اس نے چھیڑنے کی کوشش نہیں کی‘ بس ایک لوشن میرے ہاتھوں پر لگانے کے بعد کہا۔

”اگر آپ کو ہاتھ دھونے کی ضرورت پیش آجائے اور وہ یقیناً آئے گی‘ تو اس لوشن کو آپ دوبارہ سے ہاتھوں پر مل لیجیے گا۔ اس سے آپ کے ہاتھوں کی جلد جھریوں زدہ ہو جائے گی۔“

میک اپ سے فارغ ہو کر اس نے لوشن کی وہ چھوٹی سی شیشی میرے حوالے کر دی۔

پھر اس نے مجھے آئینے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا‘ اپنے آپ پر میری نگاہ پڑی تو میں حیران رہ گیا۔

میرے سامنے ایک بہت بوڑھا شخص کھڑا تھا‘ جس کے سر کے بالوں کے علاوہ داڑھی مونچھیں بھی بگلے کی مانند سفید تھیں‘ بھنوؤں میں بھی چند بال دکھائی دے رہے تھے‘ چہرہ جھریوں زدہ تھا‘ خاص طور پر آنکھوں کے نیچے تو بے تحاشہ جھریاں تھیں۔ مونچھوں کے بالوں نے آدھے ہونٹوں کو کور کر دیا تھا‘ شاید اس وقت میری ماں بھی مجھے دیکھتی تو نہ پہچانتیں‘ میں اسی پچاسی سال کا ایک بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔

مجھ سے داد و تحسین وصول کر کے میک اپ مین جس کا نام بھی مجھے معلوم نہیں تھا کمرے سے چلا گیا۔ تب راکھی ہاتھوں میں کپڑے اٹھائے چلی آئی اور بولی۔

”یہ آپ کا لباس ہے‘ آپ اسے پہن لیں‘ یہ ایک دھوتی اور لمبا سا سفید کرتا تھا۔ پاؤں کے لیے بند جوتے تھے جو بنا موزوں کے میں نے پہنے۔

میں لباس تبدیل کر کے آیا تو راکھی نے ایک بڑی سی تسبیح یا موتیوں کی مالا میرے گلے میں ڈال دی اور ایک بڑی سی سفید چادر مجھے سر سے اوڑھا دی۔

مکمل طور پر تیار ہو کر میں نے ایک بار پھر اپنا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لیا اور مطمئن ہو گیا۔

”راکھی بھاگ دوڑ میں یا چادر سر سے اوڑھنے میں یہ سر کی وگ اور داڑھی مونچھیں نکل تو نہیں جائیں گی۔“ میں نے پوچھا۔

”ارے نہیں شمروز صاحب اس طرف سے آپ قطعی بے فکر رہیں‘ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ یہ چیزیں ایک خاص سلوشن کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور ایک خاص سلوشن کے ذریعے ہی انہیں علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔“ راکھی نے کہا۔

”تو راکھی تم ایسا کرو کہ وہ خاص سلوشن فوراً لے کر آجاؤ‘ ہو سکتا ہے کہ کام ہو جانے کے بعد مجھے اپنا یہ حلیہ فوراً تبدیل کرنا پڑے لیکن وہ تو شاید چلے گئے ہوں گے۔“ میں نے مایوسی سے کہا۔

”نہیں وہ نواب صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ میں جانے سے پہلے انہیں آپ کے پاس بھیج دوں گی‘ آپ ان سے خود ہی بات کر لیجیے گا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے خوش ہو کر کہا۔ میں ان سے وہ سلوشن لینا چاہتا تھا جس کے ذریعے میں یہ میک اپ صاف کر کے اپنی اصل شکل میں آسکوں۔ اس کے علاوہ میں کچھ اور چیزیں ان سے لینا چاہتا تھا‘ جو یہ میک اپ اتارنے کے بعد میں اپنے چہرے پر لگا سکوں۔ کیونکہ میں اپنی اصل شکل میں وہاں کسی کو نظر آنا نہیں چاہتا تھا‘ اس لیے کہ اگر کسی نے مجھے پہچان لیا تو شیرا افضل کے قتل کا شبہ صاف صاف میرے اوپر چلا جائے گا کہ میں اتنے عرصہ کے بعد شیرا افضل کو قتل کرنے کے لیے آیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ میک اپ مین دوبارہ میرے پاس آیا اور میک اپ اتارنے کا لوشن دیتے ہوئے اس کا سارا طریقہ کار مجھے سمجھا دیا‘ پھر میں نے اس سے ایک دوسری بالوں کی وگ اور داڑھی مونچھیں لے لیں۔ اس کے بارے میں بھی اس نے مجھے ضروری ہدایات دیں اور جاتے جاتے بولا۔

”اب میں جا رہا ہوں‘ اب بھی کوئی بات پوچھنی ہے تو پوچھ لیں۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور میں راکھی کے ساتھ ضروری باتوں میں مصروف ہو گیا۔

اپنی پوری تیاری کے ساتھ میں اور راکھی ائرپورٹ روانہ ہو گئے میرے پاس اچھا خاصا کیش تھا اور دو بہترین ریوالور تھے۔ میں نے اپنا سامان جب اپنے لباس میں رکھا تو خیال آیا کہ میں تو اسلحہ اپنے ساتھ لے جا ہی نہیں سکتا‘ کیونکہ جہاز میں اسلحہ لے جانا منع ہے تو راکھی نے بڑے مطمئن انداز میں کہا۔ ”تو رہنے دیں۔“

”لیکن راکھی ہمیں ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”آپ بھول رہے ہیں کہ جس مکان میں ہم ٹھہرنے کے لیے جا رہے ہیں وہ مکان ہمارے ہی بندے کا ہے‘ تو پھر آپ کو کیا پریشانی ہے آپ کی تمام مطلوبہ چیزیں آپ کو وہاں مل جائیں گی‘ بس یا کچھ اور......“ راکھی نے کہا تو میں مطمئن ہو گیا اور ریوالور اپنے کمرے میں ہی چھوڑ دیا اور ہم ائرپورٹ روانہ ہو گئے۔

ائرپورٹ پر اتر کر میں نے اپنی چال ذرا دھیمی کر لی‘ بالکل ایسے جیسے ایک بوڑھا آدمی چلتا ہے‘ راکھی نے بھی اسی طرح کا میک اپ کر رکھا تھا جیسے اس کی عمر پچاس پچپن سال کی ہو‘ ایسا کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ کوئی ہمیں کسی بھی قسم کے شک کی نگاہ سے نہ دیکھے۔

راستے میں ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور ہمارا سفر پورا ہو گیا‘ ہم نے اسلام آباد ائرپورٹ پر لینڈ کیا تھا‘ وہاں پر پہلے ہی سے ایک گاڑی کے ساتھ ہمارا وہ ساتھی جس کے گھر ہم جا رہے تھے گاڑی کے ساتھ موجود تھا‘ وہ ایک ٹیکسی تھی‘ کیونکہ اس کے پاس کار نہیں تھی۔

وہاں سے ہم ٹیکسی کے ذریعے نتھیا گلی پہنچے‘ ہمارے بندے نے اپنا نام فہیم بتایا اور یہ بھی کہ یہ ٹیکسی اس کی اپنی ہے اور وہ وہاں ٹیکسی چلاتا ہے شادی شدہ ہے‘ بیوی موجود ہے لیکن کوئی بچہ نہیں ہے۔

”مجھے راکھی نے بتایا ہے کہ تمہارا ایک ہی کمرے کا مکان ہے‘ تو ہم لوگوں کے آجانے سے تو تمہیں بہت پریشانی ہو جائے گی۔“ میں نے فہیم سے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

”سب خیر ہے شمروز صاحب‘ میری بیوی بہت اچھی ہے اور میری ہم خیال بھی‘ ہم نواب صاحب کے جاں نثاروں میں سے ہیں‘ ان کے لیے اپنے سر کٹوا سکتے ہیں۔ پھر یہ تھوڑے دنوں کی پریشانی تو کوئی بات ہی نہیں ہے‘ میں نے تو اسے بتا دیا ہے کہ آپ کو نواب صاحب نے بھیجا ہے اور آپ یہاں کسی خاص مہم پر آئے ہیں۔ اسے بس اتنا کرنا ہے کہ آس پاس پڑوس میں یہ بات پھیلا دے کہ ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہمارے گھر آرہے ہیں۔ ان کا ایک بندہ ہمارے گھر آیا تھا اور اس نے بتایا کہ انہیں خواب میں بشارت ہوئی ہے کہ اس گاؤں میں پہنچو وہاں تمہاری شدید ضرورت ہے‘ تو پیر صاحب یہاں آنا چاہتے ہیں‘ تو ہے کوئی دل والا جو انہیں اپنے گھر میں ٹھہرا سکے‘ تو ہم لوگ خوشی سے راضی ہو گئے کہ ہم پیر صاحب کی میزبانی کریں گے‘ اس لیے فہیم پیر صاحب کو لینے کے لیے گئے ہیں۔ آپ دیکھیے گا کہ جب ہم وہاں پہنچیں گے تو کتنے لوگ آپ کے استقبال کے لیے وہاں موجود ہوں گے۔“ فہیم نے

ہنستے ہوئے ساری بات مجھے بتائی۔

"ہاں بے چارے یہ گاؤں کے ان پڑھ دیہاتی لوگ اپنے دین اور مذہب کو صرف اس قدر جانتے ہیں کہ اگر ان کے سامنے اللہ کا کوئی نیک بندہ آ جائے تو وہ دل و جان سے اس پر ایمان لے آئیں اور اس کی خوب خدمت کریں اور یہی خدمت ان کی بخشش کا سبب بن جائے گی۔" میں نے کہا۔

"یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" فہیم نے کہا۔

"تمہیں پتا ہے کہ میں اسی علاقے کا رہنے والا ہوں اور یہاں کے لوگوں کی ذہنیت کو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں نے ایک صاحب سے یہی بات کہی تھی کہ آپ لوگ پیر ہی کو اپنا سب کچھ مان لیتے ہو، خود نمازیں پڑھو اور اللہ سے اپنے لیے دعا کرو، اللہ تو سب کی سنتا ہے۔ تو پتا ہے اس نے کیا جواب دیا۔ وہ بولا کہ ہمیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے، ہمارے لیے پیر صاحب ہی سب کچھ ہیں۔ کیونکہ وہ اللہ کے نیک بندے ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں جگہ دے گا۔ جب وہ جنت میں جانے لگیں گے تو ہم بھی ان کا دامن پکڑ کر ان کے پیچھے پیچھے جنت میں چلے جائیں گے۔ دنیا میں جب ہم ان کے پیچھے تھے تو وہ آخرت میں ہمیں کیسے بھولیں گے۔" میں نے سادہ لوح دیہاتی لوگوں کی ذہنیت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں یہ اپنی فکر و سوچ میں اتنے پختہ ہیں کہ انہیں لاکھ سچائی دکھاؤ، یہ کبھی نہیں مانیں گے۔ بس آنکھیں بند کیے بے خبری میں چلتے جا رہے ہیں۔ اور بہت سے لوگ ہیں جو ان سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی لیے بھرے پڑے ہیں جعلی پیر......" فہیم نے میری بات کے جواب میں کہا۔

راکھی اس دوران بالکل خاموش بیٹھی ہماری باتیں سنتی رہی، ہم دونوں خاموش ہوئے تو اس نے صرف اتنا کہا کہ "بھارت میں تو مذہب کے نام پر بہت سی خرافات ہوتی ہیں۔ بھئی میں تو ان سب چیزوں سے بہت بے زار ہوں اور کسی مذہب کو نہیں مانتی جو کچھ بھی ہے وہ سب یہیں تک ہے اس لیے کھاؤ پیو موج اڑاؤ اور جو بھی آپ کی خوشیوں اور کامیابیوں کی راہ میں آڑے آئے، اسے ایک زبردست وار سے اپنے راستے ہی سے ہٹا کر آگے بڑھ جاؤ، کیا ہے گناہ، کیا ہے ثواب...... میں کسی بات کو نہیں مانتی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی۔

"پاکستان بہت خوب صورت ہے، اتنے اونچے اونچے پہاڑ، جھرنے، بہتے آبشار، سبزہ...... واؤ...... میں تو پہلی مرتبہ اس علاقے میں آئی ہوں۔"

"تم نتھیا گلی دیکھو گی تو تمہاری آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی، اللہ نے اس علاقے کو قدرتی حسن سے مالا مال کر رکھا ہے لیکن ہم نے قدر نہیں کی، ہمارا سوات کتنا حسین تھا لیکن دہشت گردوں نے وہاں کیا حشر کر دیا......"

اور ہم پھر ان سارے علاقوں کی خوب صورتی کے بارے میں باتیں کرتے رہے اور پھر نتھیا گلی کے علاقے میں داخل ہو گئے۔

یہاں انٹر ہوتے ہی میرے دل کی دھڑکن کئی گناہ بڑھ گئی، مجھے شدت کے ساتھ ماں، بابا، ارمان اور فائزہ کی یاد آ گئی، آنکھوں میں ڈھیروں مرچیں سی بھر گئیں۔ جیسے ہی ٹیکسی قبرستان کے سامنے پہنچی، میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"اسٹاپ......!"

فہیم نے فوراً ہی بریک لگا دیے اور مڑ کر میری جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے بتایا تھا ناں کہ میں یہیں کا رہنے والا ہوں، اس قبرستان میں میرے اماں بابا اور بھائی دفن ہیں۔ میں ان کی قبروں پر فاتحہ پڑھنا چاہتا ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن شہروز بھائی آپ کا یہاں فاتحہ پڑھنا مناسب نہیں ہوگا۔ اگر کسی نے دیکھ لیا کہ آپ ان مخصوص قبروں پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں تو پھر......!" فہیم نے کہا۔

"نہیں میں ان کی قبروں پر فاتحہ نہیں پڑھوں گا، دور کھڑے ہو کر سارے لوگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھوں گا۔ بس اندر داخل ہو کر ایک نگاہ ان کی قبروں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا تو فہیم ٹیکسی سے اتر آیا اور میں بھی اتر گیا، البتہ راکھی ٹیکسی میں بیٹھی رہی۔

فہیم اس علاقے میں میرے یہاں سے چلے جانے کے بعد آیا تھا، اس لیے اسے میرے ساتھ ہونے والے دردناک حادثے کا علم نہیں تھا، راستے میں میں نے اسے اپنے بارے میں مختصراً بتا دیا تھا۔

میں نے قبرستان کے باہر کھڑے ہو کر سب کے لیے فاتحہ پڑھی، فہیم نے بھی ہاتھ اٹھا دیے پھر میں اور فہیم آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اس جگہ گئے، جہاں میرے پیارے دفن تھے، ان لوگوں کی قبریں بیٹھ گئی تھیں، بارش اور ہوا نے کافی ساری مٹی ہٹا دی تھی۔

اتنے عرصے سے کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا جو نہیں تھا، لوگ خوف کے مارے زندہ لوگوں سے کٹ جاتے ہیں۔ یہ تو پھر قبریں تھیں۔ نہ جانے کب سے ان پر پانی بھی نہیں پڑا تھا، میں نے چاہا کہ میں اپنے ہاتھوں سے یہ قبریں ٹھیک کر دوں اور پانی کا چھڑکاؤ کروں لیکن فہیم نے مجھے روک دیا اور کہا کہ "آپ فکر نہ کریں، میں نے یہ قبریں دیکھ لی ہیں بعد میں، میں یہ ٹھیک کر دوں گا۔ بلکہ ایک دو اور جو ٹوٹی پھوٹی قبریں ہیں انہیں بھی ٹھیک ٹھاک کر دوں گا، ویسے بھی ہم کون سا ٹیکسی کا کام کرتے ہیں، یہی سہی۔"

"تمہاری بڑی مہربانی......" میں نے تشکر کی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

اور فہیم کا کہنا مان کر میں نے اچھا ہی کیا کہ میں نے وہاں شیر افضل کے بندوں کو دیکھ لیا تھا جو مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے، میری ذات ان کے لیے اجنبی تھی، میں چلتے چلتے ایک دو قبروں پر اور ٹھہرا پھر آہستہ قدموں سے چلتا ہوا قبرستان سے باہر آ گیا۔

میں اس شخص کو شکل سے پہچانتا تھا وہ شیر افضل کی حویلی کا ملازم تھا، وہ بھی میری شکل سے واقف تھا، لیکن اس وقت وہ مجھے نہیں پہچانا، میں بھی بظاہر انجان بن کر اس کے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے بہت عقیدت سے جھک کر مجھے سلام کیا، میں نے بھاری آواز اور لہجہ بنا کر اور ہاتھ اٹھا کر اس کی جانب دیکھے بغیر اس کے سلام کا جواب دیا اور ٹیکسی میں جا کر بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا، میں نے کن انکھیوں سے دیکھا کہ اس نے قریب سے گزرتے ہوئے فہیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا اور اس سے کچھ پوچھنے لگا، میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور میں سمجھ گیا کہ وہ فہیم سے کیا پوچھ رہا ہے۔

یہ بہت اچھی بات ہوئی کہ شیر افضل کی حویلی کا ملازم ہمیں یہاں مل گیا، اور اب وہ یقیناً حویلی میں جا کر میرے بارے میں اپنی مالکن کو ضرور بتائے گا۔

فہیم جب ٹیکسی کی جانب آ رہا تھا تو اللہ وسایا بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا اور میری جانب آ کر اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر میرے آگے سر جھکا کر بولا۔

"میری توبہ توبہ میرے ماں باپ کی توبہ...... میں نے حضور کو پہچانا ہی نہیں، حضور مجھے بخشش دے دیں، اور میرے لیے دعا کریں...... میری گھر والی بہت

بیمار رہتی ہے۔"
میں نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر اس کے سر پر رکھ دیا' تو اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔
"چل اوئے اللہ وسایا...... یہاں زیادہ بات چیت مت کر...... ابھی تو سرکار لمبے سفر سے آرہے ہیں۔ شام کو بیٹھیں گے تو سب کی فریاد سنیں گے۔ تو گھر پر آ جانا......!" فہیم نے کہا۔
"آپ کا گھر کدھر ہے؟" اللہ وسایا نے پوچھا۔
"اوئے وہ پیلی والی مسجد ہے ناں' اس کے سامنے والی گلی میں چوتھا مکان میرا ہے۔" فہیم نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔
"تم سے کیا پوچھ رہا تھا۔" میں نے فہیم سے پوچھا۔
"آپ کے بارے میں پوچھ رہا تھا' جواب میں' میں نے وہی کہانی سنادی جو میری بیوی نے گاؤں کی دوسری عورتوں کو سنائی ہے' تاکہ ہماری بات ایک ہی رہے۔"
"میں اللہ وسایا سے واقف ہوں۔ یہ شیر افضل کے خاص ملازموں میں سے ہے' اس وقت کس طرح گھگیا کر مجھ سے بات کررہا تھا...... میں نے اسے گالی دے کر کہا۔
"یہاں بات وہی آجاتی ہے' اندھے عقیدے والی......" فہیم نے کہا۔
اور پھر ہم مسجد کے قریب پہنچ گئے اور واقعی جیسا فہیم نے کہا تھا ویسا ہی ہوا' فہیم کے گھر کے باہر اچھا خاصا رش لگا ہوا تھا اور لوگ بے صبری اور بے قراری سے میرا انتظار کررہے تھے' جیسے ہی ٹیکسی فہیم نے اپنے گھر کے دروازے پر روکی...... بہت سے لوگ ایک ساتھ ٹوٹ پڑنے' دھکم پیل ہونے لگی۔
میں ٹیکسی سے اتر آیا اور ہاتھ اٹھا کر سب کو سلام کیا' فہیم نے سب کو ہٹایا اور مجھے بمشکل اس ہجوم سے نکال کر گھر کے اندر لایا' پھر گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر بولا۔ "اس وقت پیر صاحب لمبے سفر سے آئے ہیں بہت تھکے ہوئے ہیں آرام کریں گے۔ مغرب کی نماز کے بعد پیر صاحب آپ لوگوں سے ملنے کے لیے بیٹھیں گے۔ آپ لوگ بعد نماز مغرب آنا اور باری باری اپنے مسئلے بیان کرنا۔"
اور یہ کہہ کر فہیم نے گھر کا دروازہ بند کردیا اور اندر آگیا۔ "تمہاری بیوی نے تو زبردست پبلسٹی کردی' اتنے لوگ جمع ہوگئے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔
"یہ بھی تو دیکھیں کہ اس طرح آپ کا کام بھی کتنا آسان ہوگیا۔ آپ دیکھئے گا' مجھے پورا یقین ہے کہ آج ہی حویلی سے کوئی نہ کوئی آپ کے پاس ضرور آئے گا۔" فہیم نے اعتماد سے پر لہجے میں کہا۔
"اور مجھے اس پل کا شدت سے انتظار ہے کہ جب میں اس حویلی کے اندر جاؤں گا اور اس کی بیوی اور بیٹی میرے حصار میں ہوں گی۔ میں حویلی میں رات گزارنے کی خواہش کا اظہار کروں گا اور پھر وہ رات شیر افضل کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔
میں واقعی تھکا ہوا تھا' پوری رات کا جاگا ہوا تھا' کھانے کی کوئی خواہش نہیں تھی' جہاز میں ہی ناشتہ کرلیا تھا لیکن فہیم کی بیوی نے تھوڑا بہت تیار کر کے رکھا تھا' اس کے بہت ضد کرنے پر میں نے اور راکھی نے تھوڑا بہت کھایا اور پھر میں اور راکھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ یہاں صرف ایک چارپائی تھی' ایک چارپائی باہر صحن میں تھی' فہیم نے کہا کہ وہ دوسری چارپائی اندر بچھا دیتا ہے لیکن میں نے منع کردیا کہ راکھی چارپائی پر لیٹ جائے گی اور میں نیچے لیٹ جاؤں گا۔ راکھی بولی نہیں آپ چارپائی پر لیٹ جائیں میں نیچے لیٹ جاؤں گی' بھلا ایک خادمہ اور مریدنی کی یہ جرأت کہ پیر صاحب کے سامنے خود چارپائی پر لیٹ جائے اور پیر صاحب نیچے لیٹیں۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
"فضول باتیں نہیں' میں کوئی پیر ویر نہیں ہوں' تم اوپر لیٹ جاؤ' میں نیچے ہی لیٹ جاتا ہوں۔" میں نے زمین پر بچھی دری اور چادر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"اوں ہوں۔" اس نے شوخ انداز میں سر ہلایا۔
"اچھا ایسا کرتے ہیں کہ دونوں ایک ساتھ لیٹ جاتے ہیں۔ اگر تم نیچے لیٹو گے تو میں بھی نیچے لیٹوں گی۔"
"ایسا کیسے ہوسکتا ہے کیونکہ......!" میں نے گھبرا کر اس کے حسین و گداز جسم سے نگاہیں چرا کر کہا۔
"کیونکہ تم نہ بوڑھے ہو نہ پیر ہو' تو کیا حرج ہے اس میں کہ......" اس نے میرے قریب ہو کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا' اس کی نشیلی آنکھوں میں مجھے دعوت صاف دکھائی دے رہی تھی۔
"پھر بھی یہاں یہ سب مناسب نہیں ہوگا۔" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔
"تمہیں اندازہ نہیں ہے شمروز کہ اس بڈھے کے ساتھ راتیں گزار گزار کر میں......" اس نے سر جھکا کر بھاری لہجے میں کہا۔
"لیکن میرا میک اپ......" میں نے مردہ لہجے میں کہا۔
"کچھ نہیں ہوگا میک اپ کو......" اس نے جھنجلا کر کہا۔
"ہو بھی سکتا ہے' میں اس وقت کسی بھی قسم کا رسک نہیں لے سکتا' ہاں یہ وعدہ رہا کہ اپنا کام مکمل ہوجانے کے بعد میں تمہاری خدمت کا بھرپور معاوضہ دوں گا۔" میں نے فوراً اپنے آپ کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا کیونکہ میرا دماغ مجھے مسلسل سرزنش کررہا تھا کہ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔
"پکا وعدہ!" اس نے پیاسی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے میری جانب اپنی ہتھیلی پھیلا دی' جسے میں نے مسکراتے ہوئے تھام لیا' اور اسے چارپائی پر جانے کا اشارہ کیا تو وہ بادل ناخواستہ اوپر لیٹ گئی اور میں زمین پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ میرے دل و دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں' میں بے خبر سوگیا۔
میری آنکھ فہیم کی آواز سے کھلی وہ مجھے آوازیں دے رہا تھا۔
"شمروز بھائی اٹھ جائیں' مغرب کی اذان کب کی ہوگئی' باہر بہت سے لوگ آپ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ابھی تو میں نے سب سے یہی کہہ رکھا ہے کہ آپ عبادت میں مصروف ہیں اور ہاں خاص بات یہ کہ شیر افضل کی بیوی کی خاص ملازمہ چنبیلی بھی آپ سے ملنے کے لیے آئی ہے۔"
میں فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ راکھی بھی اٹھ گئی' اس نے ہاتھ منہ دھویا اور دوپٹے کو اچھی طرح لپیٹ کر اوڑھ لیا' جیسے ہماری مائیں بہنیں نماز کے وقت اوڑھتی ہیں۔ میں نے منہ نہیں دھویا' فہیم نے پوچھا کہ میں کچھ کھاؤں گا تو میں نے منع کردیا کہ ابھی نہیں بعد میں کھاؤں گا۔ "بس ایک کپ چائے پلادو۔"
چائے پی کر میں فارغ ہوا اتنے میں فہیم کی بیوی زینب نے صحن میں صاف ستھری دری اور چادر بچھادی تھی' چارپائی پر بھی صاف چادر بچھی تھی۔ میں ہاتھوں میں موٹے دانوں کی تسبیح لے کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر فہیم نے گھر کا دروازہ کھول دیا اور لوگ ایک ایک کر کے اندر آنے لگے' پہلے وہ میرے پاس آتے میرے ہاتھوں کو چومتے پیروں کو ہاتھ لگاتے اور الٹے قدموں چلتے ہوئے جا کر زمین پر بچھی چادر پر بیٹھ جاتے' ان آنے والے لوگوں میں عورتیں اور مرد دونوں ہی تھے۔

پھر لوگوں کے مختلف مسئلے مسائل سنتے ہوئے میرا سر درد کرنے لگا' میں ہر ایک کا مسئلہ سن کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتا' بہت سے مرد و عورتیں مجھ سے دم کروانے کے لیے آئے تھے' بعض اپنے بیمار بچوں کو لائے تھے اور التجا کی کہ کوئی تعویذ عنایت کر دیا جائے' جس کے لیے میں نے کہا۔ "کل لے لینا۔" کیونکہ مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا' ورنہ اس کا بھی کوئی انتظام کر کے رکھتا۔

پھر وہ آ گئی جس کا میں انتظار کر رہا تھا' اس نے اپنا نام بتایا اور بولی۔

"پیر صاحب میرا نام چنبیلی ہے اور میں بڑی حویلی سے آئی ہوں۔ مجھے میری مالکن نے بھیجا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ آپ حویلی تشریف لائیں' وہ آپ کی خدمت کرنا چاہتی ہیں۔"

"ہمیں کسی کی خدمت کی ضرورت نہیں ہے نادان لڑکی' ہم فقیر منش ہیں۔ البتہ اپنی مالکن سے جا کر کہہ دے کہ ہم حویلی ضرور آئیں گے' ہمیں ہمارے پیر و مرشد نے یہاں بھیجا ہی اس لیے ہے کہ ہم اس کی اکلوتی اور جوان بچی کا علاج کریں' اس کے سر پر شاہ جنات کا سایہ ہے اور ہم اسے اس مصیبت سے نجات دلانے آئے ہیں۔ شاہ جنات ہمارے آستانے پر حاضری دیتے ہیں۔ انہیں ہم حکم دیں گے کہ وہ اس بچی کو چھوڑ دیں۔" میں نے بھاری آواز اور پرجلال لہجے میں کہا۔

میری بات سنتے ہی وہ میرے قدموں میں گر پڑی اور رونے لگی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"حضور کو ہر بات معلوم ہے' حویلی کے نصیب جاگ اٹھے کہ حضور تشریف لائے' میں ابھی مالکن کو جا کر یہ خوش خبری سناتی ہوں۔"

چنبیلی کا سارا وجود کانپ رہا تھا' میں اس کی یہ حالت دیکھ کر حیران ہو رہا تھا اور وہاں موجود سارے لوگ آنکھیں بند کیے جھوم رہے تھے' کوئی میرے قصیدے پڑھ رہا تھا تو کوئی سبحان اللہ کہہ رہا تھا۔

میں نے چنبیلی سے کہا۔ "جاؤ جا کر اپنی مالکن سے کہہ دو کہ ہم کل آئیں گے اور بعد نماز مغرب شاہ جنات کو حاضر کر کے حکم دیں گے کہ بچی کا پیچھا چھوڑ دے۔"

چنبیلی کپکپاتی ہوئی الٹے قدموں چلتی ہوئی وہاں سے چلی گئی تو میں بھی چارپائی سے اتر کر اندر کمرے میں آ گیا جو لوگ مجھ سے ملنے سے باقی رہ گئے وہ تاسف سے ہاتھ ملنے لگے' کہ انہوں نے ایسا کون سا گناہ کر دیا کہ پیر صاحب نے نظر کرم نہیں کی' فہیم نے انہیں تسلی دی کہ کل آ جانا' اب پیر صاحب کی عبادت کا وقت ہو گیا ہے۔

سب کے جانے کے بعد فہیم نے دروازہ بند کر دیا اور اندر آ گیا۔ مجھے لوگوں کی ذہنیت اور سوچ پر ہنسی آ رہی تھی کہ یہ کتنے احمق لوگ ہیں' مجھ سے بالکل ہی ناواقف ہونے کے باوجود جو کسی نے میرے بارے میں جھوٹ کہا' اس پر یقین کر کے بیٹھ گئے۔

نماز تو میں جیسے بھول ہی گیا تھا' اپنے بچپن کی وضو کرنے کی عادت بھی بھول گیا تھا' اور وہ کام جس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں ایسا کر سکتا ہوں' قتل اور بدکاری...... دونوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی ذات بھی کیا خوب ہے' بندہ جن راہوں پر بڑھنا چاہتا ہے وہ اس کے لیے آسان کر دیتا ہے' میں بھی اپنی سیدھی سادی زندگی چھوڑ کر جب برائی کے راستے پر چل نکلا تو اس نے وہی راہیں میرے لیے آسان کر دیں' پہلے آغا قزلباش نے میرا ہاتھ تھاما' پھر نواب ثروت الاسلام نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں خوش تھا کہ اب میں جو جرم بھی چاہوں کر سکتا ہوں' کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں بہت خوش تھا۔

نواب صاحب جو عام پیروں کے پیر بنے ہوئے تھے خود دین سے کتنا دور ہیں یہ بات میں اچھی طرح سے جانتا تھا' بدکاری یہاں برائی نہیں تھی' محض جسمانی بھوک تھی' جس طرح پیٹ کی بھوک مٹائی جاتی ہے اسی طرح جسم کی طلب بھی فطری خواہش ہے' اب کون حرام و حلال کے چکر میں پڑے...... یہ کام تو ہمارے مولویوں کا ہے' وہی سوچیں کیا حرام ہے کیا حلال ہے...... ہم سے اللہ یقیناً خوش ہے جب ہی تو ہمیں اتنا نوازا ہوا ہے' ورنہ جو لوگ دن رات اللہ کے آگے سجدے کر رہے ہیں' انہیں کیا مل رہا ہے' دکھ' پریشانیاں' میرے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔

مجھے آج خیال آ رہا ہے کہ میری سوچ کتنی غلط تھی۔ میں غلط تھا اور ہوں......

کہتے ہیں کہ جب ایک شخص کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے تو وہ ساری دنیا سے اپنی زیادتی کا انتقام لینا چاہتا ہے' بعض اوقات تو وہ اپنی ذات کو بھی اس انتقام کا نشانہ بنا لیتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلتا' میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں نے جب اللہ تعالیٰ سے احتجاج کیا کہ اس نے میرے ساتھ یہ ظلم کیوں ہونے دیا' کیوں میرا ساتھ نہیں دیا' اور پھر جب پے در پے پریشانیاں آئیں اور مایوسیوں نے میرا دامن تھاما تو میں اللہ کی ذات سے ناامید ہو گیا۔ یہی میری غلطی تھی میں رحمان کی رحمت سے مایوس ہوا تو شیطان نے میرا ہاتھ تھام لیا اور میں خوشی خوشی اس کے بتائے ہوئے راستے پر چل نکلا۔

رات کو جب میں سونے لیٹا تو راکھی بھی میرے پاس آ کر لیٹ گئی' تو میں اچھل پڑا' اور سخت لہجے [illegible]

"کیوں مجھے بار بار امتحان میں ڈال رہی ہو' جب ... یہاں کچھ نہیں ہوگا تو تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا' یہاں ہم تفریح کرنے نہیں آئے ہیں' ایک بہت اہم مشن پر آئے ہیں۔ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ میں نے یہاں آ کر کتنا بڑا رسک لیا' میں شیر کی کچھار میں جا رہا ہوں' بجائے میرا ساتھ دینے کے تم مجھے دوسرے چکروں میں ڈال رہی ہو۔"

میرے سخت لہجے کو سن کر راکھی ناراض ہو کر بیٹھ گئی اور غصے سے ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"اچھا بابا معاف کر دو' غلطی ہو گئی جو تمہارے بارے میں ایسا سوچا' تمہارا ساتھ دینے کے لیے تو یہاں تک آئی ہوں۔ نواب کی کوٹھی میں کیا یہ سب اتنا آسان ہوگا۔"

"میں مانتا ہوں کہ تم میرا ساتھ دینے کے لیے ہی آئی ہو' لیکن وقت کی نزاکت کو نہیں سمجھ رہی ہو' خواہ مخواہ جذباتی ہو رہی ہو' مجھے دیکھو میں تو مرد ہوں تم سے زیادہ بے قابو ہو سکتا ہوں لیکن وقت کو دیکھو' رہی نواب کی کوٹھی میں موقع ملنے کی بات' وہ میں نکال لوں گا' مجھ پر بھروسہ کرو......"

راکھی مجھ سے عمر میں بڑی ضرور تھی' لیکن ایک بھرپور عورت تھی' اور اس بات کا اندازہ مجھے اس کی بے تابیوں کو دیکھ کر ہی ہو رہا تھا۔

میرے کھل کر ہر بات سمجھانے پر وہ مان گئی اور مسکرانے لگی' پھر ہم اپنی اپنی جگہوں پر سو گئے۔

دوسرے دن میں بہت ایکسائیٹڈ تھا۔ میں اس علاقے میں پیدا ہوا' پلا بڑھا' لیکن آج تک وہ حویلی میں نے باہر سے ہی دیکھی تھی' کبھی اس کے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ میرا دل اپنا گھر دیکھنے کو بھی بہت چاہ رہا تھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ رات کے اس سمے جب سارے گاؤں والے سو چکے ہیں میں ایک نظر اپنا گھر دیکھ کر آ سکتا ہوں۔ میں جانتا تھا کہ میرا گھر یہاں

سے خاصا دور ہے۔ اور پیدل جاتے ہوئے وہاں تک کافی ٹائم لگ جائے گا' میں فہیم سے کہتا ہوں کہ وہ مجھے وہاں لے جائے' یہ سوچ کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

میں اٹھ کر بیٹھا تو راکھی بھی اٹھ کر بیٹھ گئی' اور بولی۔ ''کیا ہوا اٹھ کیوں گئے' کیا نیند نہیں آرہی' کیا میں آ کر سلا دوں......''

''یہ بات نہیں ہے' میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے گھر کو ایک نظر جا کر دیکھ لوں۔ دن میں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے' البتہ رات میں' میں آسانی سے وہاں تک جاسکتا ہوں۔''

''کیا اپنا گھر دیکھنے جانا ضروری ہے؟'' راکھی نے پوچھا۔

''ضروری تو نہیں ہے' لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ بار بار یہاں آ نہیں سکتا' اب اگر آیا ہوں تو دیکھ لوں کہ میرے اجڑے ہوئے گھر کا کیا حال ہے' وہ گھر جہاں میں پیدا ہوا' اس گھر کے آنگن میں کھیلتے ہوئے اپنا بچپن گزارا...... ارمان اور فائزہ کی لڑائیاں میں نے نمٹائی تھیں۔ میں چونکہ بڑا تھا اور سنجیدہ تھا اس لیے جب ارمان اس کے بال کھینچتا یا اس کی گڑیا کے ہاتھ پاؤں توڑ دیتا تو وہ روتی بسورتی سیدھی اپنی زخمی گڑیا کو میرے پاس لے آتی اور میں جو بچپن سے ہی اپنے دماغ میں یہ بات بٹھائے بیٹھا تھا کہ مجھے بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا ہے' فوراً ڈاکٹر بن جاتا اور فائزہ کی گڑیا کے ہاتھ پاؤں ٹیپ سے یا گوند سے جوڑ دیتا جو تھوڑی دیر بعد ہی دوبارہ سے علیحدہ ہو جاتے وہ پھر روتی تو ارمان اسے چڑانے کے لیے کہتا۔ ''یہ مرگئی ہے اسے کہیں دفن کردو۔'' اور فائزہ بلک بلک کر رو پڑتی۔

میری آنکھوں میں ماضی کی ان خوشگوار یادوں کے دیئے جلنے لگے' میں ان یادوں میں ڈوب چکا تھا اور مسلسل بولے جا رہا تھا' راکھی کچھ دیر تو میری باتیں سنتی رہی پھر بور ہو کر بولی۔

''میں بھی چلوں تمہارے ساتھ......!''

''چلنا چاہتی ہو تو ضرور چلو۔'' میں نے آمادگی ظاہر کی۔

''تو پھر فہیم کو جگاؤ' میرے خیال میں وہ سو چکا ہے۔'' راکھی نے کہا۔

میں نے دروازہ کھولا اور باہر صحن میں نکل آیا۔ تب میری نگاہ صحن میں بچھی واحد چارپائی کی جانب اٹھ گئی' جہاں دونوں میاں بیوی سارے جہاں سے بے خبر ایک دوسرے میں پیوست سو رہے تھے' میرے قدم بے ساختہ پیچھے ہٹ گئے' مجھے مناسب نہیں لگا کہ اس طرح سوتے ہوئے میں ان کے سرہانے کھڑے ہو کر انہیں جگاؤں' اس لیے وہیں سے کھڑے کھڑے آواز لگائی۔

''فہیم اے فہیم...... سو گئے کیا......؟''

میری ایک ہی آواز پر فہیم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بنا پاؤں میں چپل ڈالے بھاگتا ہوا کمرے کی جانب آیا' مجھے دروازے پر کھڑا دیکھا تو آنکھیں ملتا ہوا بولا۔

''کک کیا ہوا شمروز بھائی خیریت تو ہے...... کیا بات ہے؟''

''سوری یار میں نے تمہاری نیند خراب کر دی اور تمہیں سوتے سے جگا دیا۔''

''کوئی بات نہیں شمروز بھائی آپ حکم کریں۔'' وہ پوری طرح ہوش میں آ کر بولا۔

''تمہیں ایک چھوٹی سی تکلیف دینی ہے اگر تم مائنڈ نہ کرو تو......!'' میں نے کہا۔

''تکلف چھوڑیں اور کام بتائیں'' اس نے پرخلوص لہجے میں کہا اتنے میں فہیم کی بیوی بھی آ کر ہمارے درمیان کھڑی ہو گئی۔

''بھئی شمروز اپنا پرانا گھر دیکھنا چاہتے ہیں۔ دن

میں تو یہ کام ممکن ہی نہیں ہے تو سوچا کہ رات کے اس پہر جب سارا گاؤں سو رہا ہے تو کیوں نہ ہم وہاں چلیں' شمروز بتا رہے ہیں کہ یہاں سے ان کا گھر اچھے خاصے فاصلے پر ہے' پیدل جایا تو جاسکتا ہے لیکن اس میں بہت سا وقت لگ جائے گا تو کیوں نہ تمہاری ٹیکسی میں چلا جائے' اس طرح سے بہت سا وقت بچ جائے گا اور کسی کے دیکھ لینے کا خطرہ بھی نہیں ہوگا۔''

مجھے ہچکچاہٹ میں مبتلا دیکھ کر راکھی نے میری خواہش کے بارے میں فہیم کو بتا دیا۔

''ہاں ہاں بالکل چلتے ہیں۔ کیا ٹائم ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولا۔ ''میرے خیال میں ابھی آدھا گھنٹہ اور انتظار کر لیتے ہیں۔ کیونکہ یہاں اس وقت تک تقریباً گاؤں والے تو سو جاتے ہیں لیکن یہاں ایک چائے کا ہوٹل ایسا ہے جو رات کو دیر تک کھلا رہتا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ وہاں بظاہر تو چائے ہی ملتی ہے لیکن اس کی آڑ میں اور بھی بہت سے دھندے ہوتے ہیں اور اس ہوٹل والے کے اوپر حویلی والوں کا ہاتھ ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا...... کیا شیر افضل کا؟'' میں نے صاف طور پر نام لے کر پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ چائے کے ہوٹل کی آڑ میں یہاں کیا کیا دھندے ہو رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سارے ہی برے دھندے' یہاں ہر طرح کا نشہ مل جاتا ہے اور سیاحوں کو ٹائم پاس کرنے کے لیے لڑکیاں بھی مل جاتی ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ اصل میں یہ کاروبار شیر افضل ہی کا ہے بس اس نے اپنے آپ کو چھپانے کے لیے اسے کسی دوسرے کی ملکیت ظاہر کیا ہے اور ہاں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس جگہ یہ ہوٹل قائم ہے وہاں بھی کچھ شریف لوگ رہا کرتے تھے' شیر افضل نے انہیں وہاں سے بھگایا اور ان کے مکان پر قبضہ کر کے بیٹھ گیا۔''

''اچھا......!'' میں نے حیرت کا اظہار کیا اور فہیم سے کہا کہ ''چلو تو ذرا ہم بھی دیکھیں۔''

پھر ہم نے فہیم کی بیوی کو گھر پر ہی چھوڑا اور خود باہر نکل آئے' میری تو مرضی یہی تھی کہ راکھی بھی نہ جائے مگر وہ ضد کر کے ہمارے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گئی' ہم نے گھر سے چلتے وقت ایک بات کا خیال رکھا کہ ہمارے ریوالور ہمارے پاس ہوں۔ یہاں آ کر فہیم نے مجھے ریوالور اور اس کا سائلنسر دونوں چیزیں دے دی تھیں۔

بظاہر تو میں ایک بوڑھے کے گیٹ اپ میں تھا لیکن اندر سے بہت الرٹ اور ایکٹو تھا۔

ٹیکسی کے ذریعے تو ہم دس منٹ میں ہی اس جگہ پہنچ گئے' جو راستہ میں فہیم کو بتا رہا تھا' راستہ سمجھنے کے بعد فہیم کوئی بات کہتے کہتے رک گیا اور خاموشی سے چلنے لگا۔ اور جب فہیم نے میرے گھر کے سامنے ٹیکسی روکی تو میں حیران رہ گیا۔

ٹیکسی میرے گھر کے سامنے نہیں چائے کے اسی ہوٹل کے سامنے رکی تھی جس کے بارے میں مجھے کچھ دیر پہلے فہیم نے بتایا تھا۔

''فہیم تم مجھے یہاں کیوں لے کر آئے ہو' میں نے تو تمہیں اپنے گھر کا راستہ سمجھایا تھا' میں سمجھا کہ یا تو یہ رات کے اندھیرے کی وجہ سے صحیح راستہ نہیں سمجھا ہے یا پھر پہلے مجھے یہ ہوٹل دکھانا چاہتا ہے' میرے کہنے پر فہیم آہستہ سے بولا۔

''یہی پہلے کبھی آپ کا گھر ہوا کرتا تھا' لیکن اب یہاں بدمعاشوں کا اڈا کھل گیا ہے' اب میں سمجھا کہ وہ لوگ آپ ہیں جن کے ساتھ شیر افضل نے زیادتی کر کے انہیں بھاگ جانے پر مجبور کر دیا' بعد میں ان کا سارا سامان نکال کر باہر پھینکا اور اس جگہ پر قبضہ

کرلیا۔ آپ نے جب مجھے اپنے گھر کا راستہ سمجھایا تھا میں جب ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کے گھر پر تو اب ہوٹل بن چکا ہے۔"

میری آنکھیں ایک مرتبہ پھر جلنے لگیں۔ شدید غصہ' جھنجلاہٹ' میں نہ جانے کن کن کیفیات سے گزر رہا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اس کا حشر نشر کردوں۔ ایک بم مار کر اس ہوٹل کو تباہ و برباد کردوں۔

"یہاں رات کو لوگ تو ہوتے ہوں گے۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! اور کہاں جا کر مریں گے' رات کو کبھی کبھار ان بدمعاشوں کی دل پشوری کے لیے لڑکیاں بھی آجاتی ہیں' پھر رات رات بھر محفل جمتی ہے اور کوئی روکنے والا بھی نہیں ہوتا۔ یہ بھی سنا ہے کہ بعض اوقات ان ناچ رنگ کی محفلوں میں شیر افضل بھی شامل ہوتا ہے' ویسے عام طور پر وہ یہاں ہوتا نہیں ہے۔" فہیم نے اتنی اہم بات مجھے آخر میں بتائی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ وہ یہاں نہیں ہوتا تو کہاں ہوتا ہے!" میں نے چونک کر کہا۔

"وہ زیادہ تر شہر میں رہتا ہے' بس کبھی کبھار ہی ادھر آتا ہے' اور جب آتا ہے تو ناچ گانے کی محفلیں بھی سجائی جاتی ہیں۔" فہیم بولا۔

"اور یہ بات تم مجھے اب بتا رہے ہو' شاید تمہیں میرے یہاں آنے کے ارادے کا معلوم نہیں ہے۔" میں نے بگڑے ہوئے موڈ میں بتایا۔

"چلیں کوئی بات نہیں وہ یہاں کافی دنوں سے آیا نہیں ہے ہوسکتا ہے کچھ دنوں میں چکر لگا لے' اتنے آپ اس کی بیٹی کا جن اتاریں۔" فہیم نے شوخ لہجے میں کہا۔

"تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور مجھے غصہ آرہا ہے میں کب تک اس کا انتظار کروں گا وہ نہ جانے کب آئے گا۔" میں نے جھنجلا کر اپنا سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"آجائے گا۔" فہیم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں کہا پھر بولا۔ "دیکھ لیا آپ نے اپنا گھر...... اب اس کا کیا کرنا ہے؟"

"اس کے بارے میں بھی میں نے سوچ لیا ہے کہ کیا کرنا ہے' پھر میں اسے کچھ ضروری ہدایات دینے لگا' میری باتیں سن کر فہیم نے سر ہلایا اور بولا۔

"ترکیب تو آپ نے لاجواب سوچی ہے' اس طرح سے دو کام ہوں گے ایک تو شیر افضل واپس آجائے گا' دوسرے آپ کے دل کی جلن کو تھوڑا سا سکون مل جائے گا۔"

"دل کی آگ صرف شیر افضل کے خون سے ہی ٹھنڈی ہوگی۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

پھر ہم نے واپسی کا سفر اختیار کیا' راستے میں میں سوچ رہا تھا کہ جب شیر افضل کو میری موت کی اطلاع ملی ہوگی تو وہ بے فکر ہوگیا ہوگا کہ اب تو میرے بابا کا نام و نشان ہی مٹ گیا' اب کون آئے گا ادھر کی خبر لینے...... اور اس کے کہنے پر اس کے غنڈوں نے میرے مکان پر قبضہ کرلیا' سارا سامان میں اسی طرح چھوڑ گیا تھا' اس میں کتنی ہی نشانیاں تھیں سب کی' بابا' اماں کی ارمان اور فائزہ کی' اب میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے سوائے یادوں کے۔

شیر افضل کے لیے میرے دل میں جو نفرت' غصہ اور انتقام تھا' اس کی اس حرکت کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوگیا' میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں ابھی اور اسی وقت جا کر اس کی غرور سے اکڑی ہوئی گردن مروڑ کر پھینک دوں۔

واپسی کا راستہ بہت خاموشی سے طے ہوا' میں کچھ بول نہیں رہا تھا تو وہ دونوں بھی خاموش تھے' انہیں

اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ اس وقت میرے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے' میرا دل کتنا بے چین اور بے قرار ہو رہا تھا۔ اپنے گھر کو دیکھنے کے لیے' مجھے تنہا چھوڑ کر جانے والے میرے پیاروں کی نشانیوں کو سینے سے لگانے کا' لیکن یہاں بھی مجھے اس رزیل شیر افضل کے ایک اور ستم کا سامنا کرنا پڑا۔

اچھا ہوا راستے میں کسی سے مڈبھیڑ نہیں ہوئی' سارا گاؤں سویا ہوا تھا' ہم فہیم کے گھر واپس آگئے۔

"کیا ہوا تم لوگ جلدی واپس آگئے' سب خیر تو رہی؟" فہیم کی بیوی نے ہمیں اتنی جلدی واپس آتا دیکھ کر سوال کیا۔

"ہاں سب خیر ہے تو سو جا۔" فہیم نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"شمروز بھائی تھوڑا صبر سے کام لیں۔ انشاء اللہ آپ جلد ہی اپنا مقصد پالیں گے' ویسے میں ایک بات آپ کو بتانا بھول گیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شیر افضل ادھر اپنی حویلی میں موجود نہیں ہے' وہ شہر گیا ہوا ہے ہوسکتا ہے کہ ایک دو روز میں واپس آجائے۔" فہیم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو میں نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں چپ چاپ جا کر زمین پر بچھے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ راکھی بھی آکر میرے پاس بیٹھ گئی' اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آہستہ آہستہ سہلانے لگی' گویا وہ خاموشی کی زبان سے مجھے تسلی دے رہی تھی۔ میں چپ لیٹا چھت کو گھور رہا تھا' وہ تھوڑی دیر میرے پاس بیٹھی رہی پھر اٹھ کر بنا کچھ کہے چارپائی پر جا کر لیٹ گئی۔

کافی دیر خاموشی کے بعد مجھے راکھی کی آواز سنائی دی وہ کہہ رہی تھی۔

"اب تمہارا کیا پروگرام ہے' کل تم شیر افضل کی حویلی جاؤ گے......؟"

"آں...... ہاں!" میں سمجھ رہا تھا کہ راکھی سوچکی ہے لیکن میرے ساتھ ساتھ وہ بھی جاگ رہی تھی۔ اس لیے اس کے اچانک سوال کو سن کر میں چونک پڑا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی' تمہاری خاص مریدنی کی حیثیت سے' مجھے تمہاری بے تحاشا کرامات کے بارے میں بھی تو شیر افضل کی بیوی کو بتانا ہے۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے تم بھی چلنا۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

میرا مطلب شیر افضل کی بیوی سے ملاقات یا اس کی بیٹی کو ٹھیک کرنا نہیں تھا' میری بلا سے' اس کی بیٹی پاگل دیوانی تھی یا اس پر جنات کا سایہ تھا تو ہوا کرے۔ میرا اصل مقصد تو اس کی حویلی میں قیام کرنا تھا اور وہ بھی اس وقت جب شیر افضل بھی حویلی میں موجود ہو' تاکہ کسی رات کو موقع سے فائدہ اٹھا کر میں اس کا کام تمام کردوں اور خاموشی سے حویلی سے لوٹ جاؤں۔ بھاڑ میں جائے اس کی بیٹی...... پیر صاحب بننے کا ناٹک میرے دماغ میں آیا ہی اس کی بیٹی کی وجہ سے تھا۔

وہ رات میری سوتے جاگتے ہوئے گزری' آنکھیں بند کرتا تو بابا اماں ارمان اور فائزہ کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا' فائزہ کی بے حرمتی اور پھر اس کی لاش...... اس کی تدفین۔

فائزہ کا رونا' مچلنا' تڑپنا...... اس کا فریاد کرنا...... بار بار مجھے پکارنا...... مجھے سب یاد آرہا تھا۔

ایک دن وہ تھا جب میری معصوم بہن شیر افضل کے پالتو کتوں کے ہاتھوں پامال ہوئی اور اپنی جان سے گزر گئی۔ وہ اذیت ناک لمحے میں نے جس طرح سے گزارے تھے وہ میرا دل ہی جانتا تھا' میرے ذہن

کی کیفیت کچھ اس طرح کی ہوگئی تھی کہ میرا دل چاہتا تھا ہر وہ لڑکی جو خود کو باعزت رکھنا چاہتی ہے' یا اپنے آپ کو اپنے باپ اور بھائی کی عزت سمجھتے ہوئے اپنی حفاظت کرتی ہے اسے بے عزت کردوں......! تاکہ اس کا باپ بھی مرجائے اور بھائی کو کہیں ڈوب مرنے کی جگہ نہ ملے' جو اذیت دن و رات میں اٹھا رہا ہوں' وہی اذیت دوسرے لوگ بھی اٹھائیں۔

میں لیٹا ہوا ایک اور بات سوچ رہا تھا' میں نے ایک فیصلہ کیا اور اس فیصلے کو کرنے کے بعد مجھے اپنے اندر ایک اطمینان سا اترتا ہوا محسوس ہوا اور پھر میری آنکھ لگ گئی۔

دوسرے دن لوگوں کے شور و غل سے میری آنکھ کھل گئی' میں نے گھڑی میں ٹائم دیکھا صبح کے دس بج رہے تھے' راکھی اپنے بستر پر موجود نہیں تھی' کمرے کا دروازہ بند تھا' میں سمجھ گیا کہ باہر گاؤں والوں کا رش لگ گیا ہے۔ سب مجھ سے مل کر اپنی مشکلات کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے' میں کیا کسی کی مشکلات دور کرسکتا تھا' میں تو خود اپنی مشکل دور کرنے کے لیے آیا تھا اور ویسے بھی آج میرا ارادہ ان جاہل لوگوں سے ملنے کا نہیں تھا جو اندھے باؤلے ہر ایک پر آنکھیں بند کرکے ایمان لے آتے ہیں۔ مجھے تو آج شیر افضل کی حویلی جانا تھا' اور یہاں آنے کا میرا مین مقصد بھی یہی تھا۔

ابھی میں لیٹا سوچ ہی رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور راکھی اندر داخل ہوئی۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اس نے اندر آ کر دروازہ بند کردیا اور بولی۔

"شمروز تم جاگ گئے' میں جانتی ہوں تم رات کو دیر سے سوئے تھے اس لیے تمہیں نہیں جگایا۔ باہر بہت سے لوگوں کا رش لگ گیا ہے' سب فہیم کی خوشامد کررہے ہیں کہ وہ ذرا دیر کے لیے تم سے ملنے دے۔ حویلی سے شیر افضل کی ملازمہ بھی آئی ہوئی ہے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے' فہیم نے ان سب سے یہی کہا ہے کہ تم نے رات بھر جاگ کر عبادت کی ہے' اب فجر کی نماز کے بعد سو رہے ہو۔"

"عبادت...... نماز......" میں دھیرے سے ہنس پڑا اور آہستہ سے زیر لب کہا۔

"کیا ملا مجھے اللہ کے آگے ماتھا ٹیک کے...... میں نے شرافت اور ایمان داری کی زندگی گزاری تو ظلم بھی میرے ساتھ ہی ہوا۔ اس لیے میں نے سب کچھ چھوڑ دیا' نماز بھی...... "وہ" کہتا ہے کہ سب کچھ اس کے اختیار میں ہے' ہر بات پہلے سے لکھی ہوئی ہے' تو پھر کیا فائدہ گناہ اور ثواب کے چکر میں پڑنے کا......"

"کیا تم مجھ سے کچھ کہہ رہے ہو؟" راکھی نے میری بڑبڑاہٹ کو محسوس کر کے کہا۔

"نہیں کچھ نہیں' " میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"چھوڑو جانے دو اس بات کو...... تم واش روم سے ہو آؤ پھر ناشتہ کرتے ہیں' میں نے بھی ابھی تک تمہارے انتظار میں ناشتہ نہیں کیا ہے۔" اس نے بات کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"گھر کے اندر تو کوئی نہیں ہے ناں۔" میں نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"شیر افضل کی ملازمہ بیٹھی ہے تم سنبھل کر جانا۔" راکھی نے بتایا تو میں نے چادر اٹھا کر سر پر لے لی اور دھیمی چال چلتا ہوا باہر نکل آیا' راکھی بھی مؤدب انداز میں میرے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی۔

مجھے دیکھا تو شیر افضل کی وہی ملازمہ جو کل مجھ سے ملنے کے لیے آئی تھی چنبیلی نام کی تیزی سے اٹھ کر میرے قریب آئی اور سر جھکا کر مجھے سلام کیا اور مؤدب انداز میں کھڑی ہوگئی۔ میں نے بھاری لہجے میں سلام کا جواب دے کر اس کے جھکے ہوئے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

"ہم جانتے ہیں کہ وہ بڑی بے صبری سے ہمارا انتظار کررہی ہے لیکن ابھی ہمیں کہیں بھی جانے کا حکم نہیں ہوا ہے' ہمیں جیسے ہی حکم ہوگا ہم خود آجائیں گے اب تو جا اور جا کر اپنی مالکن کو بتادے۔"

"کس کا حکم حضور......!" اس نے سر اٹھا کر حیرت سے کہا۔

"ہش......!" راکھی نے منہ پر انگلی رکھ کر خشمگیں نگاہوں سے چنبیلی کو گھورا اور نیچی آواز لیکن سخت لہجے میں کہا۔

"سرکار سے سوال نہیں کرتے' گستاخی ہوتی ہے' تم نے سنا نہیں سرکار نے کیا کہا ہے' اب تم گھر جاؤ اور انتظار کرو' سرکار خود آجائیں گے۔"

"غلطی ہوگئی...... اللہ توبہ اللہ توبہ!" اس نے خوف زدہ ہو کر اپنے دونوں گال پیٹ ڈالے اور میں زیر لب مسکراتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا۔

واپس آیا تو چنبیلی جا چکی تھی۔ باہر سے لوگوں کی آوازیں بھی نہیں آرہی تھیں' شاید چنبیلی نے انہیں سمجھا دیا تھا۔

میں باہر آ کر ہنس پڑا اور راکھی کو تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے بہت زبردست انٹری ماری۔"

"تم نے بات بھی تو ایسی ہی کہی تھی' مجھے تو ایسا جواب دینا ہی تھا' ویسے تم نے اسے منع کیوں کردیا۔ تمہارا پروگرام کیا ہے؟" راکھی نے پوچھا۔

"آج ہی شام کو چلیں گے' میں دراصل اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا اور پھر اس طرح کی بات سے رعب بھی پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" راکھی نے میری بات سے اتفاق کیا۔ بات کرتے کرتے ہم دوبارہ کمرے میں آگئے' اتنے میں فہیم کی بیوی اشتہا انگیز ناشتے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ دیسی گھی میں بنے ہوئے زبردست پراٹھے' ساتھ انڈے فرائی کیے ہوئے تھے اور سوجی کا حلوہ بھی تھا۔

ناشتہ دیکھ کر میں زور سے ہنس پڑا اور کہا۔ "تم تو واقعی حلوے کھانے والے مولویوں کا ناشتہ بنا لائی ہو۔"

"شہر میں کہاں آپ کو ایسا ناشتہ کھانے کو ملتا ہوگا شمروز بھائی۔" فہیم کی بیوی نے کہا۔

"ملتا تو سب کچھ ہی ہے لیکن اب ہم اس قسم کے ہیوی ناشتوں کے عادی نہیں رہے۔" میرے بجائے راکھی نے جواب دیا تو فہیم کی بیوی نے اسے شاکی نگاہوں سے دیکھا۔

"راکھی ٹھیک کہہ رہی ہے' ایسا ہی ہے' لیکن تم نے اتنی محبت سے ہمارے لیے یہ ناشتہ بنایا ہے تو میں ضرور یہ پراٹھے کھاؤں گا' دیسی گھی میں تر بتر...... میں جب شہر سے گاؤں آیا کرتا تھا تو اماں محبت سے کہتی تھیں۔ "کتنا دبلا ہوگیا ہے' گھی شی جو کھانے کو نہیں ملتا۔ حالانکہ میں کوئی دبلا نہیں ہوتا تھا' لیکن ممتا کی ماری ماں کی آنکھیں ہمیشہ اپنے بچوں کی صحت کے لیے فکرمند رہتی ہیں۔" میں نے ماضی میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ دل سے یہ ناشتہ کھاؤ گے۔" فہیم کی بیوی نے خوش ہو کر کہا۔

فہیم مجھے دکھائی نہیں دیا تو میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو اس کی بیوی نے بتایا کہ وہ کسی ضروری کام سے باہر گیا ہے' کہہ رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں آجائے گا۔"

"کسی ضروری کام سے......؟" میں نے پوچھا۔

''وہ جی پتا نہیں جی...... یہ تو اسے ہی معلوم ہوگا۔'' اس نے نگاہیں چرا کر جواب دیا' اور نہ جانے کیوں اس کے اس طرح سے جواب دینے سے میں کچھ کھٹک سا گیا کہ یہ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہے' فہیم کہاں اور کیوں گیا ہے یہ بات اس کے علم میں ہے' مجھے جواب دینے میں اس کا لہجہ سادہ نہیں تھا۔

یہ میری پرانی عادت تھی کہ جب کوئی بات میرے دل میں کھٹک جائے تو مجھے بے چینی سی شروع ہو جاتی ہے' میں نے چند نوالے لے کر ہی ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا' راکھی نے دیکھا تو بولی۔

''کیا بات ہے شمروز تمہارے چہرے پر مجھے تردد کے آثار دکھائی دے رہے ہیں' کیا بات ہے کسی الجھن میں ہو' ناشتے سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔''

''نہیں کچھ نہیں' بس دل نہیں چاہ رہا ہے' میں ہیوی ہیوی سا فیل کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا تو راکھی خاموش ہوگئی۔

میں مسلسل خاموش سوچ میں گم بیٹھا تھا کہ اس نے حلوے سے بھرا چمچہ میرے منہ کی جانب بڑھاتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا۔

''حلوہ تو کھائیے پیر صاحب' یہ بطور خاص آپ کے لیے بنا ہے۔''

''ہٹاؤ اسے مجھے نہیں کھانا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا اور زور سے اس کا ہاتھ پرے کر دیا' تو وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی پھر بولی۔

''ہوا کیا ہے' کچھ مجھے بھی تو بتاؤ' اچانک ہی تمہارا موڈ کیوں آف ہوگیا۔''

''کہہ تو دیا کوئی بات نہیں ہے' بس ہٹاؤ یہ سب میرے سامنے سے۔'' میں نے کہا تو وہ اٹھ کر خاموشی سے باہر چلی گئی' واپسی میں فہیم کی بیوی اس کے ساتھ تھی' وہ برتن اٹھا کر چلی گئی' اس کے ساتھ ہی راکھی بھی باہر نکل گئی اور دروازہ بھیڑ دیا۔

میں اس الجھن میں تھا کہ فہیم ایسے کون سے کام سے گیا ہوگا کہ وہ مجھ سے چھپانا چاہتا ہے۔ پھر میں نے اپنے آپ کو خود ہی سمجھایا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ میرا وہم ہی ہو' بھلا فہیم مجھ سے کیا چھپائے گا' وہ تو یہاں میری مدد کر رہا ہے' اس نے اپنے گھر میں مجھے رکھا ہوا ہے۔

تب ہی مجھے ہلکے سے باہر کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی' میں نے اٹھ کر اپنے کمرے کے بند دروازے کی جھری سے جھانک کر دیکھا تو فہیم تھا۔

فہیم اندر آ گیا تو اس کی بیوی نے دروازہ بند کر دیا' یہ دیکھ کر میں پلٹ ہی رہا تھا کہ میں ٹھٹک گیا۔ میں نے تیزی کے ساتھ راکھی کو اس کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا' پھر دونوں سرگوشیوں میں کچھ باتیں کرتے رہے' مجھے ان کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی' مگر لگتا تھا کہ دونوں میں کوئی بہت خاص میٹنگ ہوئی ہے۔

بات ختم کرنے کے بعد راکھی واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی اور فہیم میری جانب آنے لگا' یہ دیکھ کر میں تیزی کے ساتھ جا کر بستر پر لیٹ گیا۔

فہیم دروازہ کھول کر اندر آیا اور میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اٹھ گئے شمروز بھائی۔''

''ہاں میں تو کافی دیر ہوئی اٹھ گیا تھا' ناشتہ بھی کر لیا' تمہاری بیوی نے زبردست پراٹھوں اور انڈوں کا ناشتہ کروایا ہے' لیکن ناشتے میں تم شامل نہیں تھے کہیں گئے ہوئے تھے کیا۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں پوچھا تو وہ لمحہ بھر کو چپ ہوگیا پھر بولا۔

''ہاں وہ ذرا میں حویلی کی طرف چکر لگانے کے لیے گیا تھا کہ پتا کروں کہ شیر افضل آیا یا نہیں۔''

''اچھا تو پھر کیا خبر لائے ہو؟'' میں نے لیے لیے ہی پوچھا۔

''وہ آج کل میں آنے ہی والا ہے سنا ہے' اب کہ تو کافی دنوں کے لیے آئے گا' وہ اپنی بیٹی کی وجہ سے کافی پریشان ہے۔'' فہیم بولا۔

''تمہیں یہ سب کس نے بتایا......!'' میں نے اپنے لہجے میں ابھرنے والے تیکھے پن کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

''حویلی کے ایک دو ملازمین سے میری سلام دعا ہے' وہ جو ڈرائیور ہے ناں خالد...... اس سے بات ہوئی ہے۔'' فہیم نے کہا۔

فہیم کی بات سن کر میں خاموش ہوگیا' حالانکہ جو کچھ فہیم نے بتایا تھا' ہو سکتا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہو لیکن نہ جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا' میرا شک اپنی جگہ موجود تھا' میں کیا شک کر رہا تھا' کیوں مطمئن نہیں ہو رہا تھا' اس کا جواب خود مجھے اپنے آپ سے بھی نہیں مل رہا تھا۔

ہم دونوں کے درمیان کافی دیر خاموشی چھائی رہی' پھر فہیم نے اس خاموشی کو توڑا اور بولا۔

''حویلی کب جانا ہے......؟''

''شام کو جاؤں گا۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کیا بات ہے شمروز بھائی آپ بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے ہیں' کیا رات والی بات سوچ رہے ہیں یا کوئی اور بات ہے۔'' فہیم نے میری غیر معمولی سنجیدگی یا خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا یا پھر راکھی نے اس سے ایسی کوئی بات کہہ دی' جس کی وجہ سے اس نے مجھ سے یہ سوال کیا۔

''نہیں رات والی بات تو نہیں سوچ رہا' بس ایسے ہی خاموش ہوں' کچھ دیر تنہا رہنا چاہتا ہوں' ہو سکے تو مجھے تھوڑی دیر تک ڈسٹرب نہ کیا جائے۔'' میں نے کہا تو وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

میرا دماغ ایک بار پھر وہی باتیں سوچنے لگا' میں جن حالات سے گزر کر آیا تھا' ان میں تو انسان اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کرتا' نواب سطوت الاسلام کی شخصیت بھی میری نگاہ میں مشکوک تھی۔ آخر اس نے میرے اوپر اتنی جلدی بھروسہ کیسے کر لیا۔ اپنے ساتھ بھی رکھ لیا اور پھر شیر افضل سے انتقام لینے کے لیے مجھے یہاں بھیج بھی دیا۔ میری مدد بھی کر رہا ہے' جب کہ یہ بات میرے علم میں آ چکی ہے کہ شیر افضل سے اس کی دوستی تھی۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس کا دشمن بن چکا ہے' اور سیاسی پارٹی اس نے چھوڑی ہی شیر افضل کی وجہ سے تھی۔ لیکن اگر ایسی بات تھی تو اس دن پارٹی میں شیر افضل بھی تو موجود تھا۔ نواب نے اسے دعوت بھیجی اور وہ آ بھی گیا۔ اس کا تو سیدھا مطلب یہی نکلتا ہے کہ عام لوگوں کی نگاہ میں ان کی دوستی ابھی تک قائم ہے' لیکن نواب دل سے شیر افضل کو پسند نہیں کرتا' وہ اسے اپنے راستے سے ہٹانا چاہتا ہو' اس لیے وہ ایک پنتھ دو کاج والا فارمولا استعمال کر رہا ہے۔ شیر افضل کو مروانا دراصل اس کی اپنی خواہش ہے' جو وہ میری مدد کر کے میرے اوپر اپنا ایک احسان کر رہا ہے۔

جو بھی ہے' مجھے تو شیر افضل سے اپنے خاندان کی تباہی کا انتقام لینا ہے' اتنا کچھ سوچنے کے بعد میری الجھن ختم ہوگئی' اور میں اٹھ کر باہر آ گیا' اور ان لوگوں کے درمیان بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

پانچ بجے کے قریب میں شیر افضل کی حویلی جانے کے لیے بالکل تیار تھا' راکھی بھی شلوار قمیص اور بڑے سے دوپٹے میں ملبوس میرے ساتھ تھی۔

''کیا میں آپ کے ساتھ چلوں شمروز بھائی۔'' فہیم نے پوچھا۔

''نہیں تمہارے جانے کی ضرورت نہیں ہے' مجھے حویلی کا راستہ اچھی طرح سے معلوم ہے۔ میں راکھی کو ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

”لیکن شمروز بھائی حویلی یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے آپ کو میں ٹیکسی میں چھوڑ آتا ہوں۔“ فہیم نے پیش کش کی۔

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو واقعی حویلی کا یہاں سے فاصلہ زیادہ ہے پھر تم ایسا کرو کہ ہمیں حویلی سے تھوڑا دور اتار دینا، وہاں سے ہم پیدل ہی حویلی جائیں گے اور جب واپس آنا ہوگا تو میں تمہیں ایس ایم ایس کردوں گا، تم اسی جگہ ٹیکسی لے کر آجانا، جہاں ہمیں اتارو گے۔“ میں نے کہا تو فہیم تیار ہوگیا۔ اور ہم فہیم کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے۔

میں نے حویلی سے ایک مناسب فاصلے پر ٹیکسی رکوائی اور اتر گیا۔ پھر میں اور راکھی حویلی کی جانب روانہ ہوگئے، راکھی اس وقت جس حلیے میں تھی اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ایک ہندو لڑکی ہے۔

میں حویلی کے گیٹ پر پہنچا تو میں نے اپنے ہاتھ میں تھامی ہوئی لکڑی کی اسٹک سے گیٹ بجایا، ذرا دیر میں ایک خاصی تگڑی مونچھوں والے اور لمبے قد کے شخص نے گیٹ کھولا اور ترش لہجے میں بولا۔

”کیا بات ہے......؟ کون ہو تم......؟“

”حویلی کی مالکن سے کہو کہ حضور تشریف لے آئے ہیں۔“ راکھی نے آگے بڑھ کر میری جانب دیکھتے ہوئے ادب سے کہا۔

”حضور......!“ اس نے اچنبھے سے کہا۔

”واپس چلو لڑکی...... جب اس حویلی کے نوکروں کو ہی تمیز نہیں ہے تو ہم کسی اور سے کیا توقع رکھیں۔“ یہ کہہ کر میں مڑ کر دھیمے قدموں سے چلنے لگا۔

”گستاخ...... تم نے بڑے پیر صاحب کی شان میں گستاخی کی ہے۔ یہ تو کہیں آتے جاتے بھی نہیں ہیں، وہ تو انہیں حکم ہوا تھا کہ اس حویلی میں ایک لڑکی بیمار ہے اس کے علاج کے لیے تشریف لائے تھے۔ اور تو نے انہیں ناراض کردیا۔“ راکھی نے غصے سے کہا۔

”ارے باپ رے باپ...... یہ کیا گناہ ہوگیا مجھ سے......“ وہ گیٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا میرے پاس آیا اور میرے قدموں میں گر پڑا...... وہ رو رہا تھا اور گڑگڑا رہا تھا۔

”حضور مجھے معاف کردیں، مجھ سے بڑی بھول ہوگئی۔ مجھے پتا نہیں تھا، مالکن کو پتا چلا کہ میں نے حضور کے ساتھ گستاخی کی ہے تو وہ میری بوٹیاں کتوں کو کھلا دیں گی۔“

میں چلتے چلتے رک گیا اور اسے سیدھا کھڑا کرکے کہا۔ ”تیرے پاس وہ آنکھ ہی نہیں ہے کہ جس سے تو کسی کو پہچان سکے، جا معاف کیا۔“

وہ مجھے بڑی عزت واحترام سے حویلی میں لے آیا اور لے جا کر ایک لکڑی کے تخت پر بٹھا دیا، جس پر نہایت نفیس اور قیمتی بستر بچھا ہوا تھا، میرے وہاں بیٹھتے ہی شیر افضل کی بیوی بھی تقریباً بھاگنے کے انداز میں وہاں آگئی اور آتے ہی جھک کر مجھے سلام کرنے کے بعد میرے پیروں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھو کر سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے دوپٹہ سر پر اس طرح سے لیا ہوا تھا جس نے اس کی پیشانی کو ڈھانکا ہوا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا، اس لیے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ میں نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس نے اپنا جھکا ہوا سر میرے آگے کردیا، میں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا، تو وہ تیزی سے میرے پیروں کے سامنے بیٹھ گئی، اور بلک بلک کر رونے لگی۔ وہ روتی جارہی تھی اور کہتی جارہی تھی۔

”حضور میرے بخت جاگ اٹھے جو آپ میرے غریب خانے پر تشریف لائے، مجھے چنبیلی نے بتایا تھا کہ آپ کو بطور خاص میرے لیے حکم ہوا تھا، شاید میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی نیکی کی ہوگی...... سرکار میری ایک ہی اولاد ہے، وہ بھی بیٹی...... لیکن نہ جانے اللہ نے مجھے کس گناہ کی سزا دی ہے، میری جوان بچی کسی شیطان کے سائے کا شکار ہوگئی ہے، بہت علاج کروایا، لیکن وہ ٹھیک ہی نہیں ہو پائی۔ اب اللہ نے آپ کو ہمارے لیے بھیج دیا ہے تو مجھے امید ہے کہ آپ میری بیٹی کو اس عذاب سے ضرور نجات دلائیں گے۔“

”گناہ گار تم نہیں تمہارا شوہر ہے......!“ میں نے بھاری لہجے میں کہا تو اس نے ایک دم چونک کر سر اوپر اٹھایا اور میری جانب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگی۔

”کیا میں نے غلط کہا......!“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ روتے ہوئے بولی۔

”آپ اللہ والے ہیں، غلط کیسے کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو تو کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے، سب کچھ ہی معلوم ہے۔“

”شیر افضل بڑا ظالم انسان ہے، اس کا ظلم اس کے آگے آرہا ہے، لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ اس کی بیٹی کن حالوں میں جی رہی ہے، اسے بیٹے کی خواہش تھی اور تو نے اسے بیٹی جن کے دے دی، وہ اس کی شادی بھی نہیں کرے گا، کیونکہ اس طرح اس کی ساری زمینیں اور جائیداد غیر کے قبضے میں نہ چلی جائیں۔“ میں نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔

”سبحان اللہ...... سبحان اللہ......!“ میرے کانوں میں کئی آوازیں آئیں، تب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا، تو وہاں چنبیلی اور اس کے علاوہ ایک آدمی اور موجود تھا، شاید وہ حویلی کا خاص ملازم تھا۔ راکھی بھی زمین پر بیٹھی تھی اور آنکھیں بند کیے گم صم بیٹھی تھی۔

”آپ نے بالکل سچ فرمایا حضور...... ایسا ہی ہے، اگر میں بیٹا پیدا نہ کرسکی تو اس میں میرا اور میری بیٹی کا کیا قصور ہے، یہ تو رب کی مرضی ہے، اب میری بیٹی کا خاندان میں کوئی جوڑ بھی نہیں ہے، ایک دو دور پرے کے رشتہ داروں نے میری شہزادی کا ہاتھ بھی مانگا لیکن میرے نصیبوں کے مالک نے بیٹی کا رشتہ دینے سے صرف اس لیے انکار کردیا کہ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے، جو بیٹی کے بدلے میں ہاتھ مانگ لیتے یا پھر وہ خود ایک اور نکاح کر لیتے“ وہ میں نے قبول نہیں کیا، شہزادی کی ساتھ کی ساری لڑکیاں بیاہی گئی ہیں، کئی کئی بچوں کی ماں ہیں، اپنے گھروں میں خوش ہیں لیکن میری بچی میری شہزادی تنہائی کا عذاب جھیل رہی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔

سارا کیس میری سمجھ میں آچکا تھا، شیر افضل کی بیٹی شہزادی کی شادی نہیں ہوسکی تھی، جب کہ بقول اس کی ماں کے اس کے ساتھ کی تمام لڑکیوں کی شادیاں ہوچکی تھیں۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میں یہ بات فوراً سمجھ گیا کہ شہزادی کو ہسٹیریا کی شکایت ہے، اس بیماری میں جو کیفیت ہوتی ہے، عام طور پر ہمارے گاؤں اور دیہاتوں میں یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ اس لڑکی پر کوئی جن عاشق ہوچکا ہے، یہاں اس وقت میں اس بیماری کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا، بس یہ جان لیں کہ میں ساری بات سمجھ گیا اور اس کا علاج بھی میں نے سوچ لیا اور علاج کا سوچتے ہی میرے لبوں پر ایک نہایت سفاک مسکراہٹ دوڑ گئی، شیر افضل سے میں اپنا ایک انتقام تو بڑی آسانی کے ساتھ لے سکتا تھا۔

میں نے شیر افضل کی بیوی جس نے اپنا نام کلثوم بتایا تھا اس کو تسلی دی اور یقین دلایا کہ میں اس کی بیٹی کے سر آنے والے شاہ جنات کا پتا صاف کرکے ہی جاؤں گا، پھر میں نے شہزادی سے ملاقات کی خواہش

ظاہر کی جس پر کلثوم تھوڑا سا جھجک گئی۔

"کیا بات ہے کلثوم تم اپنی بیٹی کو سامنے کیوں نہیں لارہیں۔" میں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔

"وہ...... وہ حضور...... بات دراصل یہ ہے کہ آپ کی آمد کا پتا چلتے ہی شہزادی کو دورہ پڑ گیا ہے شاہ جنات کی سواری آ گئی ہے اور وہ بہت غصے کا اظہار کررہے ہیں۔ وہ آپ کے سامنے نہیں آنا چاہتے اور چاہتے ہیں کہ آپ یہاں سے فوراً چلے جائیں ورنہ وہ شہزادی کو اپنے ساتھ لے کر چلے جائیں گے۔" کلثوم نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

کلثوم کی بات سن کر مجھے دل ہی دل میں ہنسی آ گئی اور اس بات کا پورا یقین ہوگیا کہ کلثوم کی بیٹی یا تو ہسٹیر یا کی مریضہ ہے یا پھر وہ شاہ جنات کے آنے کا ڈھونگ رچارہی ہے کیونکہ اگر وہ جن ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ میں کوئی پیر فقیر نہیں ہوں بلکہ پیر صاحب بن کر آیا ہوں۔

"کوئی بات نہیں ہے اگر شہزادی ہمارے سامنے نہیں آنا چاہتی تو ہم خود اس سے ملاقات کر لیتے۔ ہمیں تو صرف اتنا بتادے کہ وہ کس کمرے میں ہے اور ہاں خبردار...... جب ہم اس کے کمرے میں جائیں تو کوئی ہمارے پیچھے نہ آئے سب لوگ اس جگہ سے دور رہیں۔" میں نے کڑک دار لہجے میں کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"بہت بہتر حضور آپ میرے ساتھ تشریف لائیے۔" کلثوم نے کہا اور چلنے لگی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اور کمر کو قدرے جھکا کر کلثوم کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں زیر لب اللہ اکبر کہتا ہوا جارہا تھا کلثوم مجھے مڑ مڑ کر دیکھتی جارہی تھی۔ اس کے جسم پر لرزش کے آثار میں نے واضح طور پر محسوس کیے میں اس کی ذہنی کیفیت کو بھی اچھی طرح سے جانتا تھا آج صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ شہزادی ہسٹیر یا کی مریضہ ہے یا ڈھونگی ہے اگر وہ ہسٹیر یا کی مریضہ تھی تو اس کا علاج بھی میں کر سکتا تھا اور دوائیں بھی اس انداز سے دیتا کہ وہ اسے پیر صاحب کا علاج ہی سمجھتی۔

چلتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ حویلی اندر سے بھی کتنی کشادہ ہے باہر سے تو بہت دفعہ دیکھا تھا لیکن اندر سے آج پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا بڑے بڑے کمرے اور بڑے بڑے دالان......!

ایک کمرے سے ذرا دور کلثوم رک گئی اور اشارہ کر کے بولی۔ "حضور وہ کمرہ ہے شہزادی کا...... آپ چلے جائیں گے یا میں چلوں آپ کے ساتھ۔"

"تم یہیں ٹھہرو اور جب تک ہم باہر نہ آئیں کوئی دوسرا ادھر نہ آئے۔" میں نے گویا حکم صادر کردیا۔

"جی حضور......" کلثوم نے سر جھکا کر جواب دیا تو میں آگے بڑھ گیا میں نے محسوس کیا کہ کلثوم اسی جگہ کھڑی ہے تو میں نے اسے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ وہ وہاں سے چلی جائے میرا اشارہ دیکھ کر کلثوم واپس پلٹ گئی اور میں تیز قدموں سے شہزادی کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

میں اندر داخل ہوا تو لمحوں کے لیے میں مبہوت سا دروازے پر کھڑا رہ گیا شہزادی کی یہ خواب گاہ حقیقت میں کسی شہزادی کی خواب گاہ ہی لگ رہی تھی۔ اور اسم با مسمی شہزادی اپنے طویل وعریض بیڈ پر زلفیں بکھیرے بے سدھ پڑی تھی اور ایک بوڑھی ملازمہ کمرے میں کھڑی خوف زدہ نگاہوں سے شہزادی کو دیکھ رہی تھی۔

"تم باہر جاؤ......!" میں نے اس عورت سے کہا۔

"بہتر حضور!" اس نے کہا اور جان چھوٹ جانے پر شکر ادا کرتے ہوئے تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے ہی لمحے شہزادی نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیں اور بھاری آواز میں بولی۔

"کیوں آیا ہے تو...... میں تجھے جلا کر بھسم کردوں گا...... یہ میری شہزادی ہے کوئی مجھے اس کو چھوڑنے پر مجبور نہیں کرسکتا۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور آگے بڑھ کر کمرے کا بھاری دروازہ بند کردیا۔

"تو کیا کرنا چاہتا ہے......!" شہزادی نے چونک کر کہا۔

"کچھ بھی نہیں......!" میں نے واپس آ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"واپس چلا جا......!" اس نے آنکھیں نکال کر کہا۔

"آنکھیں بند کرلو شہزادی...... مجھے غور سے دیکھو میں شاہ جنات ہوں تم سے پیار کرتا ہوں۔"

"جھوٹ بولتا ہے بڈھے...... دفع ہو جا یہاں سے۔" یہ کہہ کر وہ مجھ پر جھپٹ پڑی۔

میں اس کے اس حملے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا اس لیے فوراً ہی اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ایک ہاتھ میں جکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کو کمر سے پکڑ کر گود میں بٹھا لیا اور اپنے سینے کی جانب کر کے دبا لیا۔

میری اس حرکت پر شہزادی کا جسم کانپنے لگا اور پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں اور وہ بے دم سی ہوگئی۔

میں نے اس کے ہاتھوں کو چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ اس کی ہتھیلیوں کو سہلانے لگا میرے ایسا کرنے سے رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔

میں نے بڑی آہستگی اور نرمی سے اسے بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے کان کے پاس اپنے لب رکھ کر پیار بھری سرگوشیاں کرنے لگا میں ایک آدمی تھا میری آواز اور رومان پرور لہجہ اس کے حواسوں پر چھانے لگا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں اور جسم بالکل ڈھیلا پڑ گیا تھا البتہ سانسوں کا زیر و بم تیز تھا۔

میں اس کے رخسار اس کے لبوں کو اپنی گرم گرم انگلیوں سے سہلانے لگا بند آنکھوں کے ساتھ وہ پگھلنے لگی تو میرے ہاتھوں نے مزید گستاخی کی...... وہ پوری طرح موم ہوگئی۔

اور پھر تھوڑی دیر میں پرسکون ہوگئی...... میں نے اسے چادر اوڑھا دی...... وہ سو چکی تھی میں باہر نکل آیا......

برآمدے سے باہر ذرا ہٹ کر میں نے کلثوم کو بے تابی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا وہی بوڑھی ملازمہ جس کو میں نے شہزادی کے کمرے سے نکالا تھا اس کے قریب کھڑی تھی۔

کلثوم پر نگاہ پڑتے ہی میں نے اپنی رفتار دھیمی کرلی اور کمر کو قدرے جھکا کر آہستہ روی سے چلتا ہوا ان دونوں کے نزدیک پہنچ گیا مجھے دیکھ کر کلثوم رک گئی اور سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگی۔

"اس وقت ہم نے شاہ جنات کو حکم دیا تو وہ چلا گیا ہے لیکن دوبارہ ضرور آئے گا اور اس کے لیے ہمیں دوبارہ آنا ہوگا۔" میں نے بھاری آواز اور لہجے میں کہا۔

"حضور آپ حویلی میں ہی قیام کریں اور اپنی خدمت کا موقع دیں۔" اس نے قدرے مطمئن لہجے میں کہا۔

میں ابھی حویلی میں رکنا نہیں چاہتا تھا اس کی دو وجوہ تھیں ایک تو یہ کہ یہاں شیر افضل نہیں تھا۔ دوسرے مجھے شہزادی کے لیے کچھ انجکشن لانے تھے۔

میں اس کا علاج سمجھ چکا تھا ہسٹیریا کا مرض پوری طرح سے اس پر حاوی نہیں تھا' میرے خیال میں وہ اپنی نفسانی خواہشات کے ہاتھوں پریشان تھی۔

جس طرح وہ میری ڈوز سے مطمئن ہوئی تھی۔ اس سے اس کی ذات کو سمجھنے میں مجھے خاصی مدد ملی تھی۔

"نہیں ہم آج رات یہاں نہیں رک سکتے' آج رات ہمیں شہزادی سے دور رہ کر ایک جلالی وظیفہ کرنا ہے' تاکہ اس خبیث کو جو خود کو شاہ جنات کہتا ہے' قابو کر سکیں۔" میں نے بارعب لہجے میں کہا۔

"اور کوئی خدمت حضور......" اس نے سر جھکا کر پوچھا۔

"ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی' ہماری ہر ضرورت وہ خود ہی پوری کر دیتا ہے۔" میں نے اوپر کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔

"اگر گستاخی ہو گئی ہو تو میں معافی چاہتی ہوں۔" اس نے میرے رعب میں آتے ہوئے کہا۔

"ہمیں تم سے دلی ہمدردی ہے تم مطمئن رہو۔ شہزادی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

پھر میں راکھی کے ساتھ واپس چل دیا' راستے میں میں نے فہیم کو میسج کر دیا اور وہ اپنی ٹیکسی لے کر طے شدہ راستے پر آ گیا۔ پھر ہم فہیم کے گھر واپس آ گئے۔

گھر پہنچ کر میں نے ایک کاغذ پر فہیم کو ضروری انجکشن لکھ کر دیئے تاکہ وہ فٹافٹ لے کر آ جائے میں نے اور بھی ضروری چیزیں منگوائیں۔ فہیم نے وہ ساری چیزیں ایک گھنٹے میں مجھے فراہم کر دیں۔

اب میں پوری طرح مطمئن تھا اور اپنی پلاننگ پر باآسانی عمل کر سکتا تھا' ساتھ ہی ساتھ میں اپنے میک اپ کا بھی جائزہ لے رہا تھا اور میک اپ مین نے جو چیزیں مجھے دی تھیں۔ لوشن وغیرہ میں مستقل استعمال کر رہا تھا۔ خاص طور پر ہاتھوں پر' کیونکہ ہاتھ تو مجھے لازمی دھونے ہی پڑتے تھے' لوشن میرے چوغے کی لمبی جیب میں ہر وقت موجود رہتا تھا۔ چہرے کا میک اپ پائیدار تھا' وہ آسانی سے اترنے والا نہیں تھا' اس کے اتارنے کا لوشن بھی میرے پاس محفوظ تھا کہ اگر مجھے فوری طور پر وہاں سے غائب ہونا پڑا تو میں اپنا میک اپ اتار کر دوسری شکل اختیار کر سکتا تھا۔

میں نے رات فہیم کے گھر پر گزاری' اپنے مکان کے بارے میں میں بعد میں سوچنے والا تھا' پہلے ایک کام سے نمٹ جاؤں پھر اس کے بارے میں سوچنا تھا' اس رات راکھی میرے پیچھے ہی پڑ گئی اور مجھے اس کی خواہش کو پورا کرنا ہی پڑا۔

"خوش ہونے کے بعد وہ مجھ سے باتیں کرنے لگی اور باتوں باتوں ہی میں مجھے اس نے ایک اہم بات بتائی اور وہ یہ کہ مجھ سے پہلے ولاور نامی ایک شخص نواب کا بہت قریبی تھا' مگر جب سے نواب نے مجھے اپنے قریب کیا ہے وہ شخص مجھ سے بہت خار کھانے لگا ہے' کیونکہ میرے آنے کے بعد اس کی اہمیت نواب کی نگاہوں میں وہ نہیں رہی ہے جو میری ہے یا اس کی پہلے تھی۔

"لیکن وہ کون ہے؟ میں نے اسے پہلے تو نہیں دیکھا۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"وہ اب نواب صاحب کی حویلی میں چلا گیا ہے' نواب صاحب نے اسے شہر سے واپس حویلی پہنچا دیا ہے' اب وہ وہاں کے کام دیکھتا ہے۔" راکھی نے بتایا۔

"حویلی ......! نواب صاحب کی حویلی کہاں ہے؟" میں نے مزید حیران ہو کر پوچھا۔

"پنجاب کا ایک گاؤں ہے' وہیں ان کی حویلی ہے' وہ ساری زمینیں نواب صاحب کی ہی ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی بہت زمینیں اور مختلف کاروبار ہیں۔" راکھی نے بتایا۔

"اچھا راکھی ایک بات تو بتاؤ' مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس بارے میں کچھ جانتی ہو گی تو مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کرو گی' کیونکہ اب ہم بہت اچھے دوست ہیں۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے مصنوعی پیار بگھارتے ہوئے اس کا ہاتھ' اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو کہ ہم اچھے دوست بن گئے ہیں۔" اس نے بے یقینی سے میری جانب دیکھا۔

"تم کو یقین کیوں نہیں ہے۔" میں نے پوچھا۔

"یقین اور اعتماد کرنے میں وقت لگتا ہے میری جان......!" وہ ایک بار پھر بری طرح بہکنے لگی۔ میں نے جوابی طور پر ایک دو منٹ مزید اس کی تسلی کی اور اسے نرمی سے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا۔

"اگر ایسی بات ہے تو تم جتنا چاہو وقت اس کام کے لیے لے سکتی ہو' اور بھول جاؤ کہ میں نے تم سے کچھ کہا ہے' لیکن صرف اتنا یاد رکھنا کہ شمروز اپنی زبان اور قول کا پکا ہے' وہ خود کو مرد کہتا ہے تو مرد بن کر دکھاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم تو برا مان گئے' میرا یہ مطلب نہیں تھا لیکن جن حالات میں' میں نے اپنا یہ وقت نواب کے ساتھ گزارا ہے' تم سے بیان نہیں کر سکتی' اس بڈھے نے مجھے اس وقت تک اپنے قریب رکھا جب تک اس کا مجھ سے دل نہیں بھر گیا اور پھر اس کے بعد ایک عضو معطل کی طرح میں اس کی اس کوٹھی میں قید ہوں۔ نہ کہیں آ سکتی ہوں' نہ جا سکتی ہوں۔ یہاں قدم قدم پر پہرے اور پابندیاں ہیں۔ یہاں ہر شخص کا ایک نگران ہے' مگر کون کس کا نگران ہے' یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا' میں کس کی نگرانی کرتی ہوں' یہ مجھے معلوم ہے' لیکن میری نگرانی کون کر رہا ہے یہ مجھے معلوم نہیں ہے' فہیم جیسے تم شاید کوئی سیدھا سادا انسان سمجھ رہے ہو' یہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے جیسا دکھائی دیتا ہے' اس نواب کے ہاتھ بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ کہاں کہاں تک اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی شخصیت کے سارے روپ تو میرے سامنے بھی نہیں ہیں' میں بس تھوڑا بہت معلوم کر سکی ہوں۔ وہی مجھے معلوم ہے' اصل میں اس کے ساتھ انسانی طاقت ہے' یہ عام لوگوں کے لیے روحانی پیشواء ہے' اس کے عقیدت مند ہیں' انہیں یہ نہیں معلوم کہ یہ کتنا بڑا شیطان ہے' بڑے سے بڑا سیاسی لیڈر اور بڑی سے بڑی سیاسی جماعت یہ چاہتی ہے کہ یہ اس میں شمولیت اختیار کر لے لیکن اس کو اپنی اہمیت کا بہت اچھی طرح سے اندازہ ہے' یہ سب کے ساتھ اس طرح رہتا ہے جیسے سب کا دوست ہے' لیکن حقیقت میں یہ کسی کا دوست نہیں ہے' بس جہاں مطلب ہوتا ہے وہیں جھک جاتا ہے۔

اس کی آبائی حویلی میں اس کی بیویاں رہتی ہیں لیکن اس کی اولاد میں صرف دو بیٹیاں ہیں۔ بیٹا ہو جائے اس چکر میں اس نے کئی شادیاں کیں لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی ہے۔ یہ اپنی جن بیویوں کو طلاق دے دیتا ہے' وہ بھی اس کی حویلی سے باہر نہیں جا سکتیں۔ سنا ہے تمہارے مذہب میں ایک آدمی ایک وقت میں صرف چار بیویاں رکھ سکتا ہے' اس لیے یہ جب نئی شادی کرتا ہے تو ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہے' صرف ایک بیوی جو سب سے پہلی ہے' وہ ابھی تک باقی ہے' اور اس سے ہی اس کی دو بیٹیاں ہیں دونوں کی شادیاں کر چکا ہے۔ میں یہاں اس کوٹھی میں لائی گئی تھی اس لیے یہیں رہتی ہوں اس نے مجھ سے نکاح اس لیے نہیں کیا کیونکہ میں ہندو ہوں۔

میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی' راتوں کی تنہائی نے مجھے دیوانہ بنا ڈالا تھا' اس کوٹھی میں تو میں دن

رات تڑپتی رہتی تھی' کوئی میرا دوست نہیں ہے' تمہیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے میری اندھیری زندگی میں کوئی چراغ جل اٹھا ہو' میں دن رات بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگی کہ مجھے تم سے ملنے کا موقع مل جائے اور دیکھو میرے بھگوان نے میری پرارتھنا سن لی اور نواب نے مجھے خود ہی تمہارے ساتھ بھیج دیا' اگر تم میرے ساتھ فیئر رہو گے تو میں قدم قدم پر تمہارا ساتھ دوں گی۔ جہاں تک ممکن ہوسکا تمہاری مدد کروں گی' تمہیں مشکلات سے بچاؤں گی' کیونکہ میرے علم میں بہت کچھ ہے' میری زبان بند ہے' لیکن کان اور آنکھیں کھلی ہیں۔"

بہت کچھ کہنے کے بعد وہ خاموش ہوئی تو میں بھی خاموش رہ کر سوچوں میں گم ہوگیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ راکھی نے کس حد تک سچ بولا ہے' کیا واقعی یہ نواب سے تنگ آچکی ہے یا نواب کی ٹاوٹ بن کر میرا امتحان لے رہی ہے۔

"کیا سوچنے لگے شمروز؟" راکھی نے پوچھا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب میں تم پر کس حد تک یقین کروں۔ آیا کہ واقعی تم نواب کی قید میں ہو اور پریشان بھی...... یا پھر مجھے آزما رہی ہو کہ میں نواب کا کس حد تک وفادار ہوں۔" میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر وہ مسکرانے لگی۔ "کیا ہوا؟ مسکرا کیوں رہی ہو؟" میں نے اس کی مسکراہٹ پر تپ کر کہا۔

"میں اس لیے مسکرا رہی ہوں کہ تم میری بات مجھ پر ہی الٹ رہے ہو۔" اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس میں بات الٹانے کی کیا بات ہے' تم نے بھی میری ذات پر عدم اعتماد کا اظہار کیا تو ظاہری بات ہے میں تم پر کس لیے اعتماد کرلوں۔" میں نے سابقہ لہجے میں کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو' اچھا تو پھر چلو پرانی باتوں کو چھوڑو' آؤ نئے سرے سے ایک نئی دوستی کا آغاز کرتے ہیں۔ آج سے ہم یہ عہد کریں کہ چاہے ہماری جانیں چلی جائیں ہم ایک دوسرے کو کبھی دھوکہ نہیں دیں گے' جو کام جو بھی بات کریں گے' وہ پورے خلوص کے ساتھ کریں گے۔" اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ڈن!" میں نے اس کا ہاتھ تھام کر پرجوش لہجے میں کہا تو وہ ایک بار پھر بے قابو ہو کر میرے سینے سے لپٹ گئی۔

وہ ایک بھرپور اور پرجوش عورت تھی اور ایسی پرجوش عورت مجھے تو کیا کسی بھی مرد کو اپنا دیوانہ بنا سکتی ہے' مجھے نواب پر حیرت ہو رہی تھی کہ اس کا اس سے دل کیسے بھر گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ خود علیحدہ ہوئی تو میں نے کہا۔

"تم نے ابھی خود کہا ہے کہ ہم دوست ہیں' تو پھر مجھے بتاؤ کہ یہ غضنفر کون ہے......؟"

☆☆☆☆

میرا نام سرمئی ہے' میری ماں نے یہ نام رکھنے کی وجہ مجھے یہ بتائی تھی کہ میں ایک سرمئی شام میں پیدا ہوئی تھی۔

"لو بھئی یہ کیا بات ہوئی اگر کوئی برستی بارش میں پیدا ہوگا تو کیا اس کا نام برسات یا پھر بارش رکھ دیں گے۔" میں ہمیشہ اپنی ماں کے جواب میں کہتی اور پھر جواباً وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہوجاتی۔

اپنے باپ کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جب ماں سے اس کے بارے میں سوال کرتی تو وہ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہوجاتی کہ اس کا انتقال اس وقت

ہوگیا تھا جب میں ایک ماہ کی تھی۔

"لیکن وہ کون تھا؟ کیسا تھا؟ کہاں رہتا تھا؟ اس کے رشتے دار تو ہوں گے' اس کی کوئی تصویر تو ہوگی۔ مجھے کچھ تو پتا چلے اپنے باپ کے بارے میں......"

میں نے بار بار اپنی ماں سے باپ کے بارے میں سوالات کیے لیکن ماں نے کبھی میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں اس کے آگے روئی' چیخی چلائی لیکن یہ سب حربے پتھر سے سر پھوڑنے کے مترادف ہوتے' ماں نے کبھی بھی باپ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتایا۔ بس یہ کہتی رہی وہ مرگیا تو مرگیا' اب گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ۔ ایک دن بہت تنگ آکر میں نے ماں سے کہہ دیا۔

"ماں تم مجھے میرے باپ کے بارے میں کبھی بھی کچھ نہیں بتاتی ہو' کہیں ایسا تو نہیں کہ میں کسی کی ناجائز اولاد ہوں۔ تمہیں کسی نے پیار کے نام پر دھوکہ دے دیا ہو اور پھر اپنی نشانی تمہاری کوکھ میں چھوڑ کر رفو چکر ہوگیا ہو۔"

میری اتنی تلخ بات کے جواب میں' ماں کا ایک زبردست تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔

"چپ ہوجا......!" ماں نے روتے ہوئے چیخ کر کہا اور اپنی ساڑھی کے پلو سے منہ چھپا کر رو پڑی۔

"اگر ایسی بات نہیں ہے تو پھر نہ تمہارا اور نہ ہی میرے نام نہاد باپ کا کوئی رشتہ دار کیوں نہیں ہے' اگر میرا باپ مرگیا تھا تو تمہارے اور اس کے گھر والوں نے تمہیں تنہا کیوں چھوڑ دیا اور ہمارے گھر کے یہ بھاری اخراجات کون پورے کرتا ہے۔" میں نے بھی جواباً روتے ہوئے چیخ کر ماں سے پوچھا۔

"اخراجات کے بارے میں بتایا تو ہے کہ تیرے باپ کی کچھ دکانیں ہیں' جن کی آمدنی آتی ہے۔" ماں نے کہا۔

اور پھر میں روٹھی روٹھی غیر مطمئن انداز میں ماں کو شکی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ سوچ سوچ کر میرا دماغ شل ہوگیا تھا، میں جب تک چھوٹی اور ناسمجھ تھی ماں کی باتوں سے بہل جاتی، لیکن اب میں بچی نہیں رہی تھی، جوان ہوچکی تھی، ہر بات سوچ اور سمجھ سکتی تھی۔ اس لیے ماں کی باتوں سے بہلتی نہیں تھی، بلکہ اس سے اپنے باپ کے بارے میں مسلسل سوالات کرتی رہتی تھی اور ماں وہ کبھی بھی مجھے کوئی اطمینان بخش جواب نہ دے پاتی اور ہماری بحث کا انجام یہ ہوتا کہ میں روٹھ کر اپنے کمرے میں بند ہوجاتی، کھانا نہیں کھاتی ماں مسلسل میرا دروازہ کھٹکھٹاتی رہتی اور روتی رہتی، میں پھر تھک ہار کر دروازہ کھول دیتی اور رو رو کر نڈھال ہوجانے والی کو اندر لے آتی۔ اور اسے پانی پلاتی اور خود بھی کھانا کھاتی اور اسے بھی کھلاتی۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، اس گھر میں اپنے علاوہ کسی اپنے کو ماں کے روپ میں دیکھا تھا ہم دونوں ماں بیٹی کے علاوہ دو سو گز کے دو منزلہ اس گھر میں دو نوکروں کو اور دیکھا تھا، ایک اماں حمیدہ تھیں جو صبح سے لے کر رات تک گھر کے سارے کام سنبھالتیں۔ دوسرا فرد شمسو بابا تھے۔ جو باہر کے سارے کام انجام دیتے تھے، وہ دونوں میاں بیوی تھے، میں نے انہیں بھی کہیں آتے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، نہ ان سے کوئی ملنے کے لیے آتا تھا، لگتا تھا جس طرح ہم دنیا میں تنہا ہیں اسی طرح ان کا بھی کوئی نہیں ہے۔

اماں حمیدہ گھر کے سارے کام کرتیں اور امی صرف مجھے سنبھالتیں۔ وہ مجھ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں، پل بھر کے لیے بھی مجھے خود سے جدا نہیں کرتی تھیں، میرے لیے نہ جانے کتنی راتیں انہوں نے جاگ کر گزاریں، رات رات بھر مجھے کندھے سے لگائے ٹہلتی رہتیں۔

اماں حمیدہ اور شمسو بابا امی کو بے جی کہہ کر بلاتے تھے، امی کو میں نے کبھی بناؤ سنگھار کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ بہت خوب صورت تھیں اور ایک عجیب سے حزن و ملال ہمیشہ ان کی آنکھوں میں مجھے دکھائی دیتا تھا۔

بعض اوقات میں اپنی اور امی کی شکلوں کا موازنہ کرتی...... امی اتنی عمر ہونے کے باوجود انتہائی حسین تھیں، میدہ جیسی رنگت، بڑی بڑی جھیل جیسی آنکھیں، ستواں ناک اور خوب صورت ہونٹ، ان کے بال بھی لمبے تھے۔ جبکہ ان کے برعکس میں کوئی حسین شکل وصورت کی مالک نہیں تھی۔ میری رنگت سانولی تھی، نقش بھی واجبی سے تھے، غرض کہ میں امی سے بالکل بھی نہیں ملتی تھی۔

کبھی میں لاڈ میں امی کی گود میں لیٹتی تو کہتی۔

''امی لگتا ہے کہ میں اپنے ابا پر گئی ہوں۔ کیونکہ میری شکل آپ سے تو قطعی نہیں ملتی'' تو وہ جھٹ کہتیں۔

''نہیں میری جان تم بالکل اپنی ماں کی طرح ہو۔''

''یہ تو آپ صرف پیار میں کہہ رہی ہیں یہ تو اندھا بھی کہہ دے کہ میری اور آپ کی شکلوں میں بہت فرق ہے۔'' میں مصنوعی خفگی سے کہتی تو وہ مسکرانے لگتیں۔

امی نے شہر کے بہترین اسکول میں میرا ایڈمیشن کروایا تھا، مجھے گھر پر پڑھانے کے لیے ایک بوڑھے سے ٹیچر گھر پر آتے تھے، اسی لیے میں ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتی، ذہن شروع سے ہی بہت اچھا تھا۔

میں نے میٹرک میں سارے بورڈ میں دوسری پوزیشن لی تھی اور پہلی مرتبہ امی نے میری کلاس فیلوز کو گھر پر بلا کر کھانا کھلایا تھا۔ اخباری نمائندے میرا انٹرویو کرنے کے لیے آئے تو اماں نے اس شرط پر اجازت دی کہ میری تصویر اخبار میں نہیں چھپے گی۔

میں نے اس بات پر بھی احتجاج کیا تو امی نے کہا۔

''میں نہیں چاہتی کہ لوگ تمہیں دیکھیں اور تمہیں نظر لگے۔'' میں تھک کر خاموش ہوگئی۔

امی نے مجھے اس بات کی اجازت نہیں دی تھی کہ میں کالج میں زیادہ دوستیاں پالوں۔ روزانہ صبح مجھے شمسو بابا کالج چھوڑنے جاتے اور واپسی میں وہی لے کر آتے تھے۔ کالج میں میری کئی لڑکیوں سے دوستی ہوگئی، لیکن امی مجھے مسلسل منع کرتی رہیں کہ تم کسی لڑکی سے دوستی مت کرو۔ ''یہ دوستیاں اچھی نہیں ہوتیں۔''

میرے کالج میں لڑکے بھی پڑھتے تھے لیکن لڑکوں سے میں ہمیشہ علیحدہ ہی رہی، امی تو میری لڑکیوں سے ہی دوستی کو پسند نہیں کرتی تھیں، اگر میں نے لڑکوں سے بات کی اور انہیں پتا چلا تو وہ بہت ناراض ہوں گی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کالج میں میں ہر وقت ڈری ڈری اور سہمی سہمی سی رہنے لگی، بہت سی لڑکیاں اور لڑکے اس وقت میرا خوب مذاق اڑاتے جب کوئی لڑکا مجھ سے بات کرتا اور میں بری طرح گھبرا جاتی، اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے ہکلا جاتی۔ پسینے سے شرابور ہوجاتی۔

ان دنوں میں گھر میں بہت خاموش رہا کرتی تھی، مجھے ان لڑکیوں پر بڑا رشک آتا تھا جو بڑے اعتماد سے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں سے بات چیت کرلیا کرتی تھیں۔ پھر میں ایسی کیوں ہوگئی ہوں۔ میں بار بار سوچتی۔

امی میری اس کیفیت کو دیکھتی رہتیں پھر ایک دن جب کہ میں گم صم اپنی سوچوں میں گم بیٹھی تھی تو وہ پیار سے میرے نزدیک آئیں اور بولیں۔

''میری جان کیا بات ہے میں بہت دنوں سے تمہیں گم صم دیکھ رہی ہوں، تم ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھاتیں۔ ہر وقت ڈری اور سہمی سی رہتی ہو۔ تمہارے کالج میں لڑکے بھی ہیں تو کیا کسی لڑکے نے تم سے ایسی کوئی بات کہہ دی ہے جو تمہارے لیے پریشانی کا باعث ہے۔''

''نہیں امی......!'' میں امی کا سوال سن کر چونک پڑی اور تیزی سے جواب دیا۔

''پھر کیا بات ہے میری جان...... تم اپنی امی کو نہیں بتاؤ گی۔'' انہوں نے محبت سے میرے بالوں کو سنوارا اور میرے یخ اور لرزتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر بولیں۔

''امی نہ جانے کیا بات ہے کہ جب کوئی لڑکا مجھ سے کالج میں بات کرنے کی کوشش کرتا ہے تو میں بری طرح سے گھبرا جاتی ہوں، زبان ہکلانے لگتی ہے اور جسم پسینے سے شرابور ہوجاتا ہے۔ جب کہ دوسری لڑکیاں بڑے مزے سے لڑکوں سے بات چیت کرلی ہیں ان کے ساتھ گھومتی پھرتی ہیں پھر میں کیوں نہیں......؟ امی مجھے اس طرح سے دیکھ کر سارے لڑکے اور لڑکیاں مجھ پر ہنستی ہیں۔ طرح طرح کے جملے کستی ہیں۔ پھر مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز اور آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ کہا۔

''شاید تمہارے ساتھ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ میں نے تمہیں ہمیشہ اس صنف سے دور رکھا ہے، اب تم بچی نہیں رہی ہو، جوان ہوگئی ہو، اب تو ان سے دور رہنے کی تمہیں زیادہ ضرورت ہے اور تمہیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ تم ان سے بات چیت کرو، کالج میں تم تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتی ہو، لیکچر لو اور واپس آجاؤ۔'' امی نے کہا۔

''کالج سب ہی لڑکے اور لڑکیاں تعلیم حاصل کرنے کے لیے جاتے ہیں لیکن وہ میری طرح تو

نہیں ہیں۔ میں ان سب سے الگ کیوں ہوں ...... یہ نارمل نہیں ہے امی ...... میں بھی بولڈ بننا چاہتی ہوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"میں تمہیں کس طرح سے سمجھاؤں کہ مرد ذات کیا چیز ہوتی ہے' عورت ان کے لیے صرف ایک دل بہلانے والا کھلونا ہی ہوتی ہے' کبھی ان کی چکنی چپڑی محبت بھری باتوں میں نہیں آنا چاہیے۔ ان کا ساتھ صرف چار دن کی چاندنی ہوتا ہے' بس پھر ہمیشہ کے لیے اندھیری رات عورت کا مقدر بن جاتی ہے۔" امی نے دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"امی کیا ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے......؟" میں نے سوال کیا۔

"ہاں!" امی نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ ہر مرد برا ہوتا ہے؟" میں نے تیزی سے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے امی کی آنکھوں میں براہ راست دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس ایسے ہی ہوتے ہیں سارے مرد!" امی نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا اور اٹھ کر جانے لگیں تب میں نے تیزی سے ان کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

"کیا آپ کی زندگی میں بھی ایسا ہی برا کوئی مرد آیا تھا......؟" میں نے سوال کیا۔

"توبہ ہے سرمئی تم ایک تو سوال بہت کرتی ہو' چھوڑو مجھے جانے دو۔ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔" امی نے ایک بار پھر میرے سوالوں سے کترا کر نکل جانا چاہا۔

"امی ہمارا یہ معاشرہ عورت اور مرد کے وجود سے مل کر بنا ہے' یہاں نہ کوئی مرد تنہا زندگی گزار سکتا ہے اور نہ ہی کوئی عورت...... کیونکہ انسانی آبادی میں اضافے کے لیے عورت اور مرد کا یکجا ہونا ضروری ہے' مرد اور عورت مل کر ایک گھر کی بنیاد رکھتے ہیں۔ پھر ان سے مزید انسان پیدا ہوتے ہیں' پھر مزید جوڑے بنتے ہیں۔ یہ دنیا اسی طرح قائم ہے' ابد سے یہی نظام چلا آرہا ہے' اگر سارے مرد برے ہوتے تو یہ دنیا کس طرح قائم رہ سکتی تھی۔ گھر کس طرح آباد ہوتے ایک معاشرہ کیسے بنتا......؟" میں نے اپنے سبجیکٹ سوکس میں پڑھے ہوئے ایک مضمون میں لکھے جملے ذہن میں لاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ سب باتیں کس نے سکھائیں؟" امی نے میری باتیں سن کر حیرت سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"میں کتابیں پڑھتی ہوں امی اور انہی سے مجھے یہ سب پتا چلا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو جاؤ لڑکوں سے خوب دوستیاں کرو پھر جو انجام ہو مجھ سے کچھ مت کہنا۔" امی نے تپ کر کہا۔

"یہی تو مجھ سے نہیں ہوتا......!" میں نے پھر بے بسی سے کہا۔ چند لمحوں تک ہمارے درمیان گھمبیر خاموشی چھائی رہی پھر میں نے کہا۔

"آپ نے ہمیشہ مجھے غلط گائیڈ کیا ہے' مرد کی ذات کو آپ نے میرے اندر ایسا ہوا بنا کر پیش کیا کہ میری ساری خود اعتمادی کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ آپ مجھے یہ بھی تو سکھا سکتی تھیں کہ انسانوں کے اس جنگل میں مردوں اور عورتوں کی بہت سی قسمیں ہیں' اگر مرد برے ہوں گے تو کچھ عورتیں بھی بری ہوں گی۔ آپ نے مجھے تصویر کا صرف ایک ہی رخ کیوں دکھایا' آج میں یہ بات پورے دعوے اور وثوق سے کہہ سکتی ہوں امی کہ آپ ضرور کسی سفاک مرد کی زیادتی اور بے حسی کا شکار ہوئی ہیں جس کا نتیجہ میری صورت میں ظاہر ہوا ہے۔" میں نے تیز اور سخت لہجے میں کہا تو امی میری جانب پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگیں۔ ان کی بڑی بڑی آنکھیں ڈھیروں نمکین پانی سے بھر گئیں۔ ان میں گہرا سا کر چھلک رہا تھا۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو' میں تمہاری تربیت بہتر طریقے سے نہ کر سکی' مجھے معاف کر دینا' شاید میں نے تمہاری شخصیت کو تباہ کر دیا ہے' مجھے تو تمہیں بہت اسٹرانگ اور مضبوط عورت بنانا چاہیے تھا' تاکہ مردوں کے اس معاشرے میں تم ایک مضبوط عورت بن کر سامنے آتیں لیکن میں ڈر گئی تھی ...... میں ڈر گئی تھی میری بچی......!" انہوں نے بہتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا اور اٹھ کر تیزی سے چلی گئیں۔

میں انہیں روکتی رہ گئی لیکن وہ رکی نہیں اور خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ میں' اماں حمیدہ اور شمسو بابا دروازہ پیٹتے رہے مگر انہوں نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں رات بھر ان کے بند دروازے کے آگے روتی بلکتی رہی' ان سے معافیاں مانگتی رہی' لیکن انہوں نے تو جیسے میری آہ و فغاں کو نہ سننے کے لیے اپنے کان بند کر لیے تھے' میں ان کے بند دروازے سے ٹیک لگا کر سوگئی۔

میری آنکھ کھلی تو امی مجھے بستر پر لٹا رہی تھیں' میں گہری نیند میں تھی' اس لیے کسمسا کر دوبارہ سوگئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو امی میرے نزدیک بستر پر لیٹی تھیں۔ انہوں نے چادر سر تک تان رکھی تھی۔ امی کو دیکھا تو مجھے رات کی ساری باتیں یاد آگئیں اور میں تیزی سے امی کی جانب بڑھی' اور "امی" کہہ کر بے ساختہ تیزی سے ان کے منہ سے چادر کھینچ لی۔

امی کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل ساکت لیٹی تھیں۔ میں نے گھبرا کر ان کو جھنجھوڑ ڈالا' مگر انہوں نے آنکھیں نہیں کھولیں۔

"امی...... امی...... آنکھیں کھولیں...... امی اٹھیں پلیز......!" میں چیخ چیخ کر آوازیں دیتی رہی' لیکن امی میری ان آوازوں کی پہنچ سے بہت دور جا چکی تھیں۔

بدترین عذاب

حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ یہ امت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے دست حفاظت کے تحت رہے گی اور اس کی پناہ میں رہے گی جب تک اس امت کے عالم اور قاری حکمرانوں کی ہاں میں ہاں نہیں ملائیں گے اور امت کے نیک لوگ بدکاروں کی صفائی نہیں پیش کریں گے اور جب تک امت کے اچھے لوگ (اپنے مفاد کی خاطر) برے لوگوں کو امیدیں نہیں دلائیں گے لیکن جب وہ ایسا کرنے لگیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے سروں سے اپنا ہاتھ اٹھا لے گا پھر ان کے جبار و قہار اور سرکش لوگوں کو ان پر مسلط کر دے گا۔ جو ان کو بدترین عذاب کا مزہ چکھائیں گے اور ان کو فقر و فاقہ میں مبتلا کر دے گا اور ان کے دلوں کو دشمنوں کے رعب سے بھر دے گا۔

کتاب الرقائق لابن المبارک ص۔ 282

(صبا پرویز' سرگودھا)

میری چیخیں سن کر اماں حمیدہ اور شمسو بابا دوڑے چلے آئے' انہیں دیکھ کر میں نے ایک چیخ ماری۔ "میری امی چلی گئیں۔" اور میں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

مجھے ہوش آیا تو میری امی کی آخری آرام گاہ کی جانب تیاریاں مکمل تھیں۔ میں نے اماں حمیدہ کو دیکھا میرا سر ان کی گود میں تھا۔ شمسو بابا بھی افسردہ بیٹھے تھے۔

امی کی تجہیز و تکفین کا انتظام ایک ادارے کے سپرد کر دیا گیا تھا' مجھے امی کا آخری دیدار کروایا گیا اور امی کو لے کر چلے گئے' بہت تھوڑے سے لوگ تھے' میں اماں حمیدہ کے گلے لگ کر ایک بار پھر روتے روتے بے ہوش ہوگئی۔

دوبارہ ہوش آیا تو میں گھر پر تھی۔ اماں حمیدہ اور شمسو بابا میرے پاس بیٹھے تھے' ہم امی کی باتیں کرتے رہے پھر امی کے ایصال ثواب کے لیے میں قرآن پڑھنے کے لیے بیٹھ گئی۔ جس ادارے نے

امی کی آخری رسوم ادا کی تھیں وہ بے سہارا خواتین اور بچوں کے تحفظ اور کفالت کا ادارہ تھا' میں اماں حمیدہ کے ساتھ وہاں گئی اور امی کے لیے قرآن خوانی کروائی' اور کھانا تقسیم کیا۔

وہ دن میری زندگی کے بہت کٹھن اور تکلیف دہ دن تھے' ہر وقت امی کی یاد آتی رہتی تھی۔ بہت یاد آتی تو میں رو لیتی پھر قرآن پڑھنے بیٹھ جاتی' میری کوئی دوست کوئی رشتہ دار نہیں تھا جو ان دکھوں کے لمحات کو میرے ساتھ شیئر کرتا' صرف ایک اماں حمیدہ اور شمسو بابا کی ذات تھی جو میرا غم بانٹتی تھی۔

کالج بھی جانا نہیں ہو رہا تھا۔ اب میں اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی تھی۔ میں نے اپنے بارے میں بہت سوچا' کہ میری زندگی کیسے گزرے گی' اس کے علاوہ گھر کے اخراجات کے لیے مجھے رقم کی ضرورت تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ امی پیسے کہاں رکھتی تھیں' اور ان کے پاس رقم کہاں سے آتی ہے۔

میں کیا کرتی...... کس سے یہ سب باتیں پوچھتی' اچانک مجھے اماں حمیدہ اور شمسو بابا کا خیال آیا' اور میں نے سوچا کہ مجھے ان لوگوں سے معلوم کرنا چاہیے' انہیں تو میں نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر میں دیکھا ہے' ان سے کچھ پوچھتی ہوں شاید انہیں امی کے ماضی اور ان سب باتوں کے بارے میں معلوم ہو۔

لیکن......! اس سے پہلے میں نے سوچا کہ امی کی الماری کا جائزہ لیتی ہوں۔ امی کی زندگی میں' میں نے کبھی ان کی الماریوں کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

میں نے امی کا بند کمرہ کھولا' سارے کمرے میں امی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ انہیں موتیا کے پھول کی خوشبو بہت پسند تھی' پھول وہ نہیں پہنتی تھیں' البتہ وہ سنگھار (جو وہ واحد کرتی تھیں) کے طور پر موتیے کا عطر لگایا کرتی تھیں۔

اس خوشبو کو محسوس کر کے ایک بار پھر امی کی یاد شدت سے آئی اور میں رونے لگی' ان کے کمرے کی ایک ایک چیز کو چھو کر ان کے وجود کا احساس کرنے لگی۔

کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد میں پرسکون سی ہوگئی' دل کا بوجھل پن کم ہوگیا' تب میں نے ان کی الماری کھولی' سامنے ہی نوٹوں کی ڈھیر ساری گڈیاں دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔

میں نے ساری الماری کا جائزہ لیا۔ ساری درازیں کھول کر دیکھیں۔ کچھ پرانے البم تھے' جن میں میرے بچپن اور امی کی جوانی کی تصاویر تھیں۔ میں ایک خوش گوار حیرت سے وہ البم دیکھنے لگی۔ امی انتہائی حسین وجمیل تھیں۔

ایک دراز رہ گئی تھی۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی تو وہ نہیں کھلی۔ وہ لاک تھی۔ میں نے تمام چابیاں لگا کر دیکھ لیں لیکن کوئی چابی اس میں نہیں لگی' تب میں الماری بند کر کے خاموشی سے کمرے سے باہر آ گئی اور اماں حمیدہ اور شمسو بابا کو بلایا۔

"ابھی میں آپ کے پاس ہی آ رہا تھا' آپ کی ایک امانت بی جی نے میرے حوالے کی تھی' اور کہا تھا کہ میرے مرنے کے بعد یہ سرمئی کو دے دینا۔ اتفاق دیکھیے کہ انہوں نے اپنے مرنے سے ایک دن قبل وہ امانت میرے سپرد کی تھی پھر اچانک ہی ان کی موت کی وجہ سے میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی' ابھی اچانک خیال آیا تو میں آپ ہی کی طرف آ رہا تھا۔" شمسو بابا نے آتے ہی کہا۔

"کون سی امانت......؟" میں نے حیرت سے ان کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔

"آپ کی امانت یہ ایک چابی ہے میرے پاس......!" شمسو بابا نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چابی نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ چابی کس کی ہے' صرف اتنا کہا تھا کہ شمسو بابا آپ اس چابی کو سنبھال کر رکھ لیں۔ اگر میری موت ہو جاتی ہے تو یہ چابی سرمئی کے حوالے کر دیجیے گا' اسے اپنے ان تمام سوالوں کے جوابات مل جائیں گے جو وہ زندگی بھر مجھ سے کرتی رہی اور ان کے جوابات دینے کی میرے اندر ہمت نہیں ہے۔"

میں نے جھٹ شمسو بابا کے ہاتھ سے وہ چابی لے لی۔ میں سمجھ گئی کہ یہ چابی امی کی الماری کی اس لاک دراز کی ہے' جس کی چابی امی کی الماری کی چابیوں کے گچھے میں نہیں تھی۔

"شمسو بابا کیا آپ میرے ابو کے بارے میں جانتے ہیں کہ وہ کون تھے؟ کیا آپ نے انہیں دیکھا ہے؟ کیا آپ امی کے ماضی کے بارے میں جانتے ہیں۔ اگر آپ یہ سب جانتے ہیں تو پلیز مجھے اب تو وہ سب کچھ بتا دیجیے۔ میں اب اور برداشت نہیں کر سکتی۔" میں نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"بیٹی میں تمہاری امی کے ماضی کے بارے میں تو جانتا ہوں' لیکن اپنی زبان نہیں کھول سکتا۔ کیونکہ انہوں نے مجھے قسم دی تھی کہ میں تمہیں اس بارے میں کبھی کچھ نہ بتاؤں۔ البتہ تمہارے والد کے بارے میں' میں بھی کچھ نہیں جانتا۔" شمسو بابا نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"امی کا ماضی آخر ایسا کیا تھا جو وہ مجھ سے چھپانا چاہتی تھیں۔" میں نے پوچھا' جواب میں شمسو بابا نے سر جھکا لیا' تو میں چابی لے کر امی کے کمرے میں دوبارہ آ گئی اور اس چابی سے بند دراز کھول لی۔

وہ چابی اسی دراز کی تھی' میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دراز کو کھینچ کر باہر نکالا' میں بہت ایکسائیٹڈ ہو رہی تھی' آج بہت سے رازوں سے پردہ اٹھنے والا تھا' وہ راز جن کے افشا ہونے کی میں نے بہت کوشش کی' آج امی نہیں رہی ہیں تو وہ سارے راز خود بخود کھلنے والے تھے۔

میں نے کھلی ہوئی دراز پر نگاہ ڈالی' اندر ایک سرخ رنگ کی جلد کی بڑی سی ڈائری رکھی تھی' جس پر بڑا بڑا "سرمئی بائی" لکھا تھا۔

میں یہ نام پڑھ کر بری طرح چونک گئی' اس ڈائری کے علاوہ یہاں پتھر کا ایک خاص ڈیزائن کا تعویز اور قیمتی پتھروں سے جڑاؤ ایک چھوٹا سا تاج اس کے علاوہ ایک چھوٹی سی جڑاؤ اسٹک رکھی تھی۔ جس کے ہینڈل پر دو ننھے منے سونے کے شیر بنے ہوئے تھے۔

میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ تمام چیزیں باہر نکال لیں۔ وہ تینوں چیزیں انتہائی قیمتی تھیں۔ قیمتی پتھروں سے مزین یہ چیزیں سونے کی تھیں۔ تعویز سفید سنگ مرمر کا تھا اور اس پر ایک عجیب طرح کا سیاہ رنگ سے ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ سونے کے جڑاؤ تاج کا سائز بھی اتنا بڑا تھا جتنا ایک چھوٹے سے بچے کے سر پر پہنایا جا سکے' اسٹک کا ڈیزائن بھی خاص تھا۔

میں نے لپک کر پہلے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا' وہ تینوں چیزیں دراز میں سنبھال کر رکھ دیں۔ صرف ڈائری باہر رہنے دی۔ میری ساری دلچسپی اسی ڈائری کے ساتھ تھی' جس پر میرے نام "سرمئی" کے ساتھ "بائی" کا گھناؤنا لفظ لکھا ہوا تھا۔

میں ڈائری لے کر امی کے بیڈ پر بیٹھ گئی اور دھڑکتے دل اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ڈائری کو کھول لیا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

❖

آخری فیصلہ

محترم ایڈیٹر نئے افق'
آداب!
آخری فیصلہ کے ساتھ حاضر ہوں۔ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کی منطق سب سے جدا اور نرالی ہوتی ہے اور وہ خود کو درست ثابت کرنے کے لیے بڑی بھاری دلیلیں بھی دیتے ہیں یہ کہانی بھی ایک ایسے ہی شخص کی ہے جس کی منطق سب سے نرالی تھی امید ہے یہ تحریر قارئین کے معیار پر پورا اترے گی۔

والسلام
نوشین علی خان
کراچی

''نوشی......!''
ممی ایک دم سے اپنی پوری قوت سے چیخی تھیں جیسے انہوں نے میرے کمرے میں کوئی زہریلا سانپ دیکھ لیا ہو۔
سرمئی شام تھی مجھے اپنی ایک نئی سہیلی کے ہاں جانا تھا۔ میں اس وقت قدآدم آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کررہی تھی۔ میرے ہونٹوں پر ایک پیار بھرے گیت کے بول مچل رہے تھے جیسے میری نظروں میں میرے محبوب کا چہرہ گھوم رہا ہو۔ ممی کی چیخ اچانک ہی کمرے میں کسی سنسناتی ہوئی گولی کی طرح گونج گئی تھی اور میری نس نس میں خوف بجلی کی لہر بن کر اتر گیا تھا۔ میں بدحواس ہوکر تیزی سے گھومی تو میرے ہاتھ سے برش چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ ممی دہلیز میں کسی بے جان مورتی کی مانند بے حس وحرکت کھڑی تھیں۔ مجھے دہشت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے میرے وجود میں انہیں کوئی عفریت نظر آ گیا ہو۔ ان کی متوحش نظریں میرے سراپا پر چپکی ہوئی تھیں۔ میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ خدامعلوم میرے سراپا میں ایسی کیا چیز نظر آ گئی تھی جو ان کی دہشت کا سبب بن گئی ہے۔ وہ خواب کی سی حالت میں چلتی ہوئی میرے پاس آ کر رکیں۔ وحشت سے ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ ''نوشی...... تمہیں ذرہ برابر بھی اپنا خیال نہیں رہا' تمہیں کیا ہوگیا ہے بے بی؟ تم اتنی بے پرواہوگئی ہو۔'' وہ تیز وتند لہجے میں بولیں تو ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔
''کیوں ممی؟ کیا ہوا مجھے؟'' میں نے کسی قدر تعجب سے اپنے سراپا کو دیکھا اور پھر ممی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
''مم...... میں نے کیا کیا؟'' میں پریشان ہوگئی تھی کہ آج یہ ممی کو بیٹھے بٹھائے کیا ہوگیا ہے؟
''ایں۔'' ممی کے زرد چہرے پر حیرت واستعجاب بکھر گیا۔ وہ تنک کر بولیں۔ ''جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' اپنا بدن دیکھو نوشی...... بدن! تمہارا یہ بدن چاروں طرف سے پھیل رہا ہے۔ تم پہلی نظر میں بھدی سی لگتی ہو۔ اپنی عمر سے پورے دس سال بڑی دکھائی دے رہی ہو۔ اگر تم نے بداحتیاطی برتی تو پھر ایک روز بیٹی نہیں میری ماں لگو گی۔''

''ممی آپ کو وہم ہوگیا ہے۔'' میں نے آئینے میں ناقدانہ نظروں سے اپنا سراپا دیکھا۔ مجھے اپنے جسم پر فربہی کا گمان نہیں ہو رہا تھا۔ البتہ میں پہلے سے گداز بدن ہوگئی تھی۔ میں نے ان کی طرف گھوم کر کہا۔ ''میرا لباس دیکھیے نا' اگر میں ذرا سی بھی موٹی ہوگئی ہوتی تو یہ چست لباس پہن ہی نہیں سکتی تھی۔''
''تم یوں نہیں مانوگی' مجھ سے تکرار اور بحث کر کے اپنے آپ کو فریب مت دو' میں تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں۔ برسوں سے اس لیے جھک مار رہی ہوں کہ......'' پھر جانے کیا سوچ کر ممی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ پھر ممی نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے قربانی کے جانور کی طرح کھینچتی ہوئی ڈولی کے کمرے میں لے گئیں۔ مجھے وزن کرنے والی مشین پر کھڑا کردیا۔ پھر ڈولی سے انہوں نے چارٹ لے کر دیکھا اور مشین پر جھک کر سیدھی ہوکر اٹھ کھڑی ہوئیں تو ان کی آنکھوں سے جیسے قہر جھانکنے لگا تھا۔ میں نظریں ملانے کی تاب نہ لا سکی۔ نگاہیں نیچی کرلیں جیسے میں ان کی مجرم ہوں۔ خجالت نے مجھے سر اٹھانے نہیں دیا۔
''تمہارا وزن پورے پانچ سو گرام بڑھ گیا ہے۔'' ممی نے اپنا شکنوں بھرا ماتھا پیٹ لیا۔ سینے میں سانسوں کے مدوجزر نے ان کے سارے جسم میں ارتعاش پیدا کردیا تھا۔ ''تم میرے لیے ایک ان دردسر بن جاؤ گی۔ سنو! میں اب مزید کوئی عذاب سہہ نہیں سکتی ہوں۔ تم کل سے سلم ہونے کی پوری پوری کوشش کرو گی۔ میں روز تمہارا وزن چیک کیا کروں گی۔ سمجھیں احمق لڑکی۔''
ممی کا بس چلتا تو وہ میری کھال ادھیڑ کر رکھ

دیتیں۔ اب وہ لڑکیوں کی شادی کے لیے تقدیر کی قائل نہیں رہی تھیں۔ وہ لڑکیاں جو اپنے نصیبوں کی وجہ سے شادی کے بندھن میں بندھ جاتی تھیں ممی ایسے نصیبوں کو سرے سے ہی تسلیم نہیں کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ آج کل لڑکیاں سگھڑ پن اور نیک سیرت ہونے کے ناتے نہیں بلکہ کسی لالچ، جوڑے کی موٹی رقم، لڑکے کے لیے اچھی ملازمت کا چارہ اور شاندار جہیز کی پیش کش سے لڑکیاں اٹھ رہی ہیں۔ یہ شادی نہیں بلکہ باقاعدہ سودے بازی ہوتی ہے اور لین دین کے ترازو کے پلڑے میں لڑکا اپنا وزن کراتا ہے۔ مگر پھر بھی لڑکی کا کسی قدر حسین ہونا شرط ہے۔ وہ نوجوان نہ سہی، عمر کے کسی حصے میں کیوں نہ ہو مگر پرکشش ہو۔ شاید اسی لیے ممی اب روایتی ماں کی طرح لڑکی کی قسمت کو کوستی نہیں تھیں۔ وہ ایک دم سے اور اتنی تیزی سے پھلانگ کر حقیقت پسند بن گئی تھیں کہ ہماری حیرانی ابھی بھی دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو میری اور مجھ سے چھوٹی دو بہنوں کی شادی کے ارمان میں گھل کر بوڑھی نہیں ہو گئی تھیں بلکہ اپنے آپ کو جوان بنا کر رکھنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔

تاکہ لوگ ان کی عمر سے ہماری عمروں کا اندازہ نہ لگا سکیں اور وہ اپنی عمر سے دس سال کم دکھائی دیتی تھیں۔

ناظم آباد کے علاقے میں قدیم طرز کے ایک مکان میں ہم تینوں بہنوں نے جنم لیا تھا۔ امی کی قسمت میں لڑکیاں ہی لکھی ہوئی تھیں۔ وہ قسمت سے جیت نہ سکی تھیں مگر انہوں نے حالات کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے بلکہ سینہ سپر ہوئی تھیں۔ ناظم آباد میں تیس سال گزارنے کے بعد ان کے وجود سے ہمارے مستقبل کی فکر جونک بن کر چمٹ گئی۔ ہم لڑکیاں نہ تھیں بلکہ چٹانیں تھیں جو سرک نہیں پا رہی تھیں۔ ایسی بات نہ تھی کہ میرے اور میری بہنوں کے لیے رشتے نہ آ رہے ہوں۔ رشتے تو بہت آ رہے تھے مگر وہ مطمئن نہ تھیں۔ وہ اپنی حسین لڑکیوں کی شادیاں اپنے خاندان میں کرنا نہیں چاہتی تھیں اور انہیں ابو کے خاندان کے لڑکے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ باہر سے جو رشتے آئے تھے وہ سوال کیا کرتے تھے جیسے ان میں سرخاب کے پر لگے ہوں۔

''جہیز میں کیا دیں گے جی؟ لڑکا تو انکم ٹیکس میں ہے۔ مستقبل اتنا روشن ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

''بھئی لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ تو ہے مگر دنیا میں تنہا ہے۔ اسے گھر داماد بنالیں یا پھر ایک لگژری فلیٹ لے کر دے دیں۔''

''لڑکے کی تنخواہ پندرہ سو روپے ہے، جوڑے کی رقم پچاس ہزار دیں اور شان دار جہیز دیں تو پھر سوچا جاسکتا ہے۔''

''آج کل لڑکوں کا قحط ہے۔ اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ ہر گھر میں اتنی لڑکیاں ہیں کہ ان کی شادیاں مسئلہ بن گئی ہیں۔ لین دین کی شرائط پر ہی لڑکیاں اٹھ سکتی ہیں ورنہ نہیں۔ لڑکیوں کے حسن میں جب ہی چار چاند لگتے ہیں جب انہیں جہیز میں لاد دیا جاتا ہے۔ ویسے حسین وجمیل اور پرکشش لڑکیوں کی کیا کمی ہے؟ لہٰذا اس لڑکے کو داماد بنالیں اور کاروبار میں شریک کرلیں۔''

ایسی باتوں نے ممی کو کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ جب لڑکیوں کو جہیز اور لین دین کے ترازو کے پلڑے میں تول کر دینا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں نہ لڑکیاں اعلیٰ خاندانوں کی بہو بن جائیں جبکہ وہ حسن وجمال کا شاہکار ہیں۔ انہوں نے ڈیفنس سوسائٹی میں ایک بنگلہ چار ہزار روپے ماہوار کرایہ پر لے لیا۔ ناظم آباد کے مکان میں اپنے وجود کے سوا باقی سب کچھ چھوڑ آئے۔ میں نوشی، منجھلی ڈولی اور سب سے چھوٹی اور تیسری پمی بے بی کہلانے لگیں۔ ممی ہمیں روز لیکچر دیا کرتی تھیں۔

''تمہاری نئی سہیلی یا بوائے فرینڈ سے کتنی ہی گہری دوستی کیوں نہ ہو جائے۔ وہ لوگ لاکھ سیدھے سادے وسیع الخیال اور اچھے سہی۔ خبردار جو تم نے کسی کو یہ بتایا کہ تمہارے ڈیڈی کی حیدرآباد میں مٹھائی کی دکان ہے۔ دکان خوب چلتی ہے۔ آمدنی بے حساب ہوتی ہے۔ سارے شہر میں مشہور دکان ہے۔''

''کیوں ممی؟ سچ سچ بتانے میں حرج کیا ہے۔ مٹھائی کی ہی تو دکان ہے۔ چرس یا افیم کی دکان تو نہیں ہے۔''

''احمق لڑکی...... تو سمجھتی کیوں نہیں ہے۔ یہ ناظم آباد نہیں ہے۔ ڈیفنس سوسائٹی ہے۔''

''ڈیفنس سوسائٹی ہے تو کیا ہوا؟ کیا یہاں انسان نہیں رہتے؟''

''یہاں کوئی اور ہی مخلوق رہتی ہے۔ یہاں وہ لوگ رہتے ہیں جو اپنے آپ کو خول میں بند رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک حلوائی کوئی عزت نہیں رکھتا۔ وہ لوگ حلوائی کے مقابلے میں ایک اسمگلر کی زیادہ عزت کرتے ہیں۔''

''تو ہم انہیں اپنے ابو کے بارے میں کیا کہیں؟''

''ابو تو ناظم آباد ہی میں دفن ہو گئے۔ بھولے سے بھی ابو نہ کہنا۔ ڈیڈی کہنا، تمہارے ڈیڈی شکاگو میں ہیں۔ وہ قالین کا کاروبار کرتے ہیں۔ سال میں دو ایک بار آتے ہیں یا پھر ورلڈ ٹور پر رہتے ہیں۔''

''اور سنو! اپنی بڑائی ہر وقت ہانکتی رہا کرو ان باتوں سے بڑا اثر پڑتا ہے۔ پرس میں ہر وقت ہزار دو ہزار روپے رکھا کرو۔ سہیلیوں کے ساتھ

جنٹل مین

دوسری جنگ عظیم کے دنوں میں امریکی فوجی انگلستان کے مختلف شہروں میں بھی دندناتے پھرتے تھے۔ ان کی کھلی ڈلی طبیعت، بدزبانی کی حد تک بے تکلفی زبان اور انداز واطوار انگلستان کی روایت تہذیب کے پرستاروں کے لئے بہت تکلیف دہ تھے اور وہ اپنی بیزاری کا مختلف طریقوں سے اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔

ایک لائبریری کے پرسکون ماحول میں ایک امریکی فوجی بوٹوں کے ساتھ شور مچاتا ہوا داخل ہوا اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر لائبریرین لڑکی سے انتہائی بلند آواز میں بولا۔

ڈارلنگ! میں پیشاب کرنا چاہتا ہوں، باتھ روم کہاں ہیں؟

لڑکی نے چند لمحے اس کی طرف دیکھا پھر بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ سامنے والے دروازے سے دائیں ہاتھ مڑ جاؤ۔ کوریڈور کے آخر میں ایک دروازے پر تمہیں ''جنٹل مین'' لکھا ہوا نظر آئے گا تم اس کی پروا نہ کرنا، سیدھ اندر چلے جانا۔

(انتخاب کیا ہے امجد اسلام امجد صاحب کی کتاب شہر در شہر سے)

(محمد شفاعت حسنین صابر لنگاہ...... خانیوال)

اٹھو بیٹھو تو دل کھول کر خرچ کرو۔ لڑکے لڑکیوں سے دوستی کرو تو اسی محلے یا پھر ایسے لوگوں کے ساتھ جن کے پاس دولت کی افراط ہو۔ بنگلہ، کوٹھی اور کار ہو۔ صنعت کار یا کسی اسمگلر کا بیٹا سہی مگر اپنے وجود پر گرد یا دھبا آنے نہیں دینا۔ اپنے آپ کو ہمیشہ تسلّم رکھو۔ کیوں کہ اس علاقے کے مردوں کا مزاج کچھ عجیب سا ہے۔ وہ حسین لڑکیوں سے زیادہ پرکشش اور گداز لڑکیوں کو پسند کرتے ہیں۔ وہ شادیاں اس لیے نہیں کرتے ہیں کہ انہیں خوب صورت زندگی گزارنا ہوتی ہے بلکہ زندگی سجانا ہوتی ہے۔ سجاوٹ کے لیے کسی بھی چیز میں کشش کا ہونا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ جب ہی وہ چیز بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کشش میں ہی تو حسن ہوتا ہے۔“

ممی اشارے کنائیوں میں ہمیں زندگی کے یہ اسرار و رموز سکھاتی رہتی تھیں۔ ہر وقت اپنی کڑی نگاہوں کی گرفت میں رکھتی تھیں۔ سب سے زیادہ خیال تو انہیں ہمارے وزن اور جسموں کے تناسب کا رہتا تھا۔ اگر انہیں ذرا سا بھی یہ شک ہو جائے کہ وزن بڑھ گیا ہے اور فربہی کا گمان ہو رہا ہے تو سختی سے نوٹس لیتی تھیں اور پھر وہ آمرانہ احکام جاری کرتی تھیں۔

ہم تینوں بہنیں بے حد حسین و جمیل اور پرکشش بھی تھیں اور حسن و جمال کا شہرہ پورے علاقے میں پھیل گیا تھا۔ اسی لیے جلد ہی ڈیفنس سوسائٹی کی لڑکیوں اور ان کے بھائیوں سے ہماری دوستی ہو گئی تھی۔ میں اپنی جس نئی سہیلی کے ہاں جانے کے لیے ایک گھنٹے سے تیار ہو رہی تھی اس کے دو بھائی تھے۔ بڑا بھائی ظفر کسی کمپنی میں جنرل منیجر تھا۔ اس کی بیوی یاسمین بلاشبہ بڑی طرح دار اور حسین تھی۔ حسن میں تیکھا پن ہو تو وہ فتنہ بن جاتا ہے وہ واقعی فتنہ ہی تھی۔ ظفر سے چھوٹا عرفان تھا۔ اس کا اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا۔ وہ اکثر یورپ کی سیاحت پر رہتا تھا۔ اس کا اتنا بڑا اور پھیلا ہوا کاروبار تھا کہ مجھے اس پر رشک آنے لگا۔ پہلی ہی ملاقات میں میں نے اسے اپنے دل سے بہت قریب محسوس کیا تھا۔ آج اس سے میری تیسری ملاقات ہونے والی تھی۔ میری سہیلی رضیہ نے ٹیلی فون پر اطلاع دی تھی کہ عرفان دو تین دن میں امریکا جا رہا ہے۔ اس اطلاع سے میرا دل بجھ گیا تھا۔ میں نے دو تین دن سے اس کے خواب دیکھنا شروع کر دیئے تھے۔ کیونکہ دو ایک ملاقاتوں میں میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی نگاہوں کی زبان نے مجھے محبت کا پیغام دیا ہے۔

رضیہ کے ہاں میں پہنچی تو رضیہ گھر پر موجود نہیں تھی۔ اس کا منگیتر یونس جو اچانک کینیڈا سے آ رہا تھا اسے لینے وہ ایئرپورٹ چلی گئی تھی۔ البتہ عرفان گھر پر تھا۔ بے تابی سے میرا ہی انتظار کر رہا تھا۔ رسمی باتوں کے بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ”آپ امریکا کب جا رہے ہیں اور واپسی کب ہو گی؟“

”جب جا ہی نہیں رہا ہوں تو واپسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“

”آپ جا کیوں نہیں رہے ہیں۔ کیا پروگرام کینسل ہو گیا ہے؟“ میں دل میں خوش ہو گئی۔

”کوئی جانے نہیں دے رہا ہے تو کیا کروں۔ مجبوراً پروگرام کینسل کرنا پڑ رہا ہے۔“ اس نے شوخی سے کہا۔

”کون ہے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آپ ہیں۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ”سچ پوچھیے تو میں ان ریشمی سیاہ زلفوں کا اسیر بن چکا ہوں۔ ان جھیل سی آنکھوں میں ڈوب چکا ہوں۔ جب ڈوب کر دل کی تہہ میں چلا گیا ہوں تو باہر کیسے نکل سکتا ہوں۔ باہر نکل بھی گیا تو پھر چین کہاں آئے گا۔ ہر جگہ یہ گلاب میری نظروں کے سامنے کھلتے رہیں گے۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے لیا۔ ”نوشی!“ اس نے بڑے پیار سے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”کیا تم سمجھتی ہو مجھے تمہارے بغیر کسی پل چین آئے گا۔ تم نے تو مجھے باندھ لیا ہے نوشی......“ میں کیا کہتی میرے ہونٹ مقفل ہو چکے تھے۔ حیا آلود ہو کر رہ گئی۔

ممی نے یہ کہہ کر عرفان کو پاس کر دیا تھا کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔ کھاتے پیتے گھر کا ہے، اتنی سی عمر میں اس نے کاروبار کی بہت ساری ذمے داریاں سنبھالی ہوئی ہیں۔ اپنے بھائی یا کسی اور کا دست نگر نہیں ہے۔ اس کے پاس بینک بیلنس بھی ہے اور جائیداد بھی۔ وہ خوش پوش اور اسمارٹ تھا مگر خوب صورت نہ تھا۔ ممی نے کہا کہ مرد میں دولت کی خوبیاں ہوں تو وہ دنیا کا سب سے خوب صورت اور وجیہہ مرد ہوتا ہے۔ مرد کی صورت نہیں بینک بیلنس شیٹ دیکھی جاتی ہے۔ یو آر لکی نوشی......! تم نے تو ستاروں پر کمند ڈال دی۔ کینگ گریجویشن نوشی بے بی...... آج میری محنت رائیگاں نہیں گئی لیکن تم اپنی محبت کی فتوحات کا سلسلہ اس انجام کی نذر نہ کر دینا جہاں کل تمہیں آنسو بہانا پڑیں۔

میں نے پہلی محبت کی تھی۔ عرفان جیسے جیسے کاروبار، دولت کمانے کے منصوبے اور اپنے

مستقبل کو سنہرا بنانے کی تدبیریں بتاتا میں ویسے ویسے اس کی چاہت میں پاگل ہوتی گئی۔ میں اس کی محبت میں چاندی کی طرح پگھلنے لگی۔ میں جدھر دیکھتی رنگ ہی رنگ نظر آتے' میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ میں نوشی نہیں ہوں۔ کوئی اور ہوں' رنگ و بو ہوں محبت نے جیسے میرے وجود کو کسی اور قالب میں ڈھال کر تراش دیا ہو۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا تھا عرفان میرے ساتھ نہ ہوتا ہو۔

ایک روز میں نے سنا تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ عرفان کے بھائی' ظفر کی حسین وجمیل بیوی یاسمین نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔ پھر میں نے سنا کہ وہ ظفر کی کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر عادل رشید سے شادی کرنے والی ہے۔ ظفر نے وہ کمپنی چھوڑ کر دوسری کمپنی جوائن کرلی اور اس کمپنی کے چیئرمین کی لڑکی ساجدہ انجم سے اس کی شادی ہو رہی ہے جو جرمنی سے بزنس ڈپلوما لے کر آئی ہوئی ہے۔

ممی نے یاسمین کے اقدام کو سراہا تو میں احتجاجاً چیخ پڑی۔ ''کیا پانچ برسوں کی رفاقت کوئی معنی نہیں رکھتی ہے؟''

''یو فول بے بی!'' ممی بولیں۔ ''یاسمین نے جو کچھ کیا وہ صحیح فیصلہ کیا ہے۔ اس نے اپنا مستقبل بنایا ہے۔ وہ طلاق لے کر پستی میں نہیں گری بلکہ اس نے انتہائی بلندیوں کو چھولیا۔ اگر ناظم آباد کے علاقے کی کوئی عورت طلاق لیتی تو اس کی ساری زندگی شادی نہ ہوتی۔ میری جان یہ ڈیفنس سوسائٹی ہے۔ اپر کلاس ہے یہاں حسین اور پرکشش عورت کی ایسی ہی قدر ہوتی ہے۔ ظفر بھی طلاق دے کر گھاٹے میں کہاں رہا۔ اس نے بھی تو بہت بڑا ہاتھ مارا ہے۔''

''لیکن ممی یہ بڑی عجیب دنیا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ کیا یہ بندھن کچے دھاگے کی مانند ہوتا ہے۔''

عرفان نے مجھ سے کہا تھا' حسین عورتوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے وہ کسی شہد کی مکھی کی طرح ہوتی ہے جہاں چھتہ دیکھا وہاں بیٹھ گئی۔ سچ پوچھو تو مجھے حسین لڑکیوں سے بہت خوف آتا ہے۔''

''مجھ سے بھی......؟''

''جو محبت کرتے ہیں ان کا آپس میں ڈرنا کیا؟ مجھے تو حسین بیویوں سے خوف آتا ہے۔ میری بیوی کہاں ہے جو میں ڈروں؟''

ممی نے ملنے والوں کو تو یہ بتایا کہ وہ ہوا خوری کے لیے سوات جارہی ہیں لیکن ہم سب کو حیدرآباد لے آئیں۔ ہم وہاں کوئی پندرہ دن ابو کے ساتھ رہے۔ جب ہم واپس کراچی آئے تو میرے سر پر جیسے بم پھٹا۔ میری سہیلی شاہدہ نے بتایا کہ عرفان نے لاہور میں اپنی کزن سے شادی کرلی ہے۔ وہ ہنی مون منانے مری گیا ہوا ہے۔

مجھ پر جیسے بجلی آ گری تھی۔ عرفان میرے ہاتھ سے نکل کیا گیا مجھے لگا کہ یہ میری اپنی غلطی تھی جو میں نے محبت کے ڈراما میں وقت ضائع کردیا۔ مجھے تو لوہا گرم دیکھ کر شادی کی بات چھیڑنا تھی۔ شادی کے بعد محبت کا ڈراما سلسلہ وار چلتا رہتا۔ ممی کو عرفان کے ہاتھ سے نکل جانے کا افسوس ضرور ہوا تھا مگر انہیں وہ دکھ اور صدمہ نہیں پہنچا تھا جس سے میں دوچار تھی۔ وہ مجھے تسلی دینے لگیں جب میں روتے اور آہیں بھرنے لگتی۔ ''بے بی! یہ تو بہت اچھا ہوا شاید تمہیں عرفان سے بہیں بلند رتبے اور حیثیت کا شخص مل سکتا ہے۔ عرفان نے تمہیں اپنے حلقے میں متعارف کرادیا ہے۔ تم کلب بھی جاتی ہو۔ عرفان کی بے وفائی اور شادی نے تمہیں بڑی پبلسٹی دی ہوگی۔ کلب جاؤ گی تو دیکھنا کتنے ذی حیثیت لوگ تمہاری طرف بڑھتے ہیں۔''

میں کوئی ایک ماہ بعد کلب جاسکی۔ اس لیے کہ میں نے ناظم آباد کی فضا میں پرورش پائی تھی۔ ڈیفنس سوسائٹی آ کر اب تک پوری طرح وہاں کے ماحول میں اپنے آپ کو جذب نہ کرسکی۔ دل پر مرد کے ہرجائی پن کا پہلا زخم لگا تو کئی دنوں تک کمرے میں بند ہوکر آنسو بہاتی رہی۔ ممی کے بار بار سمجھانے پر کلب چلی گئی کہ دوستوں سے ملاقات ہوگی تو دل بہل جائے گا۔

کلب جاکر معلوم ہوا کہ عرفان اپنی نئی نویلی بیوی جمیلہ کے ساتھ آیا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ الٹے قدموں واپس چلی جاؤں۔ لیکن ایک فطری تجسس بیدار ہوگیا کہ اس کی بیوی کو تو دیکھوں...... آخر اس میں کون سے ایسے چار چاند لگے ہیں جس نے عرفان کو مجھ سے چھین لیا۔ اس لیے کہ میں کم حسین نہ تھی۔ مجھ جیسی پرکشش لڑکیاں تو لاکھوں میں ایک ہوتی ہیں۔

جب میں نے جمیلہ کو دیکھا تو سکتے میں آ گئی۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ جمیلہ جیسی کالی لڑکی افریقہ میں ہی ہوسکتی تھی۔ میں ششدر تھی کہ آخر عرفان کے پاس کس چیز کی کمی تھی جو وہ جمیلہ کے باپ کے ہاتھوں بک گیا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے دوسرے دن عرفان کو کلب کے گوشے میں جالیا۔ جب میں نے اپنی نفرت جذبات و احساسات کا پٹارہ کھول دیا تو وہ میری بات بڑی خاموشی اور تحمل سے سنتا رہا۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو وہ مسکرایا۔ ''نوشی ڈارلنگ! وہ ایک مڈل کلاس فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ یقین جانو...... میں نے کسی لالچ میں آ کر اس سے شادی نہیں کی۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ آخر ایک کالی اور بدصورت لڑکی سے شادی کرنے کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟''

''میں نے تم سے کہا تھا نا کہ حسین عورت کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ وہ کسی شہد کی مکھی کی طرح ہوتی ہے جہاں چھتہ دیکھا وہاں بیٹھ گئی۔ اس لیے مجھے حسین عورتوں سے خوف آتا ہے۔ ہماری سوسائٹی میں حسین بیوی ایک تتلی کے مانند ہوتی ہے وہ رنگینی کے پیچھے بھاگتی ہے۔ میری بھابی کو رتبے اور حیثیت نے چھین لیا۔ چھینا جھپٹی کے کھیل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لیے میں نے ایک کالی لڑکی سے شادی کرلی تاکہ کوئی میری بیوی کو مجھ سے چھین نہ سکے۔ تم نے شاید سنا ہوگا کہ...... محبت ہمیشہ کسی حسین وجمیل لڑکی سے کرو اور شادی کسی بدصورت لڑکی سے اس لیے کہ تم زندہ رہو گے اور تمہاری بیوی پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔ اس پر کوئی نظر بھی نہیں ڈالے گا اور نہ ہی وہ کسی کی طرف ملتفت ہوگی۔''

سفلی علم

محترم عمران بھائی'
السلام علیکم و رحمتہ اللہ!
ایک سچی اور عبرت ناک کہانی لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ یہ کہانی خاص طور پر ان لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے جو اپنی پریشانیوں اور دکھوں کا علاج دنیا میں پھیلے ہوئے شیطان کے پیرو کاروں کے پاس جا کر تلاش کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو مسلمان کہنے کے باوجود اللہ سے مدد نہیں مانگتے اس کی رحمتوں کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے' جب کہ اللہ رب العالمین خود ارشاد فرماتا ہے۔ جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کو سنتا ہوں اللہ تعالیٰ ہم سب کو مرض و حسد میں مبتلا ہونے سے بچائے اور ہمارا شمار نصیحت والوں میں کرے ندامت والوں میں نہیں۔ آمین

والسلام
شہنی ارشاد
کراچی

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ:
رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں شیطان اپنا عرش پانی پر رکھتا ہے پھر اپنے لشکروں کو بہکانے کے واسطے بھیجتا ہے۔ سب سے زیادہ مرتبہ والا اس کے نزدیک وہ ہے جو فتنے میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

یہ جب واپس آتے ہیں تو اپنے بدترین کاموں کا ذکر کرتے ہیں کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شخص کو اس طرح بے راہ کر دیا' کوئی کہتا ہے میں نے فلاں شخص سے یہ گناہ کرایا۔ شیطان کہتا ہے یہ کچھ نہیں' معمولی کام ہیں۔ یہاں تک کہ ایک آ کر کہتا ہے کہ میں نے ایک شخص اور اس کی بیوی کے درمیان جھگڑا ڈال دیا۔ یہاں تک کہ جدائی ہو گئی۔ شیطان اسے گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاں تو نے بڑا کام کیا ہے اسے اپنے پاس بٹھا لیتا ہے اور اس کا مرتبہ بڑھا دیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ:
جو شخص کسی کاہن کے پاس یا جادوگر کے پاس جائے اور اس کی بات کو سچ سمجھے اس نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری ہوئی وحی کے ساتھ کفر کیا۔

❖......☆......❖
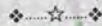
دوپہر ڈھلنے کو آئی ہے' بھوک سے میرے پیٹ میں شدید اینٹھن ہو رہی ہے' میں نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا ہے' سوائے ایک پیالی چائے کے' افشین نے میرے آگے دو پاپے چائے کے ساتھ رکھے تھے کھانے کے لیے لیکن اس کے شوہر نے بلا کر اسے بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ ناشتے کے لیے صرف یہی دو پاپے بچے ہیں۔ تم یہ بھی اپنی ماں کو کھلا دو گی تو میری ماں کیا بھوکی رہے گی' تو میں نے ان پاپوں کو پلیٹ میں ہی رہنے دیا اور چائے کا مگ منہ سے لگا لیا یہ کہہ کر کہ میرا دل نہیں چاہ رہا۔

اللہ میں نے تو کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مجھے ایک وقت اپنا پیٹ بھرنے کے لیے اتنی ذلت اٹھانی پڑے گی' اپنے رب سے دن رات اپنے گناہوں کی معافی مانگتی ہوں لیکن ابھی تو میری سزا شروع ہوئی ہے' نہ جانے میری اور کتنی زندگی باقی ہے اور اللہ مجھے کیا کیا نہیں دکھائے گا۔

وہ بھی کیا وقت تھا جب میرے گھر میں صبح ناشتے کی ٹیبل مختلف قسم کی چیزوں سے بھری ہوتی تھی' کوئی پراٹھا آملیٹ کھاتا تھا' کوئی ہاف فرائی انڈا' مکھن سلائس کے ساتھ' تو کوئی حلوہ پوری...... اور میں سب کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے سارا ناشتہ اپنے ملازموں سے تیار کرواتی تھی' پایوں کا نام سنا تھا کہ غریب لوگ اپنا ناشتہ چائے پاپے کا کرتے ہیں اور آج میرا یہ حال ہے کہ مجھے غریبوں کا ناشتہ بھی میسر نہیں ہے۔

افشین میری نازوں کی پلی بیٹی جس نے اٹھ کر ایک گلاس پانی بھی خود سے نہیں پیا تھا' آج اس کا کیا حال ہے' میرے تین بیٹوں کے بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی تھی' میرے علاوہ وہ باپ اور بھائیوں کی بھی لاڈلی تھی۔ اسی کے لیے تو میں نے یہ سب کچھ کیا تھا لیکن ہوا کیا میرے ساتھ۔ اللہ کی مجرم اور سزا کی حق دار ٹھہری۔

ہم اللہ کے کیسے بندے ہیں کہ جب وہ ہمیں دنیا میں عزت' دولت' صحت اور سکون عطا کرتا ہے تو ہم بجائے اس کا شکر ادا کرنے کے اور اور کی لالچ میں پڑ جاتے ہیں۔ اپنے علاوہ کسی اور کو خوش حال نہیں دیکھ سکتے' حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنے اس حسد کے ہاتھوں مبتلا ہو کر ہم نہ صرف دوسرے کا نقصان کرتے ہیں بلکہ خود بھی نقصان اٹھاتے ہیں۔

ہم جب جانتے بوجھتے اللہ کے احکام سے منہ پھیرتے ہیں تو وہ ہماری رسّی دراز کرنے کے بعد ایک دم سے کھینچ لیتا ہے۔

میں نے بھی تو یہی کیا تھا' مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں جو کام کرنے جا رہی ہوں' وہ گناہ ہے' اسے کرنے کے بعد میں کفر میں مبتلا ہو جاؤں گی لیکن میرے حسد نے مجھے دن رات چین نہیں لینے دیا اور آج میں اس حال میں زندہ ہوں۔ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی اور اللہ کے عذاب کی مستحق ٹھہری۔

ٹھہریے! آپ شاید میری ان بے سروپا باتوں سے الجھ نہ گئے ہوں۔ مجھے اپنی ساری کہانی آپ لوگوں کو شروع سے سنانی ہو گی۔ میں کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ اپنی ہر ہر سوچ اپنی ہر ہر کیفیت آپ کو بتاؤں گی اور اپنی یہ کہانی سنانے کا واحد مقصد صرف اور صرف یہ ہے کہ اگر کوئی بہن میرے جیسی سوچ کا شکار ہو اور وہ وہی عمل کرنا چاہتی ہو یا کرنے کا سوچ رہی ہو تو وہ سنبھل جائے' ہوش میں آ جائے اور وہ سب نہ کرے جو میں نے کیا ہے ورنہ سوائے پچھتاوؤں کے اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔

میرا نام شیرین ہے' میری شادی عبدالرحمان نامی ایک بزنس مین سے ہوئی۔ میرا میکہ تو زیادہ امیر نہیں تھا لیکن سسرال بہت امیر ملا۔ رحمان میرے دیور سلمان کے ساتھ مل کر بزنس کرتے تھے ان کا ایک ہی اکلوتا بیٹا تھا ریحان اور میرے ماشاء اللہ چار بچے تھے پہلے تین بیٹے پیدا ہوئے پھر اللہ نے ایک بیٹی بھی دے دی۔

دیور کے گھرانے کے ساتھ ہمارے تعلقات بہت اچھے تھے اور دیورانی سے بھی بہت دوستی تھی' جب افشین پیدا ہوئی تو میری دیورانی ریحانہ نے افشین کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔

''بھابی! افشین کو تو آپ مجھے دے دیں۔'' اور ریحان جو اس وقت چار سال کا تھا جھٹ بولا۔

''مما! میں افشین کو اپنی دلہن بناؤں دا......!'' اس کی بات سن کر سب ہنس پڑے مگر ریحانہ نے کہا۔

''بھابی! ریحان نے بالکل ٹھیک کہا ہے' آج اس بات کا فیصلہ کر لیتے ہیں کہ افشین کی شادی تو میرے ریحان ہی سے ہو گی ورنہ ریحان زندگی بھر کنوارہ ہی رہے گا۔''

میں نے بھی کہہ دیا کہ ہاں آج سے افشین

تمہاری ہی بیٹی ہے پھر ہم نے ایک چھوٹی سی تقریب بھی کرڈالی اور افشین کے عقیقے والے دن ریحانہ نے ریحان سے افشین کی انگلی میں گولڈ کی انگوٹھی بھی پہنادی۔

بچے سمجھ دار ہوئے تو یہ بات ان کے علم میں بھی آ گئی کہ ان کی منگنی تو ان کے بچپن میں طے ہوچکی ہے' دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے اور وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے بچے جوان ہوتے گئے' دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پروان چڑھتی چلی گئی' گھر میں سب ہی اس بات سے واقف تھے' ہم بھی اپنے فیصلوں پرقائم تھے۔

ایک دن ریحانہ میرے گھر آئی ہوئی تھی' اس کے سامنے افشین نے ملازمہ کو بہت بُری طرح ڈانٹا کہ وہ چائے اتنی دیر سے کیوں لائی ہے' ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ میں آپ کے کپڑے پریس کررہی تھی تو افشین نے غصے میں آ کر اسے نوکری سے نکال دیا کہ یہ اتنی بدتمیز ہے کہ ہمارے آگے زبان چلاتی ہے' افشین کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہورہا تھا' وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینک رہی تھی' میں اس کا غصہ جتنا ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتی وہ اتنا ہی ہائپر ہورہی تھی' تب ریحانہ نے کہا۔

"شیرین بھائی! آپ نے افشین کو بے جا لاڈ پیار کرکے بگاڑ دیا ہے' لڑکی ذات کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ ہر طرح کے ماحول اور حالات میں ایڈجسٹ کرسکے' خاص طور پر سسرال میں......!"

"مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے بھابی! افشین کون سا کسی غیر کے گھر بیاہی جارہی ہے' اپنے چچا کے گھر ہی تو جارہی ہے اور سب ہی لوگ اس سے پیار کرتے ہیں اور خاص طور پر ریحان کی تو جان ہے افشین میں۔" میں نے فخریہ لہجے میں کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن سسرال سسرال ہی ہوتا ہے' افشین میرے گھر میں بہو بن کر جائے گی' اس کو اپنے طور طریقے بدلنا ہوں گے' اس کو ذمہ داریوں کا احساس دلائیں' شادی کے بعد ایک لڑکی پر بہت سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور اسے انہیں احسن طریقے سے نبھانا بھی ہوتا ہے اگر ایسا نہیں ہوتا تو آئے دن جھگڑے فساد ہوتے ہیں اور شوہر پھر شوہر ہوتا ہے' شادی سے پہلے وہی لڑکی محبوبہ ہوتی ہے وہ اس کے ناز اٹھاتا ہے لیکن شادی کے بعد وہ بیوی اور خود شوہر بن جاتا ہے اور بیوی کی حیثیت سے اسے شوہر کو خوش کرنے کے لیے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

ریحانہ نے بجائے اس کے کہ افشین کو پیار کرتی اسے بہلاتی...... مجھے ایک لمبا لیکچر دے ڈالا۔ افشین نے بھی یہ سب سنا اور اسے بھی ریحانہ پر بہت غصہ آیا اور اس کا موڈ اتنا آف ہوا کہ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ زور سے بند کیا اور کمرا بند کرکے رونے لگی۔

"تو اس کا تو یہ مقصد ہوا ریحانہ کہ تم میری نازوں سے پلی بیٹی کے ناز اٹھانے کے بجائے اس سے گھر کے سارے کام کرواؤ گی' اسے ریحان کی باندی بنادو گی۔" میں نے تنک لہجے میں کہا۔

"آپ میری باتوں کا غلط مطلب لے رہی ہیں بھابی! میرا مطلب تو یہ تھا کہ......!"

"بس بس ریحانہ! میں سمجھ گئی کہ تم بھی عام روایتی ساسوں والا سلوک کرو گی میری افشین کے ساتھ' میں آپ کو بتائے دے رہی ہوں کہ میری افشین نے اپنے باپ کے گھر میں بھی شاہانہ زندگی گزاری ہے اور سسرال بھی میں اسے ایسا دوں گی جو میری بیٹی کی قدر کرے' وہ گھر کا کوئی کام نہیں کرے گی۔"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ میں افشین سے گھر کے کام کرواؤں گی' کام تو میں خود بھی نہیں کرتی میرے گھر بھی ملازمین ہی سارا کام کرتے ہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ افشین اپنا مزاج ٹھیک کرے' اتنی معمولی معمولی باتوں پر اتنا غصہ کرنا' چیخ و پکار مچانا' اس بے چاری ملازمہ کو نوکری سے نکال دیا۔ اللہ جانے کس مجبوری کے تحت وہ ملازمت کررہی تھی' یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔" ریحانہ نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ ایک معمولی عورت کے مقابلے میں میری افشین کو قصوروار ٹھہرا رہی ہیں۔ اسے ملازم ہی میں نے صرف افشین کے لیے رکھا تھا۔ مجھے آپ کی باتیں سن کر بہت افسوس ہورہا ہے' ابھی تو میری بچی میرے گھر میں ہی ہے تو آپ نے اتنی باتیں سنادیں' کل کو وہ آپ کے گھر آ جائے گی تو آپ نہ جانے اس کا کیا حشر کریں گی۔" میں نے بگڑ کر کہا۔

"بھابی! آپ تو خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہی ہیں۔ بات کو کہاں سے کہاں لے گئیں۔ میرا تو زبان کھولنا گناہ ہوگیا۔" ریحانہ نے بھی غصے سے جواب دیا۔

"کل کو جب میری بیٹی آپ کے گھر بہو بن کر جائے تو اپنی اس زبان کو سوچ سمجھ کر کھولنا ریحانہ بیگم! ورنہ میں برداشت نہیں کروں گی......" میں نے تنبیہہ کے انداز میں انگلی اٹھا کر کہا۔

"میں باز آئی ایسی بہو سے......" ریحانہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا اور میں چونک پڑی اور اس دن سے ہمارے درمیان ایک قسم کا کھنچاؤ سا پیدا ہوگیا۔ ریحانہ پہلے جب بھی آتی تھی افشین کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتی تھی' ان دنوں کا شدت سے انتظار کرتی اور باتیں کرتی کہ جب وہ افشین کو اپنی بہو بنا کر اس گھر سے لے جائے' شادی میں ابھی ٹائم باقی تھا کیوں کہ افشین اور ریحان دونوں تعلیم حاصل کررہے تھے لیکن اب ریحانہ افشین کو مخاطب ہی نہیں کرتی زیادہ تر خاموش بیٹھی رہتی۔

میں اس کا بدلا ہوا رویہ دیکھ ہی رہی تھی' مجھے غصہ آ جاتا پھر ایک دن میں نے رحمان کو ریحانہ کے بارے میں بتایا کہ وہ افشین کے بارے میں کیا کیا کہتی ہے' وہ افشین سے خوش نہیں ہے اور بہو بنا کر تو وہ میری بیٹی کے ساتھ کیا کیا نہیں کرے گی۔

اور پھر بات بڑھتی چلی گئی۔ ہمارے دل ایک دوسرے سے بُرے ہوتے چلے گئے۔ وقتی طور پر افشین بھی ناراض ہوگئی اور ریحانہ کی باتوں کو لے کر اس نے ریحان کو بھی باتیں سنانا شروع کردیں۔

افشین کی باتوں کے جواب میں ریحان نے کہا کہ امی نے کون سی غلط بات کی ہے' تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔

جب افشین نے یہ بات مجھے بتائی تو مجھے بے حد غصہ آیا کہ ہاں تو ماں بیٹا بھی وہی زبان بول رہا ہے' یہ لوگ میری افشین کو خوش نہیں رکھیں گے اور میں نے یہ سوچ کر کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوگا کہ ہم غلط تھے' ایک دن ریحانہ سے صاف صاف انکار کردیا کہ میں افشین کی شادی ریحان سے نہیں کروں گی۔

میں سمجھ رہی تھی کہ اب ریحان اور ریحانہ آ کر میری خوشامد کریں گے میرے آگے ہاتھ جوڑیں گے کہ میں رشتے سے انکار نہ کروں کیوں کہ میں اچھی طرح سے جانتی تھی کہ ریحان افشین کا دیوانہ ہے' پھر میں مان جاؤں گی اس طرح افشین کا پلہ ہی بھاری رہے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔

ریحانہ نے میرے گھر آنا بالکل ہی چھوڑ دیا' ریحان نے بھی افشین سے قطع تعلق کرلیا اور سلمان نے بھی رحمان سے بزنس سے اپنا حصہ مانگ لیا۔

میرے بیٹوں کو بہن کی منگنی ٹوٹنے کا صدمہ تو نہیں ہوا البتہ بزنس الگ ہونے پر انہیں شدید شاک لگا۔ گھر میں صرف رحمان کی ذات ایسی تھی جنہیں

افشین کی منگنی ٹوٹنے کا افسوس تھا اور انہوں نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی اور برملا اس بات کا اظہار کیا کہ میں افشین کا مزاج بدلنے کی کوشش کروں مگر میری انا میرے آڑے آ گئی اور میں نے بڑے متکبرانہ لہجے میں کہا۔

''میری افشین لاکھوں میں ایک ہے۔ حسین' خوب صورت ہے' اچھا خاندان ہے' تعلیم یافتہ ہے اس کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے۔''

رحمان مصلحت کے تحت ہمیشہ کی طرح خاموش ہوگئے' ان کی عادت ایسی ہی تھی' مجھ سے کبھی کسی بات پر بحث نہیں کرتے تھے۔ خاموش ہوجاتے تھے' دل میں کڑھتے رہتے ہوں گے اور پہلی بار انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا' پھر بار بار ہونے لگا اور جس دن سلمان نے ان سے اپنا بزنس علیحدہ کرنے کے لیے کہا اس روز انہیں دل کا پہلا دورہ پڑا۔

بزنس علیحدہ ہوگیا تو وہ بالکل خاموش رہنے لگے' آفس بھی جانا چھوڑ دیا' رحمان کا بزنس ان کے تینوں بیٹوں نے سنبھالا اور سلمان کے بزنس میں ریحان بھی شامل ہوگیا۔

دونوں گھرانے ایک دوسرے سے بالکل کٹ گئے۔ مجھے دوسروں سے معلوم ہوا کہ ریحان نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور اس نے سلمان کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا ہے۔

پھر معلوم ہوا کہ ریحانہ ریحان کے لیے لڑکی تلاش کررہی ہے تو میں تلملا کر رہ گئی اور میں نے بھی افشین کے لیے رشتے کی تلاش شروع کردی۔ میری کوشش یہی تھی کہ میں ریحان کی شادی سے پہلے افشین کی شادی کردوں تاکہ ریحانہ یا ریحان یہ نہ سمجھیں کہ ہم اب بھی ریحان کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

رشتے کروانے والی ایک عورت نے ایک رشتہ بتایا کہ لڑکا ملک سے باہر رہتا ہے' ڈیفنس میں اپنی کوٹھی ہے' فیملی بھی چھوٹی سی ہے۔ بس دو ہی بہن بھائی ہیں۔ لڑکا شادی کے بعد افشین کو باہر لے جائے گا۔

میں نے اس رشتے کا ذکر رحمان سے کیا تو ان کا دل کچھ مطمئن نہیں ہوا اور انہوں نے کہا کہ ابھی مجھے سوچنے کا موقعہ دو۔ میں نے کہا سوچنا کیا ہے سب کچھ تو سامنے ہی ہے' میں لڑکے کے گھر بھی ہو آئی ہوں' کوٹھی بہت بڑی تھی۔ میں نے جھٹ ہاں کردی کیوں کہ مجھے پتا چلا کہ ریحانہ نے ریحان کی منگنی بڑی دھوم دھام سے کردی ہے' میں نے جھٹ شادی کی تاریخ طے کردی۔

رحمان اس رشتے سے خوش نہیں تھے' انہیں لوگ پسند نہیں آئے تھے' جس رات میں نے شادی کی تاریخ دی' اسی رات رحمان کو دوسرا اٹیک ہوا' انہیں اسپتال لے جایا گیا۔

تین دن اسپتال میں داخل رہے' وہیں تیسرا جان لیوا اٹیک ہوا اور وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے۔

رحمان کے انتقال والے دن سلمان' ریحانہ اور ریحان بھی آئے اور مجھ سے تعزیت کر کے چلے گئے پھر سوئم والے دن آئے اور پھر ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔

رحمان کے انتقال کی وجہ سے میں نے سوچا کہ شادی کی تاریخ تھوڑی آگے بڑھا دی جائے لیکن اس کے سسرال والے نہیں مانے کہ ہمارے بیٹے کو پھر چھٹی ایک سال بعد ملے گی' اس لیے میں نے رحمان کے چالیسویں کے فوراً بعد افشین کی شادی کردی' شادی سادگی سے ہوئی اور میں اپنے وہ ارمان نہ نکال سکی' جن کے میں نے خواب دیکھے تھے۔

کچھ مہینوں کے بعد ریحان کی شادی بھی ہوگئی۔ میں نے اپنے بیٹوں کی بھی شادی کردی' اتفاق دیکھیں کہ میری بڑی بہو کا مزاج بالکل افشین کی طرح تھا۔ میں اس کو روکتی ٹوکتی تو بیٹے اور بہو دونوں کو برا لگتا اور ایک دن میرے بیٹے نے اچانک کہا۔

''امی! ہم لوگ اپنا علیحدہ گھر بنا رہے ہیں۔ میں نے پلاٹ پر گھر بنوالیا ہے' تھوڑے ہی عرصہ میں مکمل ہوجائے گا تو ہم اس میں شفٹ ہوجائیں گے۔''

بیٹے کے منہ سے علیحدگی کا سن کر میں سناٹے میں رہ گئی' میں نے تو یہ بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ ایاز کی پہلوٹی کی اولاد بیٹی تھی اور مجھے اس سے بے حد محبت تھی۔ ایاز اگر دوسرے مکان میں شفٹ ہوجائے گا تو روشنی میری پوتی بھی میری آنکھوں سے اوجھل ہوجائے گی۔ میں کسی طرح اس کے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔

''مکان بن گیا ہے......! مگر تم نے آج سے پہلے تو کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''ایک سال پہلے پلاٹ لیا تھا پھر بنوانا شروع کردیا' دراصل شہنیلا کی خواہش تھی کہ ہمارا اپنا گھر ہو۔'' ایاز نے کہا۔

''تو بیٹا یہ بھی تو تمہارا اپنا ہی گھر ہے' میں کیا اسے قبر میں ساتھ لے کر جاؤں گی اور پھر تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ گے تو میں روشنی کے بغیر کیسے رہوں گی' اس میں تو میری جان ہے۔'' میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''ہنہہ۔ جان ہے......'' شہنیلا نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اس گھر سے جانے کی اصل وجہ یہی ہے کہ میں اپنی بیٹی روشنی کو آپ کے سائے سے بھی دور رکھنا چاہتی ہوں۔ آپ نے جیسے افشین کے ساتھ لاڈ پیار کر کے اسے بگاڑ کر دو کوڑی کا کردیا ہے' میری بیٹی کو بھی ایسا ہی بنادیں گی' میں اپنی بیٹی کی تربیت خود کروں گی۔''

اور میں اپنا سا منہ لے کر اپنے کمرے میں آ گئی اور چپ چاپ لیٹ گئی۔ میرے دل کو شدید صدمہ پہنچا تھا لیکن میں چاہے کچھ بھی کرلیتی انہیں جانے سے روک نہیں سکتی تھی۔

شام کو جب عمیر اور زبیر کو ایاز کے مکان بنوانے والی بات کا پتا چلا تو انہوں نے خاصا ہنگامہ برپا کیا کہ بھائی نے چوری چھپے روپے کا غبن کیا اور اپنا ذاتی مکان بنوالیا' ہم لوگ احمق ہیں کیا دن رات محنت کریں اور بھائی سارا مال لے اڑیں۔

ابھی یہ ہنگامہ نہیں تھما تھا کہ افشین روتی پیٹتی چلی آئی۔ پتا چلا کہ اس کے شوہر کی نوکری چھوٹ گئی ہے' مزید یہ بھی پتا چلا کہ وہ کوئی خاص تعلیم یافتہ بھی نہیں ہے' نوکری بھی معمولی تھی۔ کوٹھی ان کے ایک رشتے دار کی ہے جو امریکہ میں رہتے تھے' ان لوگوں کو یہاں اس لیے چھوڑ گئے تھے کہ کوٹھی کوئی خالی سمجھ کر قبضہ نہ کرلے' ان کا اپنا تو معمولی سا بھی مکان نہیں ہے۔ وہ لوگ کوٹھی سے نکل کر کرائے کے مکان میں آ گئے تھے' گھر میں پیسہ بھی نہیں تھا' اب ریاض اس کے شوہر نے اسے یہ کہہ بھیجا تھا کہ تمہارے بھائیوں کے پاس تو بہت پیسہ ہے تم جا کر ان سے کچھ رقم لے آؤ۔

میں تو پہلے ہی پریشان بیٹھی تھی' اوپر سے افشین نے آ کر یہ سب بتایا تو میرا دماغ چکرانے لگا' ایک صدمے پر دوسرا صدمہ...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوگیا۔

بیٹوں کو معلوم ہوا تو وہ بہت چراغ پا ہوئے کہ ابھی جا کر ریاض کا دماغ ٹھکانے لگاتے ہیں' میں نے ہی انہیں منع کردیا کہ اب جھگڑا کرنے سے کیا حاصل' جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔

حیرت انگیز طور پر افشین نے بھی ہائے ویلا نہیں مچایا' ریحان سے رشتہ ٹوٹنے کے بعد وہ چپ سی ہوگئی

تھی شاید اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا اور پچھتاوا بھی۔ ہم نے اس روز تو افشین کو کچھ رقم دے دلا کر رخصت کر دیا لیکن وہ آئے دن پیسے مانگنے کے لیے آنے لگی اب بھائیوں نے رقم دینے سے صاف انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اپنے شوہر سے کہو کہ ملازمت نہیں ملتی تو محنت مزدوری ہی کرلو۔

میری پھولوں جیسی افشین کا بہت بُرا حال ہوگیا تھا کہاں تو وہ اپنے لباس پر ایک شکن بھی برداشت نہیں کرتی تھی اور کہاں یہ حال کہ کتنے کتنے دن کپڑے بدلنے یاد نہیں رہتے تھے غربت کے اس حال میں رہتے ہوئے افشین نے ایک بیٹی بھی پیدا کرلی بچی کی پیدائش کے اخراجات بھی میں نے اٹھائے۔ گلاب کی مانند تروتازہ افشین چنبیلی کا مرجھایا ہوا پھول دکھائی دیتی تھی۔

ایاز اپنے نئے بنگلے میں چلا گیا تھا۔ میں تنہا ہوگئی تھی تو سوچا کہ عمیر کی شادی کردوں میں اس کے لیے لڑکی تلاش کرنے لگی۔

اسی دوران خاندان میں ایک شادی میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں میرا سامنا ریحانہ اور اس کی بہو سے ہوگیا۔ ریحانہ خود میرے قریب آئی اور مجھ سے بات کرنے لگی اس کی بہو بھی پاس ہی بیٹھی رہی ریحانہ کو شاید ہمارے حالات کی اچھی طرح سے خبر تھی اس لیے وہ کرید کرید کر مجھ سے ساری باتیں پوچھتی رہی میں نے افشین اور اس کے حالات کا ذکر کرنے سے گریز کیا۔ مگر اس نے خود ہی بات نکال لی اسے سب معلوم تھا پھر کہنے لگی۔

"میری بہو مہروز کے قدم بڑے لکی ہیں۔ جب سے یہ شادی ہوکر ہمارے گھر آئی ہے ریحان کا بزنس کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اس کے بعد فرحان پیدا ہوا تو ریحان کو بڑے بڑے کنٹریکٹ ملنے لگے اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مہروز کو میری بہو بنایا۔"

ریحانہ کی باتوں نے میرے زخموں پر نمک کا کام کیا۔ شادی میں یہ سوچ کر گئی تھی کہ عمیر کے لیے لڑکی دیکھوں گی مگر ریحانہ سے حسد کرتی لوٹ آئی۔

اب دن رات اٹھتے بیٹھتے میں انگاروں پہ لوٹنے لگی۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر غصہ آتا تھا کہ میری بیٹی تو غربت وافلاس کی چکی میں پس رہی ہے لیکن ریحان کی بیوی کتنا عیش کر رہی ہے۔ کاش وہ بھی میری بیٹی کی طرح پیسے پیسے کو ترس جائے۔

میں دن رات جلتی اور کڑھتی رہتی ایک دن مجھے بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ ریحان تو میری افشین کا نصیب تھا پھر مہروز کو ریحان کے گھر میں عیش کرنے کا کیا حق ہے کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ریحان مہروز کو طلاق دے دے اور افشین سے شادی کرے پھر خیال آیا کہ اس کام کے لیے افشین کا بھی بیوہ یا طلاق یافتہ ہونا ضروری ہے اب یہ کام ہو تو کیسے ہو......؟

اب میرا دماغ اسی اُدھیڑ بن میں لگا رہتا۔ اتفاق سے میری ملازمہ اسی روز خاصی دیر سے کام کرنے کے لیے آئی میں نے دیر سے آنے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ کسی بابا کے پاس گئی تھی تعویز لینے کے لیے میں نے پوچھا کہ تعویز کس کے لیے لینے گئی تھی تو اس نے بتایا کہ میرا داماد میری بیٹی کو بہت تنگ کرتا ہے مارتا پیٹتا ہے کام کاج بھی نہیں کرتا اور بٹی جو کچھ گھروں میں کام کرکے کماتی ہے زبردستی چھین لیتا ہے۔

"تو کیا تعویز سے تیرا داماد سدھر جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں بیگم صاحب! سنا تو ہے کہ بابا کی دعاؤں اور تعویزوں میں بڑا اثر ہوتا ہے۔ میں نے بہت سے لوگوں کے کام بنتے دیکھے ہیں۔" اس نے خاصے اعتماد سے کہا۔

اس کی باتیں سن کر میرے ذہن میں روشنی کا جھماکا ہوا اور میں نے کہا۔

"زبیدہ کیا تم مجھے ان بابا کے ہاں لے جاؤ گی۔"

"ہاں بیگم صاحبہ! کیوں نہیں جی! ضرور لے جاؤں گی آپ لوگ تو بابا کو نذرانہ بھی آسانی سے دے سکتے ہو مصیبت تو ہم غریبوں کی آتی ہے۔" اس نے کہا۔

"نذرانہ......؟ نذرانہ کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ جی وہ تعویز کا ہدیہ لیتے ہیں۔ بڑے بابا جی ان کے استاد ہیں۔ ان کے مزار پر دیگیں چڑھانی ہوتی ہیں۔ نیاز فاتحہ کرنی ہوتی ہے اسی واسطے جی!"

"اچھا اچھا سمجھ گئی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن وہ کتنا ہدیہ لیتے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"جیسا کام ویسا ہدیہ! ویسے مجھ سے تو ایک تعویز کا ایک سو روپیہ لیا تھا اب تین دن کے بعد بلایا ہے۔" زبیدہ نے کہا۔

پھر میں نے زبیدہ کو فوراً اپنے ساتھ لیا اور اس کے بابا کے آستانے پر پہنچ گئی۔ میں نے بابا کو اپنا وہی مسئلہ بتایا جو زبیدہ نے اپنے داماد کا بتایا تھا بابا نے میری ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے مجھ سے پانچ سو روپے لیے اور تین تعویز میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"ایک تعویز اس کے تکیے میں سی دینا ایک گھول کر پلا دینا اور ایک تعویز تمہاری بیٹی اپنے بازو پر باندھ لے۔"

میں تعویز لے کر سیدھی افشین کے گھر گئی اور تعویز دے کر بابا جی کی ہدایات بھی بتائیں۔ افشین پڑھی لکھی لڑکی تھی اس نے کہا۔

"امی! اگر ان باباؤں کے تعویز سے لوگ سدھرنے لگیں تو اس دنیا میں کوئی انسان خراب نہ ہو کیوں کہ بُرے لوگوں کے گھر والے خود ان سے پریشان رہتے ہیں۔ میرا تو نصیب ہی بُرا ہے جب ہی تو میری ریاض سے شادی ہوئی ہے ورنہ اچھے نصیب ہوتے تو آج میں ریحان کے گھر میں عیش کر رہی ہوتی۔ یہ سب آپ کی جلد بازی کی وجہ سے ہوا ہے۔ کاش اس وقت آپ نے کچھ سمجھ بوجھ سے کام لیا ہوتا یا کم از کم ڈیڈی کی بات مان لی ہوتی تو آج میرا یہ حال نہیں ہوتا۔"

میں افشین کے الزامات سُن کر رونے لگی کہ تم بھی مجھے ہی الزام دے رہی ہو۔ میں نے تمہارے لیے اچھا ہی سوچا تھا۔ میرے رونے سے افشین مجھ سے معافی مانگنے لگی اور تعویز لے لیے۔

میں بابا کے پاس جاتی رہی۔ پیسے خرچ کرتی رہی تعویز لاتی رہی لیکن ریاض کی حالت میں ذرہ برابر تبدیلی نہیں آئی بلکہ بے روزگاری کی وجہ سے وہ مزید چڑچڑا ہوگیا۔

اس بابا سے عاجز آکر میں دوسرے بابا کے پاس گئی پھر تیسرے اور پھر چوتھے...... بابا تبدیل ہوتے رہے لیکن فائدہ نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ کسی کرامات والے پہنچے ہوئے بابا کی تلاش بالآخر مجھے ایک ایسے دروازے پر لے گئی۔ جس نے اپنے شیطانی عمل کے ذریعے میری شیطانی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا وعدہ کرلیا۔

وہ کالے علم کا ماہر ایک بنگالی ہندو تھا۔ جس کی شکل سے ہی خباثت ٹپک رہی تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں سرخ موٹی موٹی آنکھیں جو بات کرتے ہوئے حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ قریب ہی انسانی کھوپڑی اور چند ہڈیاں رکھی تھیں۔ اس کی کوٹھری کی دیواریں سیاہ رنگ سے پینٹ کی ہوئی تھیں۔ کھڑکی اور دروازے پر سیاہ پردے لٹک

رہے تھے۔ ایک تغاری میں کوئلے دہک رہے تھے۔ جس میں کوئی بدبودار چیز جل رہی تھی۔ جس کی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں بی بی تو بہت پریشان ہے۔ بیٹی کا حال تجھ سے دیکھا نہیں جاتا اور کسی اور کو تو خوش نہیں دیکھ سکتی۔ یہی چاہتی ہے ناں کہ تیری بیٹی اس گھر میں عیش کرے......!“

بابا نے پاٹ دار آواز میں کہا تو میں روتے ہوئے اس کے قدموں میں جھک گئی۔ میں بابا کی کرامت کی معتقد ہوگئی تھی کہ انہوں نے میرے بنا ایک بھی لفظ کہے میری خواہش جان لی۔

”سیدھی ہو کر بیٹھ جا بی بی اور اپنی خواہش کا کھل کر اظہار کر......!“ بابا نے کہا تو میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے آنسو صاف کر کے اپنے دل کی خواہش بیان کردی۔

”میں چاہتی ہوں بابا صاحب کہ میری بیٹی کی شادی اس کے بچپن کے منگیتر سے ہوجائے‘ یہ منگنی میں نے غصے میں آ کر توڑ ڈالی تھی اور اپنی بیٹی کی شادی دوسری جگہ کردی۔ میری دیورانی نے بھی اپنے بیٹے کی شادی کردی مگر جیسا میں اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتی تھی ویسا نہیں ہوسکا‘ میری بیٹی انتہائی دکھ میں زندگی گزار رہی ہے جب کہ میری بیٹی کا سابقہ منگیتر بہت خوش حال ہے اور اپنی بیوی کو عیش کروا رہا ہے۔“

”تو اب تُو کیا چاہتی ہے‘ تیری بیٹی کا شوہر بھی زندہ ہے اور اس کے منگیتر کی بیوی بھی موجود ہے۔“ بابا نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں نکال کر پاٹ دار آواز میں کہا۔

”بابا کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میرا داماد بھی میری بیٹی کو طلاق دے دے اور اس کا منگیتر بھی اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور پھر ان دونوں کی شادی ہوجائے اور ہاں بابا میری بیٹی کی ایک بیٹی بھی ہے‘ میں چاہتی ہوں اسے میرا داماد اپنے پاس ہی رکھے اور ریحان بھی اپنا بیٹا اپنی بیوی کو دے کر فارغ کردے......!“ میرے شیطانی دماغ نے اپنی شیطانی خواہش اگل دی۔

”بالکل ایسا ہی ہوگا جیسا تُو چاہتی ہے‘ ہم ایسا عمل کریں گے کہ ہر کام تیری منشا کے مطابق ہی ہوگا‘ میرے عمل کی کاٹ بھی ممکن نہیں ہے۔ میرا ڈسا تو پانی بھی نہیں مانگتا‘ تُو کہے تو تیرے دشمنوں کو ہمیشہ کی نیند سلا دوں۔“ بابا نے کہا۔

”نہیں نہیں بابا! میں کسی کو مارنا نہیں چاہتی‘ بس اتنا چاہتی ہوں کہ ان دونوں میں طلاق ہوجائے اور پھر یہ آپس میں شادیاں کرلیں۔ ویسے میری دیورانی کے گھر سے میرے تعلقات خراب ہیں۔ آپ کو ایسا بھی کچھ کرنا ہوگا کہ میری دیورانی خود چل کر میرے گھر آئے اور افشین کا رشتہ مانگے۔“ میں نے بابا کے غلیظ پیروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

”ایسا ہی ہوگا‘ لیکن ایک بات اچھی طرح کان کھول کر سن لے‘ ان سارے کاموں کا معاوضہ اچھا خاصا ہوگا۔ مجھے کئی عمل کرنے پڑیں گے۔ ایک تیری بیٹی کی طلاق کا‘ دوسرا ریحان کی طلاق کا‘ تیسرا تیری دیورانی کا تیرے گھر آ کر رشتہ مانگنے کا اور چوتھا اور آخری ان دونوں کی شادی کا......!“ بابا نے کہا۔

”بڑی مہربانی بابا بڑی مہربانی......!“ میں نے ایک بار پھر بابا کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ ”آپ معاوضہ بتائیں میں ہر معاوضہ دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”پانچ لاکھ......“ بابا نے سرگوشی والے لہجے میں کہا۔

”پانچ لاکھ......؟“ میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے‘ ہم نے کوئی تجھ سے تیری فیکٹریاں اور تیرا گھر تھوڑی مانگ لیا ہے‘ اتنی رقم تو تُو آسانی سے دے سکتی ہے“ بابا نے ایک شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”میرے پاس تو ڈیڑھ دو لاکھ روپے ہی ہوں گے‘ بچوں سے مانگے تو وہ پوچھیں گے تو میں کیا جواب دوں گی۔“ میں نے کہا۔

”روپیہ نہیں ہے تو تیرے پاس سونے کا زیور تو ہوگا؟“

”ٹھیک ہے بابا! میں آپ کو زیور لا کر دے دوں گی‘ بس آپ میرا کام پکا کردیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں!“ بابا نے زوردار آواز میں کہا تو میں چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”ہمیں زیور نہیں چاہیے‘ زیور تو سنار کے پاس جا کر خود بیچ اور ہمیں نقد رقم لا کر دے ہم کسی سے روپے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں لیتے‘ اتنی رقم کا مطالبہ بھی اس لیے کیا ہے کہ ہمیں بہت سخت عمل کرنا ہے‘ کتنی راتیں چاند کی آخری اندھیری راتوں میں قبرستان میں ایک پرانی قبر میں بیٹھ کر عمل کرنا ہوگا اور ہاں ایک عمل ہم تجھے بھی بتائیں گے‘ وہ تجھے ہی کرنا ہوگا۔“ بابا نے جب مجھ سے عمل کرنے کے لیے کہا تو میں گھبرا گئی تو بابا نے کہا۔ ”گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے‘ ہم تجھ سے قبرستان میں عمل نہیں کروائیں گے‘ یہ عمل تجھے اپنے گھر میں بیٹھ کر کرنا ہوگا لیکن ایک بات کا خیال رہے‘ یہ عمل سات راتوں کا ہوگا اور ان سات راتوں اور دنوں میں تو گوشت نہیں کھائے گی‘ نہ نہائے گی‘ نہ وضو کرے گی بلکہ منہ ہاتھ بھی نہیں دھوئے گی‘ نہ کپڑے تبدیل کرے گی اور نہ نماز اور قرآن کی طرف جائے گی بلکہ اللہ کا نام بھی تیری زبان سے نہ نکلے ورنہ میرا سارا عمل برباد ہوجائے گا اور ہوسکتا ہے کہ تیری بیٹی ہی مرجائے......!“

بابا کی ہدایات کا سن کر لمحہ بھر کو میرے قدم کانپے لیکن پھر شیطان نے مجھے اکسایا کہ کیا ہوا ایک ہفتے تک اللہ کا نام زبان پر نہیں لاؤں گی تو قیامت تھوڑی آجائے گی‘ ایک مرتبہ میری بیٹی ریحان کے گھر میں آباد ہوجائے تو میں شکرانے کے نفل پڑھوں گی۔

”ٹھیک ہے بابا! میں ایسا ہی کروں گی جیسا آپ نے کہا ہے۔ آپ مجھے وہ عمل بتادیں۔“ میں نے کہا۔

”ایسے کیسے عمل بتادوں‘ پہلے تو رقم لا کر میرے ہاتھ پر رکھ‘ مجھے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے جو پیسے سے آتی ہیں اور ابھی تو آدھا چاند ہوا ہے۔ عمل میں ایک ہفتے کے بعد شروع کروں گا اور تو بھی جب ہی عمل کرنا۔“ بابا نے سخت لہجے میں کہا۔

”ٹھیک ہے بابا! میں جاتی ہوں اور ایک دو دنوں میں آپ کی مطلوبہ رقم لے کر حاضر ہوجاؤں گی۔“ میں نے کہا اور الٹے قدموں چلتی ہوئی بابا کی سیاہ اور تاریک کٹیا سے باہر نکل آئی۔

گھر آئی تو میں بہت خوش اور مطمئن تھی‘ میں افشین کا مستقبل دیکھ رہی تھی جہاں وہ خوش باش مجھے چلتی ہوئی ہنستی مسکراتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ریحان کی بیوی مہروز کا تصور آتا تو میرا بس نہیں چلتا کہ میں خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ریحان کی زندگی سے نکال دوں۔

میں نے اپنے سارے پیسے اکٹھے کیے جو گھر میں مختلف جگہوں پر رکھے تھے جو کچھ بھی بینک میں تھے وہ بھی نکال لیے‘ میرے پاس بہ مشکل پونے دو لاکھ روپے ہوئے پھر میں نے اپنا سارا زیور نکالا صرف ایک سونے کی ہلکی سی چین کانوں میں بالیاں رہنے دیں اور سب لے کر سنار کے پاس پہنچی‘ یہ وہی سنار تھا جس کی دکان سے آج تک میں زیور خریدتی چلی آئی تھی۔ میں نے جب اس سے زیور خریدنے کی بات کی تو اس نے حیرت سے پوچھا کہ خیریت تو ہے‘ آپ کو زیور بیچنے کی ضرورت کیسے پیش آ گئی‘ میں نے

کہا کہ کاروبار کے لیے رقم کی ضرورت ہے بعد میں سہولت ہوگی تو اور بنوالوں گی۔

سنار نے پرانی جان پہچان کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ٹھیک ٹھیک قیمت لگائی لیکن مطلوبہ رقم پوری نہ ہوئی تو میں نے کانوں سے بالیاں اور گلے سے چین اتار کر اس کے حوالے کردیں اور کہا کہ مجھے تین لاکھ پچیس ہزار کی ضرورت ہے سنار نے بہت کہہ سن کر مجھے تین لاکھ کی رقم دے دی اور پچیس ہزار روپے کے لیے مجھے اپنے بیٹے عمیر کی الماری سے چوری کرنی پڑی جس کا الزام زبیدہ پر آیا جسے مار پیٹ کر نوکری سے نکال دیا گیا۔

میں رقم لے کر بابا کے پاس پہنچی تو رقم دیکھ کر بابا کی آنکھوں میں شیطانی چمک آگئی اور اس نے جھپٹنے کے انداز میں میرے ہاتھ سے رقم لے لی۔

''بابا کام تو ہوجائے گا ناں......؟'' میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

''ابھی سے بے اعتباری......!'' وہ غرایا۔

''نہیں نہیں بابا میں تو بس ویسے ہی......!'' میں منمنائی۔

''جس دن عمل کے سات دن پورے ہوں گے اس روز دونوں کو طلاق ہوگی اور خوش خبری سن کر تو خود دوڑی دوڑی چلی آئے گی۔ میرا کام پکا اور کھرا ہوتا ہے اگر ہم پر اب بھی کوئی شک ہے تو جا اپنی رقم واپس لے جا......!'' بابا نے مجھے ڈانٹ کر حقارت سے کہا۔

''مجھے معاف کردیں بابا! آئندہ میری توبہ جو میں ایسا سوچوں بھی۔'' میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ اس روز پیر کا دن تھا' بابا نے کہا۔

''کل منگل ہے اور ہمارا عمل کل رات سے شروع ہوگا' میری ہدایات یاد ہیں ناں۔ سختی کے ساتھ ان کی پابندی کرنی ہوگی' بس ایک بات یاد رکھنا' اگر تو نے اللہ کا نام بھی منہ سے نکالا تو میرا عمل تو بھرشٹ ہوگا ہی' تیرا حشر بھی برا ہوگا۔''

''آپ بے فکر رہیں بابا! میں ہر بات یاد رکھوں گی۔'' میں نے صدق دل سے کہا۔

پھر بابا نے کچھ عجیب و غریب الفاظ مجھے بتائے کہ جن کا جاپ مجھے مسلسل کرنا تھا اور اذان فجر سے آدھے گھنٹے قبل عمل ختم کردینا تھا۔

میں گھر لوٹ آئی اور جیسا بابا نے بتایا تھا میں نے ویسا ہی کیا۔ ان دنوں میرے چہرے پر عجیب سی وحشت برس رہی تھی۔ میرے بیٹے میری جانب دیکھتے تو بار بار پوچھتے۔

''امی آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے' آپ کا چہرہ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' اور میں بہانہ بنادیتی کہ رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آتی۔

سات دنوں کا مشکل عمل ختم ہوا۔ میں صبح سو کر اٹھی تو سارے جسم میں عجیب سی خارش محسوس ہورہی تھی۔ میں یہ سمجھی کہ اتنے دن پانی سے دور رہی ہوں شاید یہ اس لیے ایسا ہورہا ہے۔ اگلے دن مجھے وہ خوش خبری مل گئی جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا' افشین رات کو روتی پیٹتی ہوئی گھر آئی اور بتایا کہ ریاض نے اسے طلاق دے کر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا ہے اور بچی بھی اپنے پاس رکھ لی ہے۔

یہ سن کر میرا دل چاہا کہ مارے خوشی کے ناچنے لگوں لیکن اوپری طور پر افشین کے ساتھ روتی رہی اور گلے لگا کر تسلی دیتی رہی۔

اب مجھے بے چینی ہورہی تھی کہ کسی طرح مجھے ریحان کی خبر مل جائے کہ اس نے بھی اپنی بیوی کو طلاق دی یا نہیں۔

اتفاق سے میرے پاس میری نند کا فون آیا تو اس نے مجھے بتایا کہ ریحان نے مہروز کو طلاق دے دی ہے' اچانک ہی دونوں میں ایک معمولی بات پر جھگڑا ہوا اور ریحان نے مہروز کو طلاق دے دی۔ مہروز نے روتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو اپنے ساتھ لے جائے گی تو ریحان نے کہا وہ خوشی سے لے جاسکتی ہے' اسے کسی ایسی چیز سے دلچسپی نہیں ہے جس سے مہروز کی کوئی یاد وابستہ ہو۔ یہ خبر سن کر میرا دل بلیوں اچھلنے لگا لیکن میں اپنی خوشی چھپا گئی اور افسوس کا اظہار کیا اور افشین کے اجڑ کر گھر واپس آنے کی خبر دی۔

''ہائے میرے اللہ! بھابی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں' خدا غارت کرے کسی حاسد دشمن نے تو کوئی جادو ٹونہ نہیں کروایا کہ میرے دونوں بھائیوں کے بچوں کے گھر اجڑ گئے۔'' راحیلہ میری نند فون پر ہی رونے لگی اور میں خاموش ہوگئی۔

رفتہ رفتہ یہ بات سارے خاندان میں مشہور ہوگئی کہ دونوں کے یہ کام ایک ہی دن میں ہوئے' افسوس کرنے کے لیے ہر آنے والے کی زبان پر ایک ہی فقرہ تھا۔

''آپ کے کسی حاسد نے یہ کام کروایا ہے ورنہ ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک ہی دن دونوں کو طلاق ہو۔'' میں بے چاری بن کر دوسروں کی ہمدردیاں سمیٹتی رہی' لوگوں کے آگے روتی رہی۔

میں وعدے کے مطابق بابا کے پاس پہنچی اور خوشی خوشی بتایا کہ کام ہوگیا ہے' تب بابا نے کہا کہ دو چار دنوں کے بعد تیری دیورانی تیرے گھر آئے گی اور تجھ سے معافی مانگے گی' ریحان بھی آئے گا۔

اور ایسا ہی ہوا' اس واقعے کے ایک ہفتہ کے بعد ریحانہ میرے گھر آگئی اور ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگنے لگی۔

''یہ سب میری وجہ سے ہوا' میں نے وقتی طور پر غصے میں آکر ریحان اور افشین کا رشتہ توڑ دیا' ہمارے بچے تو ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے' ہم نے اپنے بچوں کے ساتھ ظلم کیا' انہیں اپنی پسند کے بجائے کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے مجبور کیا اور اب دیکھو آخر ان کی شادی کا کیا انجام ہوا۔ دونوں کے گھر ایک ساتھ ہی ٹوٹ گئے' بعض دفعہ تو بھابی مجھے خیال آتا ہے کہ ہمارے کسی حاسد نے یہ کام کروایا ہے' آج کل تو ایسے ایسے کالے جادو اور سفلی عمل کرنے والے لوگ شیطان بن کر بیٹھے ہیں کہ انسان کا دماغ اس کے قابو میں ہی نہیں رہتا اور شوہر کے منہ سے وہ قبیح الفاظ نکل ہی جاتے ہیں جو بیوی اور شوہر کو جدا کردیتے ہیں' اللہ غارت کرے اسے...... اگر کسی نے یہ شیطانی کام کروایا ہے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو ریحانہ! مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ ہمارے کسی حاسد نے یہ کام کروایا ہے لیکن جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا' ہم کسی کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ بگڑا تو میرا ہے' میری بیٹی اجڑ کر اپنے گھر آکر بیٹھ گئی ہے اور تو اور اس ظالم نے بچی بھی چھین کر اپنے پاس رکھ لی۔'' میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

''میں بھی حیران ہوں کہ ریحان کو نجانے اس روز کیا ہوگیا تھا' وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کا ہے' اس دن اتنی معلولی سی بات پر آپے سے باہر ہوگیا اور غصے میں طلاق دے دی۔'' ریحانہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

ریحانہ کی بات کے جواب میں' میں بالکل خاموش رہی' بس روتی صورت بنائے بیٹھی رہی' تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد ریحانہ کی آواز ابھری۔

''شیرین بھابی......!'' اس نے بہت دھیمے لہجے میں پکارا۔

''ہوں...... ہاں!'' میں نے چونک کر سر اٹھایا۔

''میں ایک بات سوچ رہی ہوں اگر آپ برا نہ

مانیں تو کہوں۔" اس نے لجاجت سے کہا۔
میرے دماغ میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں اور میں سمجھ گئی کہ وہ مجھ سے کیا بات کرنے والی ہے' ایک اسی بات کو سننے کے لیے تو میں نے یہ سب کیا تھا۔
"میں سوچ رہی ہوں بھابی! کہ کہیں قدرت نے ہمارے بچوں کے لیے کوئی اور فیصلہ تو نہیں کرلیا۔ اب دیکھیں ناں' ہم نے یہ فیصلہ اسی وقت کرلیا تھا جب افشین صرف ایک دو ماہ ہی کی تھی کہ ہم اپنے بچوں کی شادیاں آپس میں کریں گے لیکن نہ جانے ایسا کیا ہوا کہ ہمارے دل ایک دوسرے سے بُرے ہوگئے اور ہم نے بچپن کی منگنی ختم کردی' شاید اللہ تعالیٰ نے ان کا جوڑ لکھا ہی تھا' اسی لیے ان کی علیحدگی ہوگئی تو میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ ہمیں اپنی اپنی غلطیاں سدھارنے کا ایک موقع اور ملا ہے' کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم ان کی شادی کردیں۔ ان کے گھر بھی بس جائیں گے اور ہم بھی سکون سے مرسکیں گے' بھائی صاحب تو رہے نہیں' موت زندگی کا کوئی بھروسا تو ہے نہیں آج کل کون بھائی بھاوج اجڑی بیٹی کو گھر میں رکھنا پسند کرتے ہیں۔ افشین ابھی تو جوان ہے' آپ کہیں نہ کہیں تو اس کی شادی کریں گی تو پھر ریحان سے کیوں نہیں۔"
میرے لبوں پر ریحانہ کی بات سن کر مسکراہٹ آ گئی لیکن میں نے فوری طور پر اسے ہاں کا جواب نہیں دیا اور کہا۔
"ریحانہ! مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے اس طرح سے سوچا۔ تمہاری اس بات کا مطلب یہی ہوسکتا ہے کہ تم آج بھی افشین سے اتنی ہی محبت کرتی ہو جتنی پہلے کرتی تھیں۔ مجھے اس بات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں آج رات ہی افشین سے اور اپنے بیٹوں سے بات کرکے تمہیں فون کردوں گی اور ویسے بھی ابھی تو افشین کو اپنی عدت پوری کرنا ہے' شادی تو عدت گزارنے کے بعد ہی ہوسکتی ہے۔"
"بالکل بھابی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہ بات تو میں بھی جانتی ہوں کہ عدت سے پہلے نکاح نہیں ہوسکتا۔ بس میرا خیال تھا جو میں نے آپ پر ظاہر کردیا' آپ اطمینان سے سب سے بات کرلیں۔ میں بھی ریحان اور سلمان سے بات کرلوں گی۔"
ریحانہ کے جانے کے بعد میں سیدھی بابا کے پاس پہنچی اور جاتے ہی میں نے اپنا سر بابا کے قدموں میں رکھ دیا' مارے خوشی کے میرے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔
میں نے کہا تھا کہ افشین اور ریحان کی شادی طے ہوجائے گی تو میں شکرانے کے نفل پڑھوں گی لیکن اس شیطانی بابا کے بتائے ہوئے شیطانی عمل کا جاپ کرنے کے بعد میرے ذہن سے جیسے اللہ کا نام اور اس کے وجود کا احساس بالکل ہی مٹ گیا اور خوشی کے اظہار کے لیے میں نے اپنا شیطانی دماغ اس شیطانی بابا کے قدموں میں رکھ دیا۔
افشین اور میرے بیٹوں کو اس رشتے پر بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا' وہ لوگ راضی ہوگئے اور ہم نے افشین اور ریحان کی شادی کردی۔
شادی کے بعد صرف ایک ماہ دونوں بہت خوش رہے' پھر ان دونوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے ہونے لگے' معمولی معمولی باتوں پر دونوں ایک دوسرے کے سابقہ شوہر اور سابقہ بیوی کے طعنے دینے لگے ہر وقت جھنجلائے جھنجلائے رہنے لگے۔
ذہنی طور پر پریشان ریحان کی توجہ بزنس کی جانب سے ہٹنے لگی۔ سلمان کو ریحان کی حالت دیکھ کر دن رات ٹینشن رہنے لگی اور وہ بھی دل کا مریض ہوگیا اور پھر اس کا ہارٹ فیل ہوگیا۔
پریشان ذہن کا مالک ریحان نشے کی لعنت کا

شکار ہوگیا اور اس کا بزنس تیزی سے ڈاؤن ہونے لگا۔ افشین اور ریحان میں جھگڑے بڑھ گئے' اب ریحان بھی غصے میں افشین پر ہاتھ اٹھانے لگا۔ اِدھر میری یہ حالت ہوئی کہ میرے جسم پر ہر وقت خارش رہنے لگی اور تمام جسم پر چھوٹے چھوٹے سرخ رنگ کے دانے نکل آئے اور ان میں اتنی زیادہ جلن ہوتی' ایسا لگتا جیسے کوئی آگ کی سوئیاں چبھو رہا ہے' ہر طرح کے ڈاکٹر کو دکھالیا لیکن میری بیماری میں ذرا بھی افاقہ نہیں ہوا۔
ان ہی دنوں میرے دونوں جوان بیٹے ایک دن ایک ساتھ اپنی کار میں گھر واپس آرہے تھے کہ ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ عمیر تو موقع پر ہی ہلاک ہوگیا اور زبیر شدید زخمی ہوگیا' اس کی دونوں ٹانگوں کی ہڈیاں چکنا چُور ہوگئیں۔ وہ کئی ماہ تک اسپتال میں رہا' کئی آپریشن ہوئے مگر ٹانگیں نہ جڑ سکیں بالآخر اس کی ٹانگیں کاٹنی پڑیں اور میرا جوان بیٹا اپاہج ہوکر بستر پر آ گیا۔ کوٹھی بک گئی' کاروبار تباہ ہوگیا' جو تھوڑا بہت بچا اس پر بڑے بیٹے نے قبضہ کرلیا' وہ بیوی کے کہنے میں رہتا تھا جیسا وہ کہتی تھی وہ ویسا ہی کرتا تھا۔ میرے جسم میں خارش کا مرض لگ گیا تھا اس لیے بہو نے میرا داخلہ اپنے گھر میں بند کردیا تھا کہ میں اس کے گھر گئی تو ان لوگوں کو بھی میرا یہ گھناؤنا مرض لگ جائے گا۔
اُدھر ریحان کا کاروبار ختم ہوگیا۔ اُدھر میرا گھر برباد ہوگیا۔ ریحان اور افشین کی کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی' دونوں گھرانے بُری طرح تباہ و برباد ہوگئے۔
ریحانہ کے جسم پر بھی فالج کا حملہ ہوا اور وہ بستر کی ہوکر رہ گئی۔ ریحان دن رات نشے کی حالت میں رہتا تھا' وہ کچھ کماتا بھی نہیں تھا' ان کا بھی سب کچھ لٹ گیا۔ ریحانہ ہر وقت بستر پر پڑی پڑی افشین کو کوستی رہتی تھی کہ "تیرے قدم میرے گھر میں کیا آئے منحوس لڑکی کہ میرا ابھرا پُرا گھر تباہ ہوگیا۔ تُو منحوس ہے' پہلے' پہلے شوہر کو تباہ کیا اور اس سے طلاق لی۔ اب میرے بیٹے سے شادی کرکے اس کو تباہ کردیا' پتا نہیں میرے دماغ میں کون سا کیڑا کلبلایا تھا۔ جو میں نے تیرا رشتہ اپنے بیٹے سے کردیا۔"
سب کچھ برباد ہوگیا۔ جس بیٹی کو خوش اور آباد رکھنے کے لیے میں نے یہ عظیم گناہ کیا تھا۔ وہ بیٹی پہلے سے زیادہ بُرے حالوں میں جی رہی تھی۔
میں کفر میں مبتلا ہوئی تھی' جس کی سزا اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ دی کہ میں خارش جیسی گھناؤنی بیماری میں مبتلا ہوئی میری اولاد تباہ ہوگئی لیکن مجھے آج بھی حیرت ہوتی ہے کہ اللہ کا نام اب بھی میری زبان سے نہیں نکلتا تھا۔
اس روز میں صبح سے پریشان تھی۔ میرے جسم

زندگی کیا ہے؟

- زندگی ایک حادثہ ہے۔ جس میں کئی گاڑیاں آتی ہیں اور زندگی سے ٹکرا کر چلی جاتی ہیں۔
- زندگی ایک ڈرامہ ہے۔ جس میں ہر انسان اپنا کردار ادا کرتا ہے اور اپنے اچھے کردار ادا کرکے انعام لے جاتا ہے۔
- زندگی ایک قیمتی تحفہ ہے۔ اس لئے یہ بہترین تحفہ کسی کو قیمتی لمحات میں دینا چاہیئے۔
- زندگی ایک ایسی قیمتی چیز ہے جو قیمتی ہونے کے باوجود کسی کو بیچی نہیں جاسکتی اور نہ ہی خریدی جاسکتی ہے۔
- زندگی ایک خوب صورتی ہے اس لئے اس کی قدر کرنی چاہئے۔
- زندگی کچھ پانے اور کھونے کا نام ہے۔
- زندگی مسکراہٹوں کا نام ہے۔
- زندگی دکھ سہنے اور خوشی لٹانے کا نام ہے۔

(ریحانہ' چوتالہ' جہلم)

کے باریک باریک دانوں سے پانی سا نکل رہا تھا اور ان میں شدید جلن ہو رہی تھی۔ زبیر ابھی تک منہ پر چادر ڈالے سو رہا تھا۔ بارہ بج گئے تھے مگر وہ رات کا ایسا سویا کہ ابھی تک نہیں اٹھا تھا۔ میں اس کو جگانے آئی اور آوازیں دی مگر وہ نہیں اٹھا تو میں نے اس کے منہ سے چادر ہٹائی اور اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔

اس کا منہ عجیب سے انداز میں کھلا ہوا تھا اور باچھوں سے خون کی لکیر بہہ کر گردن تک آ گئی تھی، میں نے گھبرا کر اس کے دل پر ہاتھ رکھا، جہاں سکوت طاری تھا۔

میرا دماغ جیسے پاگل ہو گیا، میں بُری طرح چیختی چلاتی باہر گلی میں نکل آئی اور چیخ چیخ کر لوگوں کو بلانے لگی، محلے کے لوگ میری چیخ و پکار سن کر دوڑے ہوئے آئے، زبیر کو دیکھا اور کہہ دیا۔۔۔۔ "یہ مر چکا ہے۔۔۔۔!"

ذرا ہی دیر میں گھر لوگوں سے بھر گیا۔ میرے سامنے میرے دوسرے جوان بیٹے کی لاش پڑی تھی اور میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی، سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اچانک ہی نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا میں کہہ رہی تھی۔

"آؤ لوگو! دیکھو مجھے۔۔۔۔ میں وہ شیطانی عورت ہوں جس نے دو گھرانے تباہ کر ڈالے۔ پہلے میں نے اپنے حقیقی مالک کو بھلا دیا، میں نے شیطان کے آگے سر جھکایا، میں نے کالا جادو کروا کہ اپنی بیٹی کو طلاق دلوائی اور ریحان پر بھی کالا جادو کروایا تا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ میں ریحان کی بیوی کو عیش میں دیکھ کر حسد کا شکار ہو گئی تھی۔ میں نے اپنی بیٹی کی شادی اس سے کروائی، میرے کفر کی سزا اللہ نے یہ دی کہ میرے دونوں جوان بیٹے مر گئے بہو نے دھتکار دیا، میرا داماد نشئی ہو گیا ہے۔ مجھے یہ منحوس بیماری لگ گئی، میں نے کفر کیا۔ میں کافر ہو گئی۔۔۔۔ تم سب لوگ مجھ پر تھوکو۔۔۔۔ مجھ سے نفرت کرو۔۔۔۔ میں ہمدردی کے لائق نہیں ہوں۔۔۔۔ میں نفرت کے قابل ہوں۔۔۔۔"

میں چیخ چیخ کر اور بھی نہ جانے اور کیا کیا کہہ رہی تھی۔ میرے منہ سے اقرار گناہ سن کر سب عورتیں آپس میں باتیں کرنے لگیں۔ خاندان کی تمام عورتیں نفرت سے مجھے دیکھنے لگیں۔ خاص طور پر زبیدہ نے مجھ سے بہت زیادہ نفرت کا اظہار کیا، بڑا بیٹا سب کے سامنے کہہ گیا۔

"اس عورت سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔۔۔۔!"

زبیر کی تدفین کے بعد میں تنہا رہ گئی۔ سوائے افشین کے کوئی میرے پاس نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے بہت سی باتیں کیں، میں بھی رہ رہ کر اپنے کافرانہ عمل پر پچھتاوے اور پشیمانی کا شکار ہو رہی تھی، تب افشین نے مجھ سے کہا۔

"امی یہ اچھی بات ہے کہ آپ کو اپنے گناہ کا احساس ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا میں اس کی سزا بھی دے دی۔ اب آپ اللہ سے صدق دل سے توبہ کریں اور اس سے معافی مانگیں، وہ اللہ بہت رحیم اور کریم ہے، وہ سچے دل سے کی گئی توبہ کو ضرور قبول کرتا ہے اور اپنے بندے کو معاف کر دیتا ہے۔"

"کس سے معافی مانگوں۔۔۔۔!" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ اللہ کا نام کوئی بھولی بسری بات لگ رہا تھا۔

"اللہ تعالیٰ سے امی۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ سے۔۔۔۔" افشین نے بُری طرح روتے ہوئے کہا۔

"ال۔۔۔۔ ال۔۔۔۔ لا۔۔۔۔!" میرے منہ سے بڑی مشکل سے نکلا۔

"ہاں امی اللہ سے۔۔۔۔ اے میرے اللہ میری ماں پر رحم کر۔۔۔۔ شیطان نے اس کو ورغلا دیا تھا، یہ اولاد کی محبت میں تجھے بھول گئی تھیں۔" پھر وہ میرے گلے لگ کر زور زور سے رونے لگی اور روتے ہوئے بولی۔ "امی آپ کلمہ پڑھیں، اسلام قبول کریں، پتا نہیں اس شیطان نے آپ کے منہ سے کون کون سے کفر کے کلمات نکلوائے ہیں۔"

پھر افشین نے مجھے کلمہ پڑھایا۔۔۔۔ اور اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام میرے منہ سے نکلوایا، میں نے غسل کیا اور دوسرا لباس پہنا، پھر جائے نماز پر بیٹھی افشین نے مجھے نماز پڑھائی جو میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔

نماز پڑھ کر میں نے سجدے میں گر کر گڑگڑا کر اللہ سے اپنے کفر کی اپنے گناہ کی توبہ کی پھر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ نماز بھی اور قرآن بھی۔

میں قرآن پاک کی تلاوت کر کے اپنے اوپر دم کر لیتی تھی آہستہ آہستہ میری خارش ختم ہو گئی۔ بڑا بیٹا اپنی فیملی کے ساتھ امریکہ شفٹ ہو گیا۔ میرے پاس کھانے کے پیسے نہیں ہوتے گھر کا کرایہ کہاں سے دیتی۔ اس لیے افشین مجھے لے کر اپنے گھر آ گئی۔

ریحان نے بھی نشے کی لت چھوڑ دی ہے، وہ چھوٹی موٹی نوکری کرتا ہے، جس سے گھر کا خرچ بھی چلتا ہے اور ماں کا علاج بھی۔

ریحان اور ریحانہ دونوں ماں بیٹے میرے بُرے کرتوت کی وجہ سے مجھ سے شدید نفرت کرتے تھے اور بے زار رہتے تھے لیکن بہر حال یہ ان کی شرافت اور بڑائی تھی کہ میرا کوئی سہارا نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا ہے، میں دن رات اللہ سے توبہ استغفار کرتی ہوں۔ میں نے تو دنیا والوں اور اللہ کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار بھی کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی بھی مانگ لی ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ غفور الرحیم مجھے ضرور معاف فرما دے گا۔

میری کہانی پڑھنے والوں سے بھی میں یہ التجا کروں گی کہ وہ اللہ سے میرے لیے ضرور دعا کریں کہ وہ میرے اس عظیم گناہ کو معاف کر دے اور اپنے تمام بہن بھائیوں سے یہ التجا کروں گی کہ کوئی بھی بہن یا بھائی میری طرح یہ کفر کا کام نہ کرے، ورنہ اللہ کے ہاں تو جہنم کا عذاب بھگتنا ہی پڑے گا، دنیا میں بھی بہت سے عذابوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قارئین کرام! اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سب سے بڑی سورۃ سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۱۰۲ میں واضح طور پر ارشاد فرمایا ہے:

ترجمہ: "اور ان (ہزلیات) کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہد سلطنت میں شیاطین پڑھا کرتے تھے اور سلیمان نے مطلق کفر کی بات نہیں کی بلکہ شیاطین ہی کفر کرتے تھے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور ان باتوں کے بھی (پیچھے لگ گئے) جو شہر بابل میں دو فرشتوں (یعنی) ہاروت اور ماروت پر اتری تھیں اور وہ دونوں کسی کو کچھ نہیں سکھاتے تھے جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو (ذریعہ) آزمائش ہیں۔ تم کفر میں نہ پڑو۔ غرض لوگ ان سے ایسا (علم) سیکھتے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں اور اللہ کے حکم کے سوا وہ ایسے (علم) سے کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے تھے اور کچھ ایسا (علم) سیکھتے جو ان کو نقصان ہی پہنچاتے اور فائدہ کچھ نہ دیتے اور وہ جانتے تھے کہ جو شخص ایسی چیزوں کا خریدار ہوگا اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور جس چیز کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا وہ بُری تھی۔ کاش وہ (اس بات کو) جانتے۔"

بیٹی

محترم ایڈیٹر اور معزز قارئین
السلام علیکم!
اللہ تعالیٰ نے بیٹی کو رحمت قرار دیا ہے اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹیوں کی اچھی پرورش کرنے والے کو جنت میں اپنا پڑوسی قرار دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فی زمانہ لوگ بیٹیوں کو بوجھ اور زحمت سمجھتے ہیں اب تو ایسا لگتا ہے جیسے ہماری سوچ میں کوئی فرق نہیں آیا ہم آج بھی زمانہ جاہلیت میں سانس لے رہے ہیں۔

فاخرہ سلطانہ

غم و غصے سے اس کا برا حال تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو تہس نہس کر کے رکھ دے۔ سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالے کچھ دیر پہلے محسوس ہونے والی شدید بھوک بھی اب ایک دم سے غائب ہو چکی تھی۔ وہ شام کا کھانا تیار کر کے کچن سمیٹ رہی تھی۔ جب اس کے چھوٹے بھائی کے کچھ دوست آ گئے تو امی نے اسے اندر بھیج کر خود انہیں کھانا وغیرہ دیا اتنی دیر تک وہ کمرے میں چھوٹے موٹے کام نپٹاتی رہیں۔ اسے بہت تھکن کے ساتھ ساتھ شدید بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس کے دوستوں کے جانے کے انتظار میں تھی۔ تقریباً دو گھنٹے بعد وہ لوگ نکلے تو امی سب کچھ وہیں پر چھوڑ چھاڑ کر کمرے میں چلی گئیں۔ اس نے کچن میں جا کر اپنے لیے کھانا نکالنا چاہا۔ کچن کی حالت ابتر تھی۔ وہ جانے سے پہلے پورا کچن سمیٹ کر گئی تھی۔ مگر اب یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کچھ دیر پہلے تک جنگ ہوتی رہی ہو۔ ہر چیز تہس نہس ہوئی پڑی تھی اور کھانے کو بھی ایک نوالہ تک نہ دستیاب ہو سکا تھا۔ شدید دکھ اور غصے کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ ساتھ اپنی لاچاری پر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ جنہیں پینے کی کوشش میں اس کا حلق دکھنے لگا۔ گلے میں اٹکا آنسوؤں کا گولا اسے اس قدر زہریلا لگ رہا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ گولہ اس کے حلق کو کاٹ کے رکھ دے گا چیر ڈالے گا۔ ضبط کرتے کرتے بھی بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ جنہیں وہ ہاتھ سے مسلتی خود کو سنبھالتے ہوئے پھر سے کام میں لگ گئی۔ سب کچھ سمیٹنے کے بعد اس نے اپنے لیے ایک روٹی بنانے کے لیے چولہا جلایا اور آٹے کا پیڑا بیل کر توے پر ڈالا اور ساکت سی نظروں سے چولہے سے نکلتی نیلی اور زرد آنچ کو دیکھنے لگی۔ پھر یکایک اس نے چولہے کی آنچ بند کر کے ایک بار پھر گیس کھول دی۔ کافی دیر تک گیس خارج ہوتی رہی مگر اس کے جامد و ساکت وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد اس نے ماچس اٹھا کر تیلی جلائی چولہا زور سے بھڑک کر جل اٹھا اور اس کے اندر ابھری ایک امید دم توڑ گئی۔ حالات سے تنگ آ کر وہ خود کو اذیت دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ خود ہی کو تکلیفیں دے دے کر وہ انتقامی جذبوں کی تسکین کرنے کی کوشش کرتی رہتی۔ کیونکہ کسی اور پر تو اس کا بس چل نہ سکتا تھا۔

❖......☆......❖

اسے یاد تھا کہ زندگی میں اس نے کبھی بھی ماں باپ کا پیار اور ان کی شفقت نہیں دیکھی تھی۔ ہمیشہ اس نے نفرت، خود غرضی، عدم تحفظ اور بے رحم رویوں کو جھیلا تھا۔ اس کے دامن میں صرف بد دعائیں ڈالی گئیں۔ یہی اس کی ساری زندگی میں اس نے کمایا تھا۔ یقیناً سننے اور پڑھنے والوں کے لیے یہ قصہ ایک عام سا ہوگا کیونکہ ہمارے معاشرے میں ایسے بے شمار گھرانے ہیں۔ ایسے لاکھوں ماں باپ ہیں جو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر سن کر کچھ اس طرح کا رد عمل ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے انہوں نے کوئی موت کی خبر سن لی ہو یا جیسے انہیں بیٹی کی پیدائش کی خبر نہیں دی جا رہی بلکہ کالا پانی کی سزا سنائی جا رہی ہو۔ وہ تقدیر کے اس فیصلے کو کیسے برداشت کرتے ہیں۔ قسمت کی اس دین کو کس طرح اپنی زندگی میں خوش آمدید کہتے ہیں اور کس دل سے اس وقت مسکراتے ہیں تو ہر صاحب عقل اور وہ تمام ماں باپ جنہیں بنا مانگے رب بیٹیاں دے دے بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو ہر وقت زبان و دل سے بیٹے کا ورد کرتے نظر آتے ہیں اور بھولے سے بھی بیٹی کا خیال تک دل میں نہیں لاتے۔ اس خوف سے کہ کہیں خدانخواستہ اللہ انہیں رحمت کے اس بوجھ سے نہ نواز دے۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر بیٹا پیدا ہوتا ہے تو یہ بھی ایک بیٹی کے سبب ہی ممکن ہوتا ہے۔ وہ بیٹی جو عمر کا سفر طے کرتے کرتے ماں بننے کا شرف حاصل کر رہی ہے۔ مگر اس شرف کو حاصل کرتے ہوئے وہ اپنی ہی ذات کی نفی کر رہی ہے۔

بچے کے اس دنیا میں آتے ہی سب سے پہلا سوال لڑکا ہے یا لڑکی......؟

اگر بدقسمتی سے جواب ملے کہ لڑکی! تو ماں باپ کے اندر آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں۔ ارمانوں پر اوس پڑ جاتی ہے اور پھر...... اور پھر افسوس کرنے کے لیے لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے گویا کسی کی موت کی خبر سن لی ہو۔ پھر لوگ مبارک باد دینے نہیں بلکہ ایک طرح کی تعزیت کے لیے آتے ہیں۔

❖......☆......❖

سارہ کے پیدا ہوتے ہی اس کے ماں باپ نے ناگواری اور افسوس کا اظہار کیا۔ نہ کوئی خوشی منائی گئی نہ اس کے والد نے اسے اٹھایا۔ یہاں تک کے اس کا چہرہ بھی نہ دیکھا۔ تین دن بعد اس کے کان میں اذان دی گئی۔ چھ ماہ تک اس کا کوئی نام نہ رکھا گیا تھا۔ وہ پڑی چیختی رہتی مگر کوئی اسے دیکھنے والا نہ ہوتا۔ وہ روتی بلکتی خود ہی سو جاتی۔ جاگتی تب بھی پڑی روتی رہتی۔ اس کی ماں کو ذرا خیال آتا تو اس کو دیکھ بھال لیتی۔ وہ جیسے جیسے بڑی ہوتی جا رہی تھی ماں باپ کی بے اعتنائی کے سبب بہت ضدی ہوتی جا رہی تھی۔ ماں اس کے رونے اور ضد کرنے پر اسے مار مار کر ادھ موا کر دیتی۔ جس پر وہ مزید چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتی۔ اس کی پیدائش کے دو سال بعد اللہ نے اس کے ماں باپ کو بیٹا عطا کیا اور اس بیٹے کے بعد چار بیٹے اور ان کے یہاں پیدا ہوئے مگر بیٹی کی محبت یا اس کے لیے ذرا سی بھی ہمدردی اس کے دل میں نہ جاگ سکی۔ آہستہ آہستہ وقت آگے بڑھنے لگا۔

❖......☆......❖

اس کی ضدی طبیعت اور ہر وقت کے رونے دھونے سے تنگ آ کر اسے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ شروع شروع میں تو اس کی ماں اسے زبردستی اسکول چھوڑ کر چلی جاتی۔ ان کے جانے کے بعد وہ کتنی ہی دیر تک روتی رہتی۔ مگر پھر آہستہ آہستہ خود ہی بہلنے لگی اور اسکول کے بچوں اور

کتابوں میں اس کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر چھپی صلاحیتیں آہستہ آہستہ ابھر کر سامنے آنے لگیں۔ بہت جلد وہ بہت ذہین اور لائق طالبہ کی حیثیت سے اپنے ٹیچرز کی نظروں میں آنے لگی۔ پڑھائی میں اس کی حد درجہ دلچسپی کو دیکھتے ہوئے اس کی ٹیچرز بھی اس پر بے حد محنت کرنے لگیں۔ نتیجتاً وہ ہر کلاس میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتی اور ہمیشہ پوزیشن لیتی۔ ہر بار اپنا انعام وصول کرتے وقت اس کے ذہن میں یہی خیال آتا کہ جب وہ گھر جا کے بتائے گی کہ میں نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ تو ہو سکتا ہے اس کے امی ابو بہت خوش ہوں اسے پیار کریں اسے سراہیں گے شاباش دیں گے۔ مگر ہوتا ہمیشہ اس کی سوچ کے بالکل برعکس تھا۔ اس کے ابو زیادہ تر خاموش ہی رہتے۔ مگر اس کی امی اتنی بہترین کارکردگی پر منہ بنا کر کہتیں کہ یہ ساری محنت تو ہماری ہے۔ اس کا کیا کمال یہ سب میری محنت کا صلہ ہے جو اسے مل رہا ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں کہ کیسے مشکل حالات میں ہم اس کے اخراجات پورے کر رہے ہیں۔ اس کو تو ہر چیز منہ سے نکالتے ہی مل جاتی ہے۔ محلے کی عورتیں سن کر ہاں میں ہاں ملاتیں۔

''ہاں بھئی! اس مہنگائی میں گزارا کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ بہت ہمت ہے تمہاری۔'' ان کی باتوں پر اس کی ماں دل ہی دل میں بے حد خوش ہوتیں جب کہ یہ تو وہی جانتی تھی کہ کس طرح اس کے اخراجات پورے ہو رہے ہیں۔ درحقیقت اپنی کسی بھی ضرورت کے لیے وہ جب بھی ان سے کہتی ان کی دھتکار اور نفرت ہی جواب میں ملتی۔ آہستہ آہستہ اس نے کہنا ہی چھوڑ دیا اور آہستہ آہستہ اپنی ضروریات کو انتہائی محدود کرتی چلی گئی۔ اس کی ہزاروں چھوٹی موٹی خواہشیں اندر ہی اندر دب کر حسرتیں بنتی چلی گئیں۔ اسی طرح سسک سسک کر اس نے میٹرک پاس کر لیا۔ اس کی تعلیم سرکاری اداروں سے ہوئی تھی۔ جن کے اخراجات بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے۔ مگر ان کم ترین اخراجات کے حصول کے لیے بھی وہ خود کو بہت بے بس اور محتاج تصور کرتی۔ مجبور ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں خودداری بھی انتہا کی تھی۔ اس کی عزت نفس کو قطعی یہ گوارا نہ تھا کہ وہ ماں باپ کی شدید نفرت اور بار بار دھتکارے جانے کے باوجود ان کے سامنے ہاتھ پھیلائے، مگر یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اسے پڑھنے لکھنے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا۔ اعلیٰ تعلیم اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ اس کا خواب تھا جسے شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے وہ اپنے ماں باپ کی محتاج تھی۔ وہ دن رات اللہ سے کوئی سبب پیدا فرمانے کی دعائیں مانگتی رہتی اور پھر ایک دن ہمت کر کے اس نے اپنے ماں باپ کے سامنے آگے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کی ماں نے سنتے ہی سخت طیش میں آ کر اسے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ اس کا قد کافی تیزی سے بڑھا تھا اپنی ماں سے بھی لمبی ہو گئی تھی۔ مگر اس کی ماں اب بھی اسے مار مار کر ادھ موا کر دیتی۔ ذرا ذرا سی بات پہ اس کو ایسے ایسے الفاظ اور گالیاں سننی پڑتیں کہ اس کی روح تک تڑپ اٹھتی وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ وہ صرف زبانی کلامی کارروائی پر ہی اکتفا نہ کرتیں۔ اس کی معمولی سی غلطی پر وہ اسے ایسی مار مارتیں کہ ہفتوں اس کے جسم کے زخم رستے رہتے۔ اس کی روح پر لگے زخم اس کے سوا تھے۔ ایسے جو مرتے دم تک نہ بھر پائیں اس کے جسم پر بے شمار زخموں کے نشان باقی

رہ جاتے جنہیں دیکھ دیکھ کر اسے اپنے یہ نشان تازہ زخموں کی صورت رستے اور دکھتے ہوئے محسوس ہونے لگتے اور اس کی آنکھیں بہنے لگتیں تنہائی میں وہ سسک سسک کر رو پڑتی۔ کبھی کبھی وہ اتنی اذیت محسوس کرتی کہ بے اختیار اللہ سے اپنے مر جانے کی دعا مانگتی اللہ سے رو رو کر التجائیں کرتی۔ مگر پھر جب تھوڑا صبر آ جاتا تو اپنے منہ سے نکلے ناشکری کے کلمات پر سخت شرمندہ ہو کر ایک بار پھر رو پڑتی اور اللہ سے معافی مانگتی اور حالات کے بہتر ہونے کی دعائیں مانگتی۔

جیسے تیسے کر کے بہت مشکلوں سے ہی سہی مگر اسے آگے پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ کبھی کبھار اللہ کو اس پر رحم آ جاتا اور اللہ جی اس کے ابو کا دل اس کے لیے نرم کر دیتے۔ اسے پڑھائی جاری رکھنے کی اجازت ملی تو خوشی کے مارے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ بے اختیار اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور اپنے لیے سکون کی دعا مانگی۔ مگر درحقیقت سکون سے جینا اس کے مقدر میں شاید تھا ہی نہیں۔ اس کی آزمائش ختم ہونے میں ہی نہ آتیں۔ ایک آزمائش ختم نہ ہوتی کہ دوسری آن پڑتی۔ جب سے اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا اس کے لیے اذیتوں کا ایک نیا باب کھل گیا تھا۔ اس کی ماں ہر روز کسی نہ کسی شخص کے حوالے سے اس پر بدکردار ہونے کا الزام لگا دیتی۔ اس کے وہم وگمان میں بھی ایسی کوئی بات نہ ہوتی۔ جب کہ اس کی ماں نہ صرف اس پر الزام تراشی کر کے اسے ذہنی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بناتی۔ بلکہ اپنے تمام رشتہ داروں کے سامنے اس کی کردار کشی کرتی۔ نتیجتاً اسے ہر طرف سے زہر بھرے الزامات کے تیر جھیلنے پڑتے۔ وہ سناٹے کی سی کیفیت سے دوچار یہی سوچتی رہ جاتی کہ آخر اس سے غلطی کہاں ہوئی۔

❖......☆......❖

سیکنڈ ایئر کے پیپرز ہو جانے کے بعد وہ گھر کے کاموں میں لگی رہتی۔ گھر کے تمام کاموں کی ذمہ داری تو چھوٹی سی عمر سے ہی اس پر ڈال دی گئی تھی۔ جسے اس نے اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ بہت مشکلوں سے نبھایا۔ گھر کی ذمہ داریاں نبھاتے نبھاتے اس کی تعلیمی کارکردگی بہت بری طرح سے متاثر ہوتی گئی۔ وہ لاکھ کوششوں کے باوجود بھی اپنی سابقہ پوزیشن برقرار نہ رکھ پائی۔ کالج میں اسے اتنی مہلت نہ ملتی کہ وہاں بیٹھ کر اپنا کام کر سکے اور گھر آ کر ہزاروں کام اس کے منتظر ہوتے اور ان کاموں کو تو چاہے وہ آدھی کٹ بھی جاتی تب بھی اسے ہر صورت سرانجام دینا ہوتا تھا اور اگر بدقسمتی سے کوئی کام پورا ہونے سے رہ جاتا یا کچھ خراب ہو جاتا تو نہ صرف اسے ہر کسی کے سامنے صفائی پیش کرتے وقت سب کی جھڑکیاں برداشت کرنی پڑتیں۔ بلکہ مار بھی سہنی پڑتی اور اب تو اس کے بھائی بھی اس پر ہاتھ اٹھانے لگے تھے۔ ماں اس کے ابو کے گھر آتے ہی سچ جھوٹ ملا کر اتنا کچھ کہہ دیتی کہ اس کے کچھ کہنے کی یا صفائی دینے کی گنجائش ہی نہ بچتی۔ اگرچہ اس نے ہونٹ سی رکھے تھے مگر جب ناانصافیاں حد سے بڑھنے لگتیں تو وہ بول پڑتی اگرچہ یہ بولنا بھی اس کے لیے چار گنا زیادہ اذیتوں اور مشکلوں کا سبب بن جاتا۔ کسی بھی صورت کہیں بھی اس کے لیے کوئی راہِ فرار یا جائے پناہ نہ تھی۔

دن رات وہ گھر کے کاموں میں لگی رہتی اور جب کھانا سب کے ساتھ بیٹھ کے کھانے لگتی تو اس وقت بھی اس کی ناانصافیوں پر اس کا دل دکھنے لگتا۔ اس کے ابو ہر اچھی چیز اس کے منہ سے

سامنے سے اٹھا کر بیٹوں کے آگے رکھتے جاتے اور وہ بس ایک حسرت بھری نظر ڈال کر رہ جاتی۔ اسے قطعی ان کے دیے عمدہ نوالے کی بھوک یا لالچ نہ تھا۔ مگر اس کو ان سے تمام اولاد سے یکساں برتاؤ اور انصاف کی تمنا تھی۔ جو شاید کبھی بھی ایک بیٹی کے نصیب میں نہیں ہوتا نہ اپنا نصیب بدلنا اس کے اختیار میں ہوتا ہے۔

کبھی کبھی وہ سوچتی کہ کاش زمانہ جاہلیت کی بیٹیوں کو زندہ درگور کر دیے جانے کی رسم آج بھی زندہ ہوتی۔ کم سے کم اس اذیتوں بھری تل تل ملنے والی موت سے تو بہتر ہی ہوتا کہ ایک بار ہی میں قصہ ختم ہو جائے۔ پھر تنگ آ کر وہ اکثر یہ دعا مانگنے لگتی کہ اللہ اس کے بعد کسی کو بھی کبھی بیٹی نہ دے۔ سب کو ہمیشہ کے لیے اپنی رحمت سے محروم کر دے۔ یہاں تک کہ لوگ اولاد کے لیے ہی ترس جائیں۔ کاش ایسا ہو سکتا......!!

❖......☆......❖

برا ہو اس تھکاوٹ اور اس کے سبب اس پر غالب آنے والی نیند کا......!

وہ ہانڈی چولہے پر رکھ کر ذرا دیر کے لیے کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹی۔ مگر بدقسمتی سے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی آنکھ زوردار جھٹکے سے فرش پر کھینچ کر گرائے جانے کے باعث کھلی سوئے ہونے کے باعث اس کا سر بہت زور سے فرش سے ٹکرایا۔ اس اچانک افتاد پر وہ بری طرح سے بوکھلا گئی۔ مگر ماں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کی ماں کے ہاتھ پاؤں چابک اور ہتھوڑوں کی طرح مسلسل اس پر برس رہے تھے۔ اس نے تھوڑی دیر تک تو چپ چاپ سہہ لیا مگر پھر یکا یک اس کی ماں نے اس کا سر بالوں سے پکڑ کر زور زور سے فرش پر مارنا شروع کر دیا۔ تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے دلخراش چیخیں نکلنا شروع ہو گئیں۔ کافی دیر تک اس پر اس طرح مسلسل تشدد کرنے کے بعد اس کی ماں تھک کر ہانپتی ہوئی باہر صحن میں نکل گئی اور اب اس پر اپنی زبان کے پتھر برسانا شروع کر دیے۔ اتنی تکلیفوں کے بعد تو اب اس میں رونے، سسکنے کی بھی ہمت نہ رہی تھی۔

❖......☆......❖

اس روز کے لگنے والے زخم ابھی بھرے نہ تھے کہ اس کے چند دن بعد ایک بار پھر وہ اپنی ماں کے زیر عتاب تھی۔ اکثر اوقات تو اسے اپنی غلطی ہی معلوم نہ ہوتی۔ جب کہ اکثر ایسی کئی معمولی سی باتوں پہ اسے اس قدر اذیت سے گزرنا پڑتا کہ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا۔

اس دن بھی نہ جانے کس بات پر وہ بھڑک اٹھیں۔ پہلے تو اس کو کوستی اور گالیاں دیتی رہیں مگر پھر اس کی خاموشی پر یکدم طیش میں آ کر اٹھ کر اسے پاؤں سے زور سے ٹھوکر ماری۔ جس پر وہ لڑکھڑا کر دیوار سے ٹکرائی۔ اس کے بعد انہوں نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ جس کی وجہ سے اس کی گردن کو بھی بہت زور کا جھٹکا لگا۔ درد کی شدت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ برسوں سے اس کے اندر جو تپش تھی، دہکتی آگ اسے اندر ہی اندر جلاتی رہی تھی۔ اب اس آگ نے شدت پکڑ لی تھی۔

اس کے اندر ابلنے والا لاوا یکدم پھوٹ بہنے کے لیے بے قابو ہونے لگا۔ ایک دم سے اس پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی۔ چکراتے سر کو سنبھالے ہوئے اس نے ماں کو دھکا دے کر خود سے دور کیا اور ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ چند ہی دور اسے بانس کا ایک مضبوط سا ڈنڈا پڑا نظر آیا۔ جسے اس نے لپک کر اٹھا لیا۔ اس کی ماں اس کے دھکا دینے پر پہلے تو قدرے حیران ہوئی مگر پھر دوبارہ پہلے سے ہزار گنا زیادہ طیش اور نفرت بھرے انداز میں وہ اس کی طرف لپکی اور اسے ایک بار پھر بالوں سے جکڑنا چاہا۔ تو اس نے اپنی ماں کے اپنی طرف بڑھتے ہوئے بازوؤں کو پکڑ کر جھٹکا دیا۔ نجانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی۔ اپنی ماں کے بازوؤں کو پرے جھٹک کر وہ بولی۔ آنسو بے اختیار بہہ رہے تھے۔

''آج مجھے مت مارنا۔'' بے بسی، التجا، بغاوت، نہ جانے کیا کچھ تھا اس کی آنسوؤں سے نم آواز میں۔ مگر اس کی ماں پہلے سے بھی خطرناک تیوروں سے اس کی طرف بڑھی۔

اس بار بھی اس نے اپنی ماں کے بڑھے ہاتھوں کو جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا۔ مگر اب اس کی ماں غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین لیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر زوردار جھٹکے سے زمین پر گرا لیا اور اسی ڈنڈے کو بے دریغ اس پر برسانے لگی۔ ایک بار پھر اسے بالوں سے جکڑنا چاہا مگر اس پل بھر کی مہلت سے فائدہ اٹھا کر وہ اٹھی۔ اس دوران اس کی ماں اس کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تشدد کا سلسلہ پھر سے شروع کرتی اس نے بھی اٹھ کر اپنی ماں کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور پوری طاقت سے اسے دھکیلتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔

''میں نے کہا ہے ناں آج مجھے مت مارنا...... مت مارنا آج......!'' وہ پاگلوں کی طرح چیخ چیخ کر روتے ہوئے ایک ہی بات کہے جا رہی تھی۔

''مت مارنا مجھے مت مارنا۔'' وہ جنونی سی ہونے لگی۔ اس کی ماں اسے مسلسل کسی طرح پھر سے جکڑنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی اور پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ اس کا فائدہ اٹھا کر اس کی ماں نے اسے نیچے گرا لیا اور پھر اس نے ظلم کی انتہا کر دی۔ ڈنڈے برسا برسا کر اس کی ماں نے اسے نیم جان سا کر دیا۔ ادھ مری حالت میں وہ صرف ایک بات دہرائے جا رہی تھی۔

''مار ڈالو مجھے، مار ڈالو...... مار ڈالو آج مجھے۔''

اس کے سر کے بال اس کی ماں نے نوچ نوچ کر اس کے آس پاس بالوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔ اس کی ماں اسے پاؤں سے ٹھوکریں مارتی۔ ہاتھوں سے اس پر ڈنڈے برساتی۔ مسلسل زبان سے زہر اگل رہی تھی۔ وہ بہت دردناک انداز میں رو رہی تھی۔ مگر اس عورت کو ذرا ترس نہ آیا۔ بے بس نگاہوں سے کبھی آسمان کو دیکھتی اور کبھی اپنے ارد گرد نظر ڈالتی۔ پھر کانپتے وجود اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے اپنا دامن پکڑ کر اٹھایا اور نہایت ٹوٹے ہوئے پر درد اذیت بھرے انداز میں اس نے جھولی پھیلا کر اسے بددعائیں دینا شروع کر دیں۔ جیسے جیسے وہ بددعائیں دیتی جاتی اس کی ماں کے ہاتھ میں پلاسٹک کی چپل آ گئی تھی۔ جو وہ اس کے منہ پر برسانے لگتی۔ آج اس کے ضبط کے تمام بند ٹوٹ چکے تھے۔ اپنی بے بسی اسے بہت رلا رہی تھی اس کی ماں نہ جانے اسے کتنی دیر تک مارتی رہی۔ بہت وقت سے وہ اپنی تمام ہمت صرف کرتی ہوئی اٹھ کر اپنے بستر تک آئی۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا۔ جس پر چوٹیں نہ آئی ہوں۔ اس کی نس نس سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ بے دم سی ہو کر وہ بستر پر گری۔ اس کی آنکھوں سے سیلاب اور منہ سے کراہوں کے ساتھ بددعائیں نکل رہی تھیں۔ رات تک وہ اسی طرح کچلے ہوئے وجود کے ساتھ

پڑی رہی۔ رات کو اس کے بھائی گھر واپس آئے اور ماں نے باری باری بڑے دونوں بیٹوں کو خوب بھڑکا کر کمرے میں بھیجا۔ وہ بھی غصے سے پھنکارتے ہوئے آئے اور اس پر پل پڑے۔ وہ خود حیران تھی کہ اب تک زندہ کیسے ہے۔ اتنا ظلم کیسے سہہ گئی۔

اس کی ماں خوب کلیجہ ٹھنڈا کر کے خود ہی روٹھ کر میکے چلی گئی۔

رات کو اس کے ابو گھر واپس آئے تو اس کی حالت دیکھ کر دنگ رہ گئے اور خود بھی رو پڑے اور اسے دلاسا دیتے رہے۔ صبح تک اس کے چہرے پر پڑے جوتوں کے نشان سیاہ پڑ چکے تھے۔ جسم پر جگہ جگہ ڈنڈوں کے نشان واضح نظر آ رہے تھے اور جسم کے کئی حصے سوجن کا شکار ہو چکے تھے۔ وہ اپنے جسم کا کوئی ایک عضو بھی ہلانے سے قاصر تھی۔

❖......☆......❖

تین چار دن بعد اس کی ماں خود ہی واپس لوٹ آئی۔ نہ اس نے ماں کو بلایا نہ ماں نے اسے۔ وہ اب اس عورت کے لیے کبھی بھی "ماں" کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہتی تھی۔

مگر ایک بات کا اس کو نہایت افسوس تھا کہ اس نے اپنا ضبط کیوں کھو دیا تھا۔ اس دن بھی وہ ہمیشہ کی طرح بنا کسی مدافعت کے چپ چاپ مار کھا لیتی۔ کم سے کم اس سے یہ گناہ تو سرزد نہ ہوتا کہ اس نے اپنی پیدا کرنے والی ماں پر ہاتھ اٹھایا۔

اس بات کا اسے شدت سے احساس تھا وہ بار بار اللہ سے معافی مانگتی۔ اس نے سنا تھا کہ ماں باپ چاہے کتنا ہی اولاد کے ساتھ بدسلوکی کا برتاؤ کریں اولاد کو ہر صورت ان کا فرمانبردار رہتے ہوئے انہیں اف تک نہ کہنا چاہیے۔ مگر کیا بنا کسی جرم کے اتنا ظلم اور ایسی کڑی سزاؤں کے بعد بھی ماں باپ کی تعظیم اور ان کا ادب کیا جا سکتا ہے......؟

کیا ایسا سلوک روا رکھنے والی یہ ماں ایسا کرنے میں حق بجانب ہے اور بیٹی کی اس غلطی کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا؟

سارا نے اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد ضمیر کی خلش کو مٹانے کے لیے اپنی ماں کے پاؤں میں گر کر اس غلطی کی معافی مانگی تھی۔ مگر اس کی ماں نے نخوت سے اس کے ہاتھ جھٹک کر پاؤں کھینچ لیے تھے اور کہا کہ "میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

مگر اس کے دل کو اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لینے اور ماں کے پاؤں پڑنے کے بعد آہستہ آہستہ قرار آنے لگا۔ اس واقعہ کے بعد اس کی ماں اس سے پہلے سے بھی زیادہ نفرت کرنے لگی۔ مگر اس کے ابو اب اس کے ساتھ کافی بہتر سلوک کرنے لگے تھے۔

آج بھی اس کی ماں اس پر ہر لحاظ سے حاوی ہے اور اسے ظلم و زبردستی سے اپنا محکوم بنائے ہوئے ہے۔ مگر اب سارہ جواب میں منہ سے ایک لفظ بھی نہیں کہتی۔ ہمیشہ اس کے دل سے امن و عافیت کی دعائیں نکلتی رہی ہیں اور وہ صبر و تحمل سے برداشت کرنے کی مکمل کوشش کرتی ہے۔

شاید کبھی حالات بدلیں اور وہ سکون سے بنا کسی خوف کے زندگی گزار سکے...... ایک بہتر زندگی......!!

بزمِ سخن

روبینہ احمد

عبدالمالک کیف

چاہتیں بھی سراب ہوتی ہیں
کبھی کبھی تو عذاب ہوتی ہیں
زندگی کے قریب حقیقتیں کیف
پلٹ کے دیکھو تو خواب ہوتی ہیں

حسنین نوید بلوچ...... سرگودھا

یہ آنکھیں خواب دکھاتی ہیں اس بشر کے مجھے
جو دیکھتا بھی نہیں ہے نگاہ بھر کے مجھے
میں ساری عمر محبت کی آرزو نہ کروں
اگر سمٹنا سکھا دے کوئی بکھر کے مجھے

مجاہد ناز عباسی...... سنجر پور

تیرے عتاب سے کتنی نبھاہ کی ہم نے
نہ کبھی اشک بہایا نہ کبھی آہ کی ہم نے
پھر بھی تجھے شکایت ہے اے دلِ ناداں
تیرے لیے تو زندگی تباہ کی ہم نے

ابنِ مقبول جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا

اطہر احمد صدیقی...... راولپنڈی

کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام
مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا
لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

انجینئر اظہر احمد صدیقی...... راولپنڈی

میں بھی بہت عجیب ہوں، اتنا عجیب ہوں کہ بس
خود کو تباہ کر لیا اور ملال بھی نہیں

منیر احمد ساغر...... میاں چنوں

پیار کے وعدے کیسے نبھائیں گے ہم لوگ
آنسو آنکھوں کے کیسے چھپائیں گے ہم لوگ
وقت کی آندھی مٹا دیتی ہے پہاڑوں کے نقش
منیر یہ ریت کے گھر کیسے بچائیں گے ہم لوگ

محمد عثمان علی...... میاں چنوں

کچھ برس پہلے جو خط تم نے لکھے تھے مجھ کو
اب پڑھا ان کو تو کچھ اور معانی نکلے
میرا کمرا ہے کہ اِک دنیا تیری یادوں کی
چھیڑوں جس چیز کو تیری ہی نشانی نکلے

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے
فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا
نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے

ریاض بٹ...... حسن ابدال

مجھ سے لے لو میری آنکھیں یہ کام آئیں گی
ہم نہ ہوں گے تو بہت آپ کو رونا ہوگا

فقیر محمد بخش صابر لنگاہ...... خانیوال

وہی محفوظ رکھے گا میرے گھر کو بلاؤں سے
جو بارش میں شجر سے گھونسلے گرنے نہیں دیتا

چوہدری نور الٰہی جٹ...... لاہور

یا مسیحائی اسے بھول گئی ہے محسن
یا پھر ایسا ہے کہ میرا زخم ہی گہرا ہوگا

جان اکرم کھوکھر...... خانیوال

بے فائدہ ہے زیست میں احباب کا ہجوم
ہو پیکرِ خلوص تو کافی ہے ایک شخص

زرینہ ثقلین لنگاہ...... خانیوال

تم بہت سال رہ لیے اپنے
اب میرے صرف میرے ہو کے رہو

غلام فاطمہ اکرم...... خانیوال
تو بچھڑا تو احساس ہوا تیرے سنگ تھی ہر خوشی
میری پہچان کے جاناں سارے تجھ سے حوالے تھے
رفیعہ رمضان...... خانیوال
زندگی میں آرزو کی طرح' سانسوں میں خوش بو کی طرح
وہ میرے انگ انگ میں بسا ہے گویا روح کی طرح
غلام زینب...... خانیوال
سانسوں کا ٹوٹ جانا تو عام سی بات ہے محسن
جہاں اپنے یاد کرنا چھوڑ دیں موت اس کو کہتے ہیں
فیض عباس...... خانیوال
زندگی تو کب کی ہوگئی خاموش
دل تو بس عادتاً دھڑکتا ہے
فوزیہ محمد اکرم...... خانیوال
کتاب سے دلیل دوں یا خود کو سامنے رکھ دوں
وہ مجھ سے پوچھ بیٹھا ہے محبت کس کو کہتے ہیں
شاہ زیب کاشف...... خانیوال
وہ جو بوڑھا گلی میں رہتا ہے
حال پوچھوں تو بس دعا دے گا
رابعہ حسن صابر لنگاہ...... خانیوال
تم مجھے خاک بھی سمجھو تو کوئی بات نہیں
خاک اڑتی ہے تو آنکھوں میں سما جاتی ہے
محمد عاشق حسین...... خانیوال
ان کی آنکھوں میں بھی ہلکی سی نمی رہتی ہے
بات کرتے ہیں جو اوروں کو ہنسانے کے لیے
صابرہ کلثوم صابر لنگاہ...... خانیوال
اک دن میں نے اس سے پوچھا تیرا منشا کیا ہے
اس نے ریت پہ میرا نام لکھا اور مٹا دیا
محمد آشان اکرم...... خانیوال
مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو
وہ برسوں میں کبھی برسیں یہ برسوں سے برستی ہیں

حافظ رحیم بخش...... خانیوال
کتنی بے کیف سی رہ جاتی ہے دل کی بستی
کتنے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے
زوبی خان...... چک جھمرہ
ٹوٹ جاتے ہیں کبھی رشتے مگر
دل سے دل کا رابطہ اپنی جگہ
دل کو ہے تجھ سے نہ ملنے کا یقین
تجھ سے ملنے کی دعا اپنی جگہ
اے انجم...... چناب نگر
پتھر بنا دیا مجھے رونے نہیں دیا
دامن بھی تیرے غم نے بھگونے نہیں دیا
تنہائیاں تمہارا پتا پوچھتی رہیں
شب بھر تمہاری یاد نے سونے نہیں دیا
نادیہ نور...... ترگ شریف
اپنے مہکتے ہوئے آنچل کی ہوا دے مجھ کو
انگلیاں پھیر کے بالوں میں سلا دے مجھ کو
کہتے ہیں کہ یہ عشق نگل لیتا ہے
میں بھی اسی عشق میں آیا ہوں دعا دے مجھ کو
فوزیہ بتول' شازیہ بتول...... ترگ شریف
مت کرید میرے دل کی راکھ مسکرا کے ہوا نہ دے
یہ چراغ پھر بھی چراغ ہے کہیں میرا ہاتھ جلا نہ دے
چاند کی کرنوں نے بکھر بکھر کے تمام شب
تیرا نام لکھا ہے ریت پر' کوئی لہر آ کے مٹا نہ دے
وحیدہ...... ڈگری سندھ
جو تم نے بخشے ان ہی رت جگوں پر غور کرو
پھر اس کے بعد میرے حوصلے پر غور کرو
سفر کا سب سے کٹھن موڑ اور میں تنہا
بچھڑنے والے میری وحشتوں پر غور کرو
ثوبیہ نذیر...... بھائی والا فیصل آباد
پیار سے بڑھ کر نہیں دنیا میں کوئی روشنی

بی گئے یہ روشنی تو آئینہ ہو جاؤ گے
گفتگو میٹھی کرو' ہر شخص سے جھک کر ملو
دشمنوں کے واسطے بھی دلربا ہو جاؤ گے
بشریٰ بدر گل...... کراچی
ہاں! تلخیِ ایام ابھی کچھ اور بڑھے گی
ہاں! اہل ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے
دیویا سوئی...... ٹنڈو الہ یار
دل جہاں لے جائے' دل کے ساتھ جانا چاہیے
اس سے بڑھ کر اور کوئی رہنما ہوتا نہیں
طاہرہ حیات...... سلانوالی
جن سے روشن ہو دل کی دنیا
وہ لوگ ماہتاب ہوتے ہیں
ذکیہ ابراہیم...... چیچہ وطنی
زندگی کے ہیں نہ جانے فرائض کتنے
چند سجدوں کو نہ تکمیلِ عبادت سمجھو
زاہدہ رشید علوی...... راولپنڈی
جمال ابرِ کرم چھا گیا میرے گھر پر
ڈھلکے میری پلکوں پہ جب نمی کے چراغ
سنیہا سسٹرز...... گلشن اقبال کراچی
میں اس کی دسترس میں ہوں مگر وہ
مجھے میری رضا سے مانگتا ہے
بوبی فرینڈز...... محمود آباد کراچی
تم ساتھ تھے ہم بھی تھے منزل سے آشنا
اب تم نہیں تو لگتے ہیں رستے عجیب سے
سپنا مغل...... فیصل آباد
اک نقرئی کھنک کے سوا کیا ملا شکیب
ٹکڑے یہ مجھ سے کہتے ہیں ٹوٹی پلیٹ کے
[illegible]...... سرگودھا

وقت و حالات بھول جاتے ہیں
ایک اِک بات بھول جاتے ہیں
حد تو یہ ہے کہ لوگ لمحوں میں
اپنی اوقات بھول جاتے ہیں
پروین افضل شاہین...... بہاولنگر
نہ تم آسکو گے نہ پھر بات ہوگی
بڑی دکھ بھری چاندنی رات ہوگی
گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر مسکراؤ
خدا جانے پھر کب ملاقات ہوگی
نازیہ کنول چوہدری...... بہاولنگر
ہر ایک لمحہ مجھے رہتی ہے تازہ اک شکایات
کبھی تجھ سے کبھی خود سے کبھی اس زندگی سے
وہ بے کیفی کا عالم ہے کہ دل یہ چاہتا ہے
کہیں روپوش ہو جاؤں اچانک خامشی سے
عمارہ اکبر...... شورکوٹ ضلع جھنگ
وہ رُکے تو گردشیں اس کا طواف کرتی ہیں
وہ چلے تو زمانے اس کو ٹھہر کے دیکھتے ہیں
مہوش ناز...... ڈگری
تیرے بغیر یہ دل میرا کہیں نہ لگے
تجھ کو تجھ سے چرالوں اگر برا نہ لگے
اگر تم پر مرنا ہے تو اس طرح مروں
دل کو کیا دھڑکن کو بھی پتا نہ لگے
آزاد حسین آزاد...... رکن سٹی
باتیں تو ہیں کمال ہی خود بھی کمال شخص
وہ شخص کالی رات میں سورج مثال شخص
وہ شخص جیسے ڈارون کی ارتقاء کی بات
سو سو جواب دے کر پھر بھی سوال شخص

عمر اسرار

غزل

بھٹکے ہوئے راہی کو منزل کب ملے گی
یہ شام غم کی پھر کب ڈھلے گی
بے تاب تھے تجھ سے پھر ملاقات کے لیے
نجانے شمع وفا کی پھر کب جلے گی
تمنا میں جس کی فریب کھاتے رہے ہیں ہم
صبا تیرے چمن کی کب میرے ساتھ چلے گی
اپنی اَنا کے لیے ہر کوئی جیتا ہے جہاں میں
راس نہ آئی تیری بے رخی یہ دنیا کب بدلے گی
خموش ہیں میرے گلستان کے سارے نظارے
اِک بار مسکراؤ میری زندگی میں بہار آئے گی
جاوید ہر کوئی جیتا ہے اپنی خوشیوں کے لیے
دل جلا کے دیکھا ہم نے قسمت میں تیرگی ملے گی

محمد اسلم جاوید...... فیصل آباد

غزل

بھایا نہ کسی کو کوئی دلنشیں ایسا ہوا کہیں
زمانہ بھی نہ ہو نکتہ چیں ایسا ہوا کہیں
برہنہ پا تھا رات اک مسافر تلاشِ آشیاں میں
سو گئے شہر کے سارے مکیں ایسا ہوا کہیں
کر کے گھائل تیر نظر سے مرے دلِ ناتواں کو
ہے قاتل اسی دل میں جلوہ نشیں ایسا ہوا کہیں
رسوا کیا مجھے زمانے میں تری کم نگاہی نے
گو سامنے تھی منزلِ یقیں ایسا ہوا کہیں
اے غازی یہ ہے معجزۂ عشق ترا ہو کے قاتل
ہے درخشاں مثلِ عرشِ بریں ایسا ہوا کہیں
اعتبار اٹھ گیا ابن الغرض کی گمبھیر چال میں
جہاں تھے دستگیر بازو کٹے وہیں ایسا ہوا کہیں

عصمت اقبال عین...... منگلا ڈیم

غزل

جسم و جان کا ہے عجب رشتا
اب تک تو ہے جڑا ہوا
کس طرح بنے گا آشیانہ
درخت تو خود ہے گرا ہوا
ساحل کو جانا دھیان سے
دریا کا پانی ہے پھر بپھرا ہوا
واپس لوٹ کر آئے گا کیسے
وہ تو خود ہے گھر سے گیا ہوا
پوری بستی میں لگ گئی آگ
اک بھی گھر نہیں ہے بچا ہوا
راہ میں روک لے نہ کوئی
ہر کوئی ہے اب دشمن بنا ہوا
کس سے گلہ کریں ستم روزگار کا
اپنا تو سارا شہر ہے پتھر بنا ہوا

وسیم اختر...... راولپنڈی

غزل

ڈھلنے لگی ہے رات ہم زاد شب بخیر
رکھے خدا ہمیشہ آباد شب بخیر
بستر کی سلوٹوں میں جاگی ہوئی تھکن
اے بے وفا کی یاد برباد شب بخیر
اے عشق آ تجھے میں کردوں خدا سپرد
شاید کوئی کہے نہ میرے بعد شب بخیر
میرے سرہانے رکھ کے کچھ زخم چاند نے
روتے ہوئے کہا تھا شب زاد شب بخیر
مجھ کو تو جاگنا ہے یونہی تمام رات
اے نیند، چاند، سگریٹ اے یاد شب بخیر

نیلم علی آغا

معصوم لڑکی

معصوم سی لڑکی کی
معصوم سی خواہشیں تھیں
کبھی گھر بنانا کبھی گڑیوں سے کھیلنا
خوش رنگ تتلیاں پکڑنا
پھولوں کے گجرے بنانا
سپنے دیکھنا، خوابوں میں کھونا
بارش میں بھیگنا، ساحل پر پھرنا
تیز ہَوا سے ڈرنے والی
معصوم سی لڑکی
زندگی کے طوفان میں گھری تو
یوں بکھر گئی
کہ جیسے ڈال سے پھول ٹوٹ جائے
آشیاں بکھر جائے
تتلی اپنے رنگ چھوڑ جائے

ریحانہ سعیدہ...... لاہور

غزل

کبھی دکھ ملا کبھی درد ملا
ہر شخص مجھے بے درد ملا
ڈھونڈنے جب میں نکلا ہوں کہیں
دنیا میں سچا نہ کوئی فرد ملا
مفلسی نے روک دیا نبضوں میں لہو
ہاتھ جس سے بھی ملا وہی سرد ملا
خوشیاں نقش نہیں کسی بھی چہرے پر منیر
ہر ایک چہرہ دکھوں سے زرد ملا

شاعر: منیر احمد ساغر...... میاں چنوں

غزل

درد بڑھتا ہے کیوں تیرے جانے سے
چین آتا ہے کیوں تیرے آنے سے
برسوں قبر میں لیٹا رہا اے صنم
آج پھر زندہ ہوں کیوں تیرے آنے سے
محبت ہے ظالم چیز تو مجھے انکار نہیں
میں تو تجھے چاہتا ہوں زمانے سے
میری پیاس تیرے ہونٹوں میں ہے چھپی
بجھے گی یہ ہونٹوں کے ٹکرانے سے
ویراں لگتا ہے جہاں تیرے بن مگر
جنت بن جائے تیرے مسکرانے سے

محمد عثمان علی...... میاں چنوں

غزل

جو پلکوں میں تھے خواب جل گئے
چمن اُجڑ گیا سارے گلاب جل گئے
بے وفائی کی ہَوا چلی موسمِ گل میں
عشق کے راستے وہ باب جل گئے
ایک جگنو نہ مل سکا اندھیری رات میں
آشیاں کے آشیاں بے حساب جل گئے
اس کے رخساروں کی دھیمی دھیمی آگ
اٹھا رکھی تھی مگر نقاب جل گئے
اس کے آنے کی کوئی امید نہیں اب
ریت پر جتنے تھے سراب سب جل گئے
ہماری بربادی پہ رقیب خوش ہیں بہت
عشق و محبت کے سارے نصاب جل گئے
سب کو کہاں ملتی ہے محبت واجد
وقت کی آندھیوں میں شباب جل گئے

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی...... ملیر کالونی، کراچی

غزل

میرے دل میں دھڑک رہا ہے
چوڑی میں کھنک رہا ہے
میں کتنا چلوں آہستہ
پائل میں چھنک رہا ہے
میں نے پلکیں اٹھا کے ہے دیکھا

ہر وہ کیوں بہک رہا ہے
کسی سرگوشی کی ہے یہ گونج
میرا عارض دہک رہا ہے
اس نے آنچل تو میرا چھوا ہے
گلشن کیوں مہک رہا ہے
الفاظ تو ہیں یہ میرے
وہ لہجے میں چہک رہا ہے
میرے وجود کی سر زمین پر
بن کے سبزہ وہ لہک رہا ہے
ستم گر ہے بڑا نصیب میرا
سدا مجھ کو یہ شک رہا ہے

شاعرہ: عالیہ انعام الٰہی

غزل

آج پھر کوئی یاد ماضی سے ہم رکاب نظر آتی ہے
چاندنی سی جب کوئی دہلیز پر اتر آتی ہے
اکثر اس دل پہ قیامت سی گزر جاتی ہے
جب وہ دور ہی سے اپنا آنچل لہراتی ہے
میرے وطن کی فضائیں حسین تر ہو جاتی ہیں
جب گھٹا چار سُو اپنا رنگ برساتی ہے
جب کبھی میں تیرہ شبوں کی بات کرتی ہوں
ہر دل میں قندیل سی جلتی نظر آتی ہے
خود بڑھ کے تھام لیتی ہے منزل ان کو
پائے استقامت میں لرزش جن کے نظر آتی ہے
شیریں، فرہاد و لیلیٰ، مجنوں کے زمانے تو لد گئے
اب تو عاشقی گلی گلی در بدر نظر آتی ہے
کاغذی پیرہن سے اعضاء کی نمائش جاری ہے
بے حیائی سڑکوں پر بال کھولے نظر آتی ہے
اس نازنین و دلربا کی تو کیا بات ہے قمر
قدم پھولوں پر پڑتا ہے نظر تاروں پہ جاتی ہے

قمر جہاں...... لطیف آباد

غزل

وہ تیرے چہرے کا بھولا پن
تیری آنکھوں کا وہ کاجل بڑا انمول لگتا ہے
تیری زلفوں کا وہ بادل بڑا انمول لگتا ہے
بڑا معصوم سا ہے یہ تیرے چہرے کا بھولا پن
تیرا وہ شوخ چنچل دل بڑا انمول لگتا ہے
تیرے پیروں کی وہ پائل تیرے ہاتھوں کا وہ کنگن
وہ جھمکا تیرے کانوں کا بڑا انمول لگتا ہے
جو ملتے ہیں مجھ سے راہوں میں تو دل جھوم اٹھتا ہے
ذرا سے ساتھ کا وہ پل بڑا انمول لگتا ہے
وہ کاغذ پہ تیرا نام لکھنا اور مٹا دینا
مجھے یہ خود کا پاگل پن لگتا ہے

عبدالرحمان ساغر...... آزاد کشمیر

غزل

ٹوٹ گئے ہیں خواب سہانے لوگوں کے
لٹ گئے سب انمول خزانے لوگوں کے
سب کرتے ہیں اپنے نفع نقصان کی بات
کوئی بھی دکھ درد نہ جانے لوگوں کے
ڈوبا ہے ہر کوئی سوچ سمندر میں
کون آئے گا بار اٹھانے لوگوں کے
چارہ گروں کے ہونٹ سلے ہیں ہاتھ بندھے
موت کھڑی ہے آج سرہانے لوگوں کے
ہاتھ رنگے ہیں جن کے خونِ ناحق سے
آئے ہیں وہ سوگ منانے لوگوں کے
سب کی نظریں کب سے لگی ہیں راہوں پر
آئے کوئی بھاگ جگانے لوگوں کے
ان کو مٹا دیں گے اغیار اور اپنے لوگ
رہ جائیں گے درد فسانے لوگوں کے

ریاض حسین قمر...... منگلا

عفان احمد

لاالٰہ الااللہ

حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ ”اے پروردگار! مجھے ایسی چیز بتا جس سے تیری یاد کروں اور تجھ سے دعا کیا کروں۔“ فرمایا ”اے موسیٰ! لاالٰہ الا اللہ پڑھا کر۔“ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ ”اے پروردگار یہ تو تیرے سب بندے پڑھتے ہیں۔“ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”اے موسیٰ! اگر میرے سوا ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں اور ان کی تمام آبادی ایک پلڑے میں رکھ دی جائے اور دوسرے پلڑے میں لاالٰہ الااللہ ہو تو کلمہ طیبہ والا پلڑا ان سے بھاری ہوگا۔“

(ابن حبان اور حاکم)

مرسلہ: نظام الدین...... نواب شاہ

خزاں کے بعد بہار

خزاں سے خوف نہ کھاؤ کہ یہ بہار کا ابتدائیہ ہے۔ جس کا نغمہ وقت آنے پر زندگی کے صحن میں پھیل جاتا ہے۔ تم نے اس پرندے کو دیکھا ہے جو خزاں کے موسم میں خوب چہچہاتا اور مترنم گیت گاتا ہے اور بہار میں اداس ہو جاتا ہے۔ کسی نے پرندے سے پوچھا کہ تُو بہار میں اداس اور غمگین کیوں ہوتا ہے اور جب پت جھڑ کا موسم یعنی خزاں آتی ہے تو تُو خوش ہو کر چہچہانا کیوں شروع کر دیتا ہے؟ پرندے نے جواب دیا۔ خزاں کے بعد بہار آتی ہے اور میں بہار کی آمد کی خوشی اور سرمستی محسوس کرتا ہوں۔ اور چہچہانا شروع کر دیتا ہوں یہ احساس میرے اندر ایک نئی روح پھونک دیتا ہے مگر بہار کی آمد اس بات کا شاخسانہ ہے کہ یہ چلی جائے گی اس لیے میں اداس ہو جاتا ہوں۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

آنسوئوں کو سیلاب بنانا ہوگا

ایمرسن نے کہا تھا ”کسی ملک کی تہذیب کا صحیح معیار نہ مردم شماری کے اعداد میں ہے نہ اس ملک کے بڑے شہروں کی تعداد میں نہ اس کی جنگی استعداد اس کی معیشت کے حجم میں بلکہ معیار صرف یہ ہے کہ وہ ملک کس قسم کے انسان پیدا کر رہا ہے۔“

قدیم عرب کہا کرتے تھے۔ ”علم والے کی نیند جاہل کی عبادت سے بہتر ہے۔“

چینی محاورہ ہے۔ ”کتابیں ایسے بزرگوں کے مدفن ہیں جو مرنے کے بعد بھی نہیں مرتے۔“

سکندر سے کسی نے پوچھا کہ تم استاد کو باپ پر بھی ترجیح دیتے ہو کیوں؟ فاتح عالم نے جواب دیا۔ ”اس لیے کہ باپ مجھے آسمان سے زمین پر لانے کا وسیلہ بنا، استاد مجھے زمین سے آسمان پر لے گیا۔ باپ نے میرے جسم کی پرورش کی استاد نے میرے ذہن کی۔“

اطالوی کہتے ہیں۔ ”نالائق اولاد چھٹی انگلی کی مانند ہے۔ اسے کاٹا جائے تو درد ہو اور اگر رکھا جائے تو عیب دار ہو۔“

لارڈ میکالے کی مشہور دعا ہے کہ ”میں مروں تو اپنے کتب خانے میں۔“

مردہ پراکرت زبان کا ایک زندہ جملہ ہے۔ ”علم خودداری اور خودداری بیداری کی حالت کا سبب بنتی ہے۔“ اور سب سے بڑھ کر ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان کہ ”علم نور ہے جو گناہ گاروں اور بدبختوں کو نہیں عطا ہوتا۔“

قارئین! آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ مجھے یہ

علم کا دورہ کیوں پڑ گیا لیکن شاید آپ بھول رہے ہیں کہ یہ میرا محبوب ترین موضوع ہے۔ میں جب علم ایجادات و اختراعات کے حوالے سے مغرب کو گلورفائی اور گلیمرائز کرتا ہوں تو کچھ احمق اسے مرعوبیت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ میں اپنے حکمرانوں اور عوام کو اکسا رہا ہوتا ہوں۔ انہیں پرواک کر رہا ہوتا ہوں کہ خرافات، فروعات، لغویات اور جذباتیت چھوڑ کر حصول علم کی طرف آؤ کہ یہ تمہاری کھوئی ہوئی میراث ہے اس سے منہ موڑو گے تو ایسے ہی منہ کے بل گرے رہو گے۔

حسن نثار کے کالم چوراہا سے انتخاب

عالیہ انعام الٰہی...... کراچی

دوست سے ملاقات

حضرت ابی زرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا میں تجھ کو اس امر (دین) کی جڑ بتادوں کہ تو اس کے ذریعہ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی کو حاصل کر سکے۔

۱۔ تو اہل ذکر کی مجلسوں میں بیٹھا کر (یعنی ان لوگوں کے پاس جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہیں)۔

۲۔ اور جب تنہا ہو تو جس قدر ممکن ہو خدا تعالیٰ کی یاد میں اپنی زبان کو حرکت میں رکھ۔

۳۔ محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے محبت کر اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سے لیے بغض رکھ۔

اے ابوزرین کیا تو جانتا ہے کہ جب کوئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی زیارت و ملاقات کے ارادے سے گھر سے نکلتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے ستر ہزار فرشتے ہوتے ہیں جو اس کے لیے دعا و استغفار کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "اے پروردگار اس شخص نے محض تیری رضا کے لیے ملاقات کی تو اس کو اپنی رحمت اور شفقت سے ملا دے۔" پس اگر تجھ سے یہ ممکن ہو یعنی اپنے مسلمان بھائی سے ملاقات کے لیے جانا تو ایسا کر (یعنی اپنے بھائی مسلمان سے ملاقات کر)۔

(بیہقی۔ مشکوۃ)

مرسلہ: شہروز...... کراچی

تین سیٹیاں

ایک آدمی جوتے خریدنے گیا۔ ایک جوتے کی قیمت پوچھی تو دکان دار نے چالیس روپے بتائی۔ آدمی نے تعجب ظاہر کرتے ہوئے سیٹی بجائی۔ پھر اسی آدمی نے دوسرے جوتے کی قیمت پوچھی تو دکان دار نے (80) روپے بتائی۔ اس دفعہ اس آدمی نے اور حیران ہو کر دو سیٹیاں بجائیں۔

پھر جب آدمی نے تیسرے جوڑے کی قیمت پوچھی تو دکان دار جھٹ سے بولا۔ "تین سیٹیاں۔"

محمد عثمان علی...... میاں چنوں

درسِ عبرت

"حق بات کہنے سے کبھی گریز نہ کرو خواہ تمہارے سر پر تلوار ہی کیوں نہ لٹک رہی ہو۔ کیا تم موت سے ڈرتے ہو۔ حالاں کہ ربّ کائنات نے موت کا ایک دن اور ایک وقت مقرر کر دیا ہے۔ پھر موت سے ڈر کر سچی بات کہنے میں ہچکچاہٹ اختیار کرنا، انتہائی بزدلی اور ایمان کی کمزوری ہے۔ کمزور اور بزدل قوم کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ زمین کی پیٹھ کا بوجھ بن کر زندہ رہے۔ کمزور اور ضعیف ایمان ایسا گھن ہے جو اندر ہی اندر قوم کو کھا جاتا ہے۔ مشکلات کے راستے سے ڈر کر اللہ کے راستے سے فرار اختیار کرنا بغاوت ہے اور باغی کی سزا تم جانتے ہی ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تمہارا حشر بھی وہی ہو جو تم سے پہلی قوموں کا ہوا ہے۔ کیا کھنڈروں میں ڈھلی ہوئی بستیاں جو قہر خداوندی کا نشانہ بنیں اور صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئیں، تمہاری عبرت کے لیے کافی نہیں؟ جہاد ایمان کی روح ہے اور مجاہدین کا ستون، جہاد سے انکار کفر ہے اور کفر ظلمت قلب۔ دل سیاہ ہو تو انسان انسانیت کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔ دل کی بستی تاریک ہو تو انسان خدا کو بھول کر عیش و عشرت میں کھو جاتا ہے۔ دل ہی ظلمت نگر ہو تو تیغ و سناں جو انسان کے زیور ہیں، ان کی جگہ طاؤس و رباب لے لیتے ہیں۔ جب قومیں طاؤس و رباب کی رسیا ہو جاتی ہیں تو مٹ جاتی ہیں اور ان کی تباہی دوسروں کے لیے عبرت کا درس بن جاتی ہے۔"

انتخاب: سید واجد علی...... میر پور خاص

بے حس سماج کے بے رحم رویے

کہاں سے لکھوں، کس کس ستم، کس کس کہانی پہ لکھوں۔ یہ سوچ سوچ کے جو خیالات جنم لیتے ہیں وہ بھی منتشر ہو جاتے ہیں۔ ایک ٹاپک پہ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو سماج کا دوسرا روپ سامنے آ جاتا ہے اور دھیان اس طرف چلا جاتا ہے۔ اس کشمکش میں کتنے ہی دن گزر جاتے ہیں۔ ایسے واقعات روز کا معمول بن چکے ہیں کہ جسے دیکھ کر انسانیت تک شرما جائے۔ ہم لوگ جیسے اندھے قانون کے بہرے گونگے سماج کا وہ حصہ بن چکے ہیں جہاں کچھ بھی ہوتا رہے اف تک نہیں کی جاتی جو ہو جیسا ہو اس سے جان بوجھ کر لاتعلق ہو جانا عام سی بات بن چکی ہے۔ شاید ہمارے اعمال ہمیں دکھتے ہی نہیں ہیں۔ ہمارے دلوں کو زنگ لگ چکا ہے۔ ہم لوگ اپنے اندر جھانکتے نہیں بس دوسروں کی برائیاں تلاش کرنے کی جستجو میں دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ احساسات و جذبات کی قدر کھو چکی ہے۔ انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے۔ ہم اتنے بے حس ہو چکے ہیں کہ ہمارا سماج اپنی قدر کھو بیٹھا ہے۔ انسان اشرف المخلوق کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چرند پرند پیدا کیے ان سب سے بڑھ کر انسان کو مرتبہ ملا مگر آج کا انسان انسان نہیں رہا جانور سے بھی بدتر ہو چکا ہے لالچ، طمع اتنی حد تک سرایت کر چکی ہے کہ وہ اپنے ہی باپ، بیٹوں، بھائیوں کو قتل کرتا پھرتا ہے۔ اس کے آگے جان اتنی سستی ہو چکی ہے کہ ایک ہی جگہ بہت سارے انسانوں کا خون بہا کر بھی وہ جھرجھری تک نہیں لیتا۔ آج کل کے دور میں کسی دوسرے کے درد کو محسوس کرنے والی حس دم توڑ چکی ہے۔ کوئی انسان کسی حادثے کا شکار ہو کر کہیں تڑپتا رہے مگر مجال ہے کہ کوئی شخص اس کی مدد کرنے کے لیے قدم بڑھائے۔ اس کے پاس اتنا ٹائم ہی نہیں ہے۔ ایک طرف یہاں ظالم اگر انسان ہے تو دوسری طرف مظلوم بھی انسان ہے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ انسان اپنی ذمہ داری کا احساس بھلا بیٹھا ہے۔ حرص و طمع کو اپنے دل میں پال بیٹھا ہے۔ ہم اس بے رحم سماج کا حصہ بن چکے ہیں۔ جہاں گولیوں سے چھلنی لاشیں ملتی ہیں۔ جہاں آئے دن خود کش حملوں میں انسانوں کے اعضاء بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ جہاں عام آدمی کے جذبات سیاست کے بے رحم پاؤں تلے کچلے جاتے ہیں۔ جہاں ہر شعبے میں کرسی پہ بیٹھنے والے خود کو بادشاہ اور کام کے لیے آنے والے افراد کو حقیر سمجھتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے انہیں زبردستی کرسی پہ بٹھایا گیا ہو اور بغیر تنخواہ کے کام لیا جا رہا ہو۔ ایک سپاہی عام آدمی سے ایسے بات کرتا ہے جیسے وہ قانون کا محافظ نہ ہو بلکہ کسی ملک کا بادشاہ ہو یہ سب کیا ماجرا ہے۔ ہر کوئی پیسے کے پیچھے اندھا دھند بھاگ رہا ہے۔ آئے دن محبت، اخلاق ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ جانے دنیا کس سمت چل نکلی ہے۔ خدا خیر کرے۔ اللہ ہمارے حالات پر رحم کرے اور ہمیں سیدھا راستہ دکھائے۔

❖

خطروں کا کھلاڑی

اے حمید

محترم اے حمید کا نام نئے افق کے قارئین کے لیے نیا نہیں۔ وہ نئے افق' نیا رخ اور آنچل کے لیے متعدد سلسلے وار ناول' افسانے اور سفر نامے لکھ چکے ہیں۔ ان کے لکھنے کا ایک منفرد انداز ہے۔ وہ جب لکھتے ہیں تو لفظ بولتے ہیں۔ جب قاری انہیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو خود بخود اس ماحول میں پہنچ جاتا ہے بلکہ خود اس کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ منظر کشی میں اے حمید کا کوئی ثانی نہیں۔ جب وہ بارش کے بارے میں لکھتے ہیں تو پڑھنے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی کمرے سے باہر بوندیں برس رہی ہیں۔ جب وہ خوش بو کا تذکرہ کرتے ہیں تو قاری خود کو اس خوش بو کے ہالے میں محسوس کرتا ہے۔ زیر نظر تحریر ماضی کے برما حال کے میان مار کا سفر نامہ ہے۔ آج اے حمید ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کی تحریریں انہیں ہمیشہ قارئین کے دلوں میں زندہ رکھیں گی۔ آئیے خطروں کا کھلاڑی پڑھیے بلکہ محسوس کیجیے۔

ایک ایسا سفر نامہ جو آپ کو دن میں خواب دیکھنے پر مجبور کردے گا

اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ دو ڈھائی گھنٹوں میں میرا سفر کٹ گیا اور گاڑی کندرگام کے چھوٹے سے دیہاتی ٹائپ کے اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے رکی تو میں ٹرین سے اتر گیا۔ آسمان پر کہیں کہیں سفید اور بھورے رنگ کے ٹکڑے نظر آرہے تھے۔ دھوپ بھی نکلی ہوئی تھی۔ کسی وقت بادل کا کوئی ٹکڑا سورج کے سامنے آجاتا تھا تو ہر طرف چھاؤں ہوجاتی تھی۔ اسٹیشن کے باہر چائے کا ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔

کچھ دیہاتی ٹائپ کے دبلے پتلے سانولے سے آدمی لکڑی کے بنچ پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے بھی چائے کا ایک گلاس لیا اور ان لوگوں کے پاس بیٹھ کر چائے پینے لگا۔ میرا اصل مقصد ان لوگوں سے رام ناتھ تالاب والے لکشمی مندر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ یہ دیہاتی بنگلہ زبان بول رہے تھے۔ میں بنگلہ زبان بار بار کلکتے آنے کی وجہ سے تھوڑی بہت سمجھ تو لیتا تھا مگر بول نہیں سکتا تھا۔ یہاں بنگلہ کے علاوہ ٹوٹی پھوٹی اردو بھی عام بولی جاتی تھی۔

میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے بنگالی سے پوچھا کہ ادھر جنگل میں رام ناتھ تالاب کو کون سا راستہ جاتا ہے حالانکہ مجھے جان نے بتادیا تھا کہ اسٹیشن سے آگے ایک ندی پار کروگے تو سامنے جنگل میں کافی آگے جاکر ہے۔ لیکن میں ان دیہاتیوں سے لکشمی مندر کے بارے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بنگالی بوڑھے نے اپنی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور ٹوٹی پھوٹی عجیب قسم کی اردو زبان میں کہا۔ اس کی اصل زبان یہاں لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے درمیان جو مکالمے ہوئے میں انہیں سیدھی سادھی اردو میں ہی لکھوں گا۔

"بابو! تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اسے بتایا کہ میرا نام سانیال ہے میں پنجاب سے اس علاقے کی سیر وسیاحت کرنے آیا ہوں۔ بنگالی کہنے لگا۔

"تمہارے پاس کوئی بندوق وغیرہ ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں۔"

وہ بولا۔ "تو پھر رام ناتھ تالاب والے جنگل کا رخ نہ کرنا ورنہ کوئی شیر تمہیں کھا جائے گا۔"

دو بنگالی وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے وہ بھی میری طرف دیکھنے لگے۔ انہوں نے میری طرف دیکھ کر آپس میں بنگلہ زبان میں دو تین جملے کہے اور پھر ہنسنے لگے۔ میں نے اپنے ساتھ والے بنگالی بوڑھے سے کہا۔

"سنا ہے اس جنگل میں لکشمی دیوی جی کا کوئی پرانا تاریخی مندر بھی ہے جو رام لچھمن جی کے زمانے سے چلا آ رہا ہے۔"

بوڑھا بنگالی بولا۔

"وہ مندر تو ویران ہو چکا ہے' اس خطرناک جنگل میں پوجا پاٹھ کرنے کون آئے گا۔"

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

"سنا ہے اس مندر میں کبھی اچھوت کنیاؤں کی بلی (قربانی) دی جاتی تھی۔" بوڑھے بنگالی نے بیڑی پیتے ہوئے کہا۔

"یہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ اب کہیں بھی ایسا نہیں ہوتا' انگریز کا راج بڑا سخت ہے۔"

دوسرے بوڑھے نے مجھ سے پوچھا۔

"تم ادھر کیا کرنے جا رہے ہو؟ اس طرف تو شکاری بھی آتے ہوئے ڈرتے ہیں اور تمہارے پاس تو کوئی بندوق بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں جنگل میں زیادہ آگے نہیں جاؤں گا۔ بس دور سے لکشمی دیوی کے پرانے مندر کے درشن کر کے واپس آ جاؤں گا۔"

پہلا بنگالی بوڑھا بولا۔

"میری مانو تو کندرگام کی سیر کر کے واپس چلے جاؤ۔ یہ جنگل دور ہی سے اچھے لگتے ہیں۔"

مگر میں واپس جانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ اس چھوٹے سے ہوٹل میں میں نے تھوڑے سے چاول بھاجی کے ساتھ کھائے اور ندی کے پل پر سے گزر کر دوسرے کنارے پر آ گیا۔ یہاں تین چار جھونپڑیوں کی دکانیں بنی ہوئی تھیں جن میں آٹا' چاول' دال وغیرہ رکھا ہوا تھا۔ ایک دکان پر تھال میں میٹھے چنوں کا ڈھیر لگا تھا۔

میں نے بڑی عقل مندی کی جو وہاں سے میٹھے چنے خرید کر اپنی جیکٹ کی دونوں جیبیں بھر لیں۔ اس کے بعد میں جنگل میں داخل ہو گیا۔ یہ جنگل بھی علاقے کے دوسرے جنگلوں کی طرح تھا۔ بے سروپا گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہر قسم کے درخت کھڑے تھے۔ ان میں بانس کے جھنڈ بھی تھے۔

بانس کے جھنڈوں میں سے گزرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک تو بانس کی شاخوں اور تنوں پر بڑے سخت لمبے لمبے کانٹے اگے ہوتے ہیں جو صرف کلہاڑی ہی سے کاٹے جا سکتے ہیں۔ دوسرے زمین میں سے بانس کی باریک باریک سوئیوں ایسی کونپلیں باہر نکلی ہوتی ہیں جو ربڑ کے جوتوں کے تلے میں بھی گھس کر پاؤں لہولہان کر دیتی ہیں۔ بانس کے کانٹوں بھرے جھنڈ میں سے شیر بھی گزرنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ شیر کے دوسرے اعضا جتنے طاقتور ہوتے ہیں اس کے پیٹ کی کھال اتنی ہی نازک ہوتی ہے۔

ندی میں سے ایک نالہ نکل کر جنگل میں داخل ہو گیا تھا۔ یہ دس بارہ فٹ چوڑا نالہ تھا۔ جس کے کناروں پر بھنگ کی جھاڑیوں کی طرح کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ مجھے امرتسر والی چھوٹی نہر کا نالہ یاد آ گیا۔ اس کے ایک کنارے پر بھنگ کی جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ ہمارے محلے کا ایک آدمی جو بھنگ کا رسیا تھا ان جھاڑیوں کے پتے توڑ کر تھیلے میں ڈال کر لے جایا کرتا تھا۔ وہ ان پتوں کو [illegible] ان کو گھوٹ کر اس میں بادام کی گریاں اور چار [illegible] ڈال کر پھر گھوٹتا آخر میں دودھ ڈال کر اس مشروب کو کپڑے سے چھان کر پیالے میں بھر کر ایک طرف رکھ دیتا۔ اس کے بعد وہ حقہ تازہ کرتا' چلم میں تمباکو بھرتا' تمباکو کے نیچے گڑ کی ایک ڈلی بھی رکھتا تھا۔ جب حقہ تیار ہو جاتا تو بھنگ سے بھرا ہوا پیالہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر پنجابی کا یہ شعر پڑھتا جو مجھے آج بھی یاد ہے۔

پیو بھنگاں تے سوودں باگیں
پچھلے جیون اپنی بھاگیں

اس کا مطلب ہے کہ بھنگ پیو اور باغ میں جا کر سو جاؤ' اگلے پچھلوں کی فکر مت کرو' وہ جانیں اور ان کے بھاگ جانیں۔ بڑا دلچسپ کردار تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کے باہر گنڈیاں بیچا کرتا تھا۔ حقہ اس نے اپنی چھابڑی کے پاس ہی رکھا ہوتا تھا۔ میں اپنے ہم جولیوں کے ساتھ نہر پر نہانے جاتا تھا تو بھنگ کے پتے توڑ کر زور سے ہاتھ پر انہیں ملتا اور سونگھتا۔ ان میں سے بڑی تیز بو آیا کرتی تھی' یہ کچی بھنگ کی بو تھی۔

O......O......O

قیام پاکستان کے وقت لوہاری دروازے کے باہر انارکلی کی نکڑ میں مکتبہ جدید کے ساتھ ایک سرنگ نما دکان ہوتی تھی جہاں بھنگ کے رسیا اندر بینچ پر بیٹھ کر بھنگ پیا کرتے تھے۔ اس دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھنگ کی جھاڑیوں کی خوشبو آیا کرتی تھی اور مجھے امرتسر والی نہر یاد آ جاتی تھی۔ دکان کے اندر ہر وقت بھنگ گھٹتی رہتی تھی۔ دو پیسے یا شاید ایک آنے کا بھنگ کا گلاس ملتا تھا۔ ایک بار میں نے بھی اس دکان میں بیٹھ کر بھنگ کا ایک گلاس پیا تھا اس کے بعد میری یہ حالت ہو گئی کہ کسی بات پر ہنستا تھا تو ہنستا ہی چلا جاتا تھا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو کھاتا ہی چلا جاتا۔ سارا دن میرے دماغ کی یہی ذلت آمیز حالت رہی۔ اس کے بعد میں نے ہمیشہ کے لیے بھنگ سے توبہ کر لی۔ اسی بھنگ کی جھاڑیوں کی قسم کی جھاڑیاں اس نالے کے کنارے پر بھی اگی ہوئی تھیں جو کندرگام سے آگے ندی سے نکل کر جنگل میں چلا گیا تھا۔ میں نے ایک پتے کو توڑ کر ہتھیلی پر زور سے ملا اور اسے سونگھا یہ کوئی اور ہی جھاڑی تھی۔ اس میں سے بھنگ کی تیز بو نہیں آ رہی تھی۔ میں نالے کے ساتھ ساتھ جنگل میں چلتا گیا۔ دل کو یہ فکر بھی دامن گیر تھا کہ کسی طرف سے شیر یا کوئی دوسرا درندہ اچانک نکل کر سامنے نہ آ جائے۔ اصل میں وہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ نفع نقصان کا کوئی خیال نہیں ہوتا۔ دل و دماغ پر ہیرو بننے کا جذبہ غالب ہوتا ہے۔ ہر وقت یہی ایک دھن سوار رہتی ہے کہ کوئی ایسا کام کیا جائے کہ لوگ حیران رہ جائیں۔ میرے ذہن میں بھی یہی ہیرو بننے کا جذبہ غالب تھا جو مجھے کلکتے سے کھینچ کر اس جنگل میں لے آیا تھا۔ اس عمر میں انسان پر جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ عقل منہ سر لپیٹ کر ایک طرف خاموش بیٹھی سگریٹ پی رہی ہوتی ہے۔ پھر جیسے جیسے انسان بڑا ہوتا جاتا ہے یہ جذبات ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں اور عقل غالب آنا شروع ہو جاتی ہے پھر خالی عقل ہی عقل رہ جاتی ہے اور جذبات تقریباً غائب ہو جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ آخری عمر میں یہ محترمہ عقل صاحبہ بھی رخصت ہو جاتی ہے اور انسان پر وہی بچپن کے جذبات غالب آ جاتے ہیں۔ چنانچہ بوڑھوں کی اکثر حرکتیں بالکل بچوں جیسی ہوتی ہیں۔ یہ انسانی زندگی کا چکر ہے جو نامعلوم صدیوں سے چل رہا ہے اور انسان کو اس سے فرار ممکن نہیں۔ فرار ہونے کی ضرورت بھی نہیں' یہ جیسا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ ندی سے نکلا ہوا نالہ آگے جا کر جنگل میں رام ناتھ کے تالاب کے

قریب سے گزرتا ہے۔

میرے لیے یہی ایک شارٹ کٹ یعنی سیدھا اور آسان راستہ تھا۔ نالے کے کنارے کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ ادھر سے یا تو دیہاتی لوگ بالکل نہیں گزرتے یا کبھی کبھار ہی گزرتے ہیں۔ نالے کے دائیں بائیں جنگل ہی جنگل تھا جہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جہاں جنگل زیادہ گھنا ہو جاتا تھا وہاں چھاؤں بڑی گہری ہو جاتی تھی۔ جہاں درخت ذرا دور دور ہو جاتے تھے وہاں دن کی روشنی نظر آنے لگتی تھی۔ کسی کسی وقت کسی درخت پر سے پرندے کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ جس کے بعد جنگل کا سناٹا اور زیادہ ڈراؤنا ہو جاتا تھا۔ مجھے جنگل سے ڈر بھی لگ رہا تھا اور لڑکپن کے منہ زور جذبات مجھے آگے ہی آگے لیے بھی جا رہے تھے۔ ویسے بھی میں انڈیا کے جنگلوں کا عادی ہو گیا تھا۔ صرف سانپ اور شیر چیتے سے ڈر لگتا تھا۔ زیادہ خوف محسوس ہوتا تو میں سیٹی بجانے لگتا یا نیو تھیٹرز کا کوئی گانا گانے لگتا۔ چلتے چلتے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد دائیں بائیں اور پیچھے مڑ کر دیکھ بھی لیتا تھا۔ ایک جگہ ایک بہت بڑا درخت آندھی کی وجہ سے جڑوں کے کھوکھلا ہو جانے کی وجہ سے نالے کے اوپر گرا ہوا تھا۔ میں بڑی مشکل سے اس کی گنجان شاخوں کے بیچ میں سے گزر کر دوسری طرف نکلا۔

میں کافی دیر سے نالے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ابھی تک نہ تو جنگل کا گھنا پن ختم ہوا تھا اور نہ رام ناتھ کا تالاب دکھائی دیا تھا۔ نالے کے دوسرے کنارے پر میں نے ایک کالے سانپ کو دیکھا جو اپنا پھن کھولے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی اور جلدی جلدی وہاں سے گزر گیا۔ ایک جگہ گھنے جنگل میں زور سے ہاتھی کے چنگھاڑنے کی آواز سنائی دی پھر یہ آواز دور ہوتی چلی گئی۔ خدا خدا کر کے جنگل کا گھنا پن کم ہونا شروع ہوا۔ درخت ذرا پرے پرے ہٹ گئے۔ کچھ فاصلے پر میری دائیں جانب ایک جگہ نیم کے بہت سارے درخت ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ نیم کے درخت کو میں دور ہی سے پہچان لیتا ہوں۔ جنگلوں اور امرتسر کے کمپنی باغ اور چالیس کنوؤں کے آس پاس پھرنے پھرانے کی وجہ سے مجھے بعض درختوں کی بڑی پہچان ہو گئی تھی۔ یہاں آ کر نالہ ایک طرف کو مڑ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ رام ناتھ کا تالاب نیم کے درختوں کے جھنڈ میں ہی ہو گا۔

میں نالے کو چھوڑ کر نیم کے جھنڈ کی طرف بڑھا۔ ان درختوں کی گہری سبز ٹھنڈی چھاؤں میں ایک تالاب نظر آیا جس کی ساکن سطح کو گلے سڑے پتوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ تالاب پر کوئی نہانے یا کپڑے دھونے نہیں آتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تالاب کے اردگرد جنگل ہی جنگل تھا کوئی گاؤں وغیرہ نہیں تھا۔ شاید رات کو یا دن کے وقت بھی شیر ہاتھی یہاں پانی پینے آتے ہوں گے۔ یہی رام ناتھ تالاب ہو سکتا تھا۔

لکشمی دیوی کے قدیم مندر کے کھنڈر یہاں قریب ہی ہونے چاہیں تھے۔ اب میں محتاط ہو گیا۔ جنگلی جانوروں نے تو مجھے کچھ نہیں کہا تھا بہت ممکن ہے کہ کسی شیر یا ہاتھی نے مجھے نالے کے کنارے جاتے جنگل میں سے دیکھ بھی لیا ہو اور منہ پھیر کر دوسری طرف چلا گیا ہو۔ شیر ہاتھی کی یہ خصلت ہے کہ جب تک وہ غیظ و غضب کی حالت میں نہ ہوں یا شیر آدم خور نہ بن چکا ہو یہ جانور انسانوں کو کچھ نہیں کہتے۔ اکثر حالتوں میں کسی انسان کو اپنے راستے میں دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں۔ سید رفیق حسین نے تو اپنی کتاب "آئینہ حیرت" میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ وسطی ہند کے جنگلوں میں چلتے پھرتے آدمی بمبئی کلکتے کی سڑکوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتا ہے۔

خطرہ مجھے پجاری اور اس کے آدمیوں سے تھا جو ایک اچھوت لڑکی کو لکشمی دیوی پر قربان کرنے کے لیے اغوا کر کے لائے ہوئے تھے۔ یہ قتل تھا اور اس قتل کے جرم میں ان لوگوں کو پھانسی کی سزا مل سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے لڑکی کو خفیہ طریقے سے قتل کرنے کے تمام ضروری اقدامات کیے ہوئے تھے۔ کلکتے کے ست پال نے بھی جان کو بتایا تھا کہ اگر ان لوگوں کو پتہ چل جائے کہ کسی نے انہیں یہ واردات کرتے دیکھ لیا ہے تو وہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑتے۔ میں نے یہ کیا کہ نالے سے دور ہو کر جھاڑیوں کی اوٹ میں چلنے لگا۔ آخر مجھے لکشمی دیوی کے قدیم مندر کا کھنڈر نظر آ گیا۔ یہ مندر زمین سے دو تین فٹ اونچے چبوترے پر بنا ہوا تھا۔ مندر کے اردگرد کوئی انسان چلتا پھرتا دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ پجاری کے آدمیوں نے وہاں ناکہ بندی کر رکھی ہو گی چنانچہ میں وہیں سے پلٹ گیا۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد میں ان درختوں کی طرف ہو گیا جو مندر کے پیچھے دور تک چلے گئے تھے۔ مندر کے عقب میں جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ میں ایک ایک قدم سوچ سمجھ کر اٹھا رہا تھا۔ جذبات کے غلبے سے بچی ہوئی جتنی بھی عقل میرے پاس تھی میں برابر اس سے کام لے رہا تھا۔ مندر سے ڈیڑھ دو سو گز دور ہو کر میں اس کے متوازی ہو کر چل رہا تھا۔ یہاں جھاڑیاں چھ چھ فٹ اونچی تھیں اور مجھے چلتے ہوئے اچھی آڑ مل رہی تھی۔ ایک جگہ نشیب میں مجھے ایک اور تالاب نظر آیا۔ یہ تالاب رام ناتھ کے تالاب سے چھوٹا تھا اور اس پر ایک جانب سیڑھیاں تالاب میں اترتی تھیں۔ سیڑھیوں کے اوپر درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ میں ابھی تالاب کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں وہیں ایک درخت کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

آواز تالاب کی طرف سے آئی تھی۔ تالاب نشیب میں چالیس پچاس قدموں کے فاصلے پر ہو گا۔ میری نظریں تالاب پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں درختوں میں سے تین آدمی نمودار ہوئے۔ ان کے کندھوں سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ ایک جوان لڑکی ان کے ساتھ تھی۔ لڑکی کے گلے میں رسی بندھی ہوئی تھی۔ ایک آدمی نے رسی کو پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی رک رک کر تالاب کی طرف چل رہی تھی اور ان آدمیوں کو بار بار ہاتھ جوڑ کر کچھ کہہ رہی تھی۔ مسلح آدمی لڑکی کو آگے دھکیل رہے تھے اور آپس میں ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہے تھے۔ تالاب کی سیڑھیوں کے پاس آ کر انہوں نے لڑکی کو زبردستی سیڑھیوں پر بٹھا دیا اور رسی کو ڈھیلی چھوڑتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔ کچھ فاصلے پر جا کر وہ جھاڑیوں کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ وہ لڑکی ہے جسے لکشمی دیوی پر قربان کرنے کے لیے اس جنگل والے مندر میں اغوا کر کے لایا گیا ہے اور یہ لوگ لڑکی کو اشنان کرانے لائے ہیں۔ لڑکی کچھ دیر سیڑھیوں پر سر جھکائے بیٹھی رہی پھر اس نے سر اٹھا کر اوپر درختوں کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا اور آہستہ آہستہ اپنی ساڑھی اتارنے لگی۔

تالاب کا پانی آخری سیڑھی تک آیا ہوا تھا۔ وہ آخری سیڑھی پر بیٹھ کر نہانے لگی۔ جس طرح یہ بے یار و مددگار اچھوت لڑکی ان آدمیوں کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی اس منظر نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ ظاہر ہے وہ ان لوگوں سے اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو گی اسے تو علم ہو گیا ہو گا کہ یہاں اسے لکشمی

دیوی کی بھینٹ چڑھانے کے لیے لایا گیا ہے اور اس کی زندگی کے بس دو ایک دن ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ ایک غریب بے سہارا لڑکی کا قتل تھا، یہ ظلم تھا۔ میرے اندر کا ہیرو جاگ اٹھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کرلیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں اس لڑکی کو لکشمی دیوی کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا اور اسے ہر حالت میں یہاں سے بھگا کر لے جاؤں گا۔ کہاں میں دیوی کی انسانی قربانی کا ایڈونچر دیکھنے آیا تھا اور کہاں میں نے دیوی پر قربان کی جانے والی لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کو یہاں سے کیسے بھگا کر لے جاؤں گا۔ میں نے زندگی میں یہ تجربہ کر کے دیکھا ہے کہ بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں بالکل نہیں سوچنا چاہیے۔ بس اندھا دھند کر دینے چاہئیں۔ زیادہ سوچ بچار کرنے سے وہ کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ میں نے ذرا سا بھی نہیں سوچا تھا اور بس اللہ توکل لڑکی کو ان قاتلوں سے بچانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ لڑکی تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھی بادل نخواستہ اشنان کر رہی تھی۔ شاید وہ رو بھی رہی تھی کیونکہ وہ بار بار ہاتھ سے اپنی آنکھیں پونچھ لیتی تھی۔ اس کی گردن میں رسی بندھی ہوئی تھی جس کا سرا جھاڑیوں کے پاس بیٹھے تین مسلح آدمیوں میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں تھا۔ نہانے کے بعد لڑکی نے ساڑھی جسم کے گرد لپیٹی۔ تینوں آدمی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ جس آدمی کے ہاتھ میں رسی تھی اس نے لڑکی کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔

لڑکی اس طرح دائیں بائیں سر ہلاتی چلی جا رہی تھی جیسے وہ کسی جادو کے زیر اثر موت کے منہ کی طرف بڑھ رہی ہو۔ حاتم طائی کی ایک کہانی میں کوہ ندا کا ذکر آتا ہے۔ یہ ایک پہاڑ ہے جس کے غار میں ایک جن رہتا ہے۔ وہ ہر ماہ ایک آدمی کو کھاتا ہے۔ گاؤں کے لوگ وقت مقررہ پر ایک آدمی کو لے کر کوہ ندا کے غار کے پاس آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ غار میں سے جن کی آواز آتی ہے تو جس آدمی کو جن کی بھینٹ چڑھانا ہوتا ہے وہ اپنے آپ غار کی طرف بڑھنا شروع کر دیتا ہے۔ مسلم امرتسر کے سینما گھر امرت ٹاکیز میں میں نے بچپن میں حاتم طائی کی فلم دیکھی تھی۔ اس فلم میں ایک پہاڑ دکھایا گیا تھا۔ یہ کوہ ندا تھا۔ اس کے غار کے باہر گاؤں کے لوگ جمع تھے۔ ایک آدمی جس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے وہ سب سے آگے غار کی طرف منہ کر کے بالکل ساکت کھڑا تھا۔ اتنے میں کوہ ندا کے غار میں سے جن کی آواز آتی ہے۔ آواز کو سنتے ہی وہ آدمی جس کو جن کے آگے اس کی ضیافت کے لیے پیش کیا جانا تھا اپنے آپ غار کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ وہ اسی طرح اپنا سر دائیں بائیں ہلا رہا تھا جس طرح یہ مظلوم لڑکی سر ہلا رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے حاتم طائی فلم کا کوہ ندا والا سین یاد آ گیا تھا۔ چونکہ میں نے لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کرلیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ میں ان قاتلوں کا پیچھا کر کے معلوم کروں کہ لڑکی کو انہوں نے کہاں رکھا ہوا ہے۔ تینوں مسلح آدمی لڑکی کو آگے لگا کر درختوں میں ایک طرف چل پڑے۔ میں تیزی کے ساتھ نشیب میں اترا اور درختوں جھاڑیوں کی آڑ لیتا ان لوگوں کے پیچھے لگ گیا۔ ایک طرح سے میں بھی موت کے منہ میں جا رہا تھا لیکن موت کے منہ میں جائے بغیر میں اس لڑکی کو موت کے منہ سے نہیں نکال سکتا تھا لیکن ان لوگوں کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا تھا۔ دن کا وقت تھا، درخت زیادہ گنجان بھی نہیں تھے۔ جھاڑیاں بہت تھیں۔ ایک آدمی نے لڑکی کو [illegible] سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اسے کھینچتا ہوا لے جا رہا تھا۔ [illegible]

اپنے دائیں بائیں سے بھی ہوشیار تھا کہ کہیں ان قاتلوں کا کوئی جاسوس مجھے دیکھ کر نہ پکڑ لے۔ چلتے چلتے یہ لوگ ایک ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہ چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ اس کے دامن میں ایک کوٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ کوٹھڑی کا ایک پٹ کھلا تھا۔ انہوں نے لڑکی کو کوٹھڑی کے اندر دھکیل کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ ایک پگڈنڈی پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔ وہ اس طرف چلے گئے۔ لڑکی کو کوٹھڑی میں دھکیلنے سے پہلے انہوں نے اس کی گردن میں سے رسی کھول دی تھی۔

میں بڑا حیران تھا کہ انہوں نے کوٹھڑی کے باہر پہرہ دینے کے لیے اپنا کوئی آدمی کیوں نہیں چھوڑا تھا۔ پھر خیال آیا کہ شاید انہیں پورا یقین ہے کہ اس دور افتادہ خطرناک جنگل میں اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کون آئے گا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس پگڈنڈی پر ایک آدمی آتا نظر آیا جو کوٹھڑی کے باہر آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کے پاس بندوق تھی۔ اب وہ مظلوم لڑکی مسلح پہرے میں تھی۔ میں آگے جا کر کوٹھڑی کا جائزہ لینا چاہتا تھا کہ لڑکی کو وہاں سے نکالنے کی کوئی گنجائش ہے یا نہیں لیکن دن کی روشنی میں کوٹھڑی کے آس پاس جانا میرے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں اور آدمی بھی ہو سکتے تھے۔ بہت ممکن تھا کہ کوٹھڑی کے پیچھے ان لوگوں کا ڈیرہ ہو۔ اگر ان میں سے کسی کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے قتل کر کے لاش جنگل میں پھینک سکتے تھے۔ وہاں کوئی نہیں پوچھنے والا تھا۔ میں نے [illegible] کہ مجھے رات کے اندھیرے میں اس طرف آنا [illegible]۔ یہ حقیقت بھی میرے سامنے تھی کہ لڑکی کو [illegible] کے لیے میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہا۔ زیادہ سے زیادہ ایک دن کے بعد وہ اس لڑکی کو دیوی کی مورتی کے آگے قتل کرنے والے تھے۔

میں خاموشی سے واپس ہو گیا۔

جس طرف سے آیا تھا اسی طرف اپنے آپ کو جھاڑیوں اور درختوں میں چھپاتا چل دیا۔ مجھے کسی ایسی محفوظ جگہ کی تلاش تھی جہاں میں دن کا باقی حصہ گزار سکوں۔ آخر مجھے ایک جگہ مل گئی۔ یہ جگہ ندی سے نکل کر جنگل میں داخل ہونے والے نالے کے قریب ایک بھورے رنگ کی چٹان کا ایک قدرتی غار تھا۔ اسے میں غار نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے دہانے سے صرف بیس پچیس فٹ ہی چٹان کے اندر گیا ہوا تھا۔ اس کا دہانہ قدرتی جھاڑیوں اور گھاس پتوں میں چھپا ہوا تھا۔ مجھے یہ ڈر ضرور لگا کہ کہیں یہ کسی جنگلی درندہ از قسم شیر وغیرہ کی کچھار نہ ہو جہاں رات کو آ کر وہ آرام کرتا ہو۔ غار کے اندر گلے سڑے پتوں اور دلدل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی اور اندھیرا بھی تھا۔ میں نے زمین کو پاؤں سے دبا کر دیکھا مگر زمین دلدلی نہیں تھی بلکہ خشک تھی اور وہاں چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ غار کے منہ کے آگے آئی ہوئی جھاڑیوں اور اونچی اونچی جنگلی گھاس کی وجہ سے غار میں دن کے وقت بھی ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہی نالہ بہہ رہا تھا۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی میں غار سے نکل کر بڑے محتاط انداز میں چلتا ہوا نالے پر گیا۔ کنارے پر بیٹھ کر پانی پیا اور اسی طرح دبے پاؤں چلتا غار میں واپس آ گیا۔ میری جیکٹ کی دونوں جیبیں میٹھے چنوں سے بھری ہوئی تھیں جو میں نے کندرگام کے اسٹیشن کے باہر ایک دکان سے خریدے تھے۔ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں خاموشی سے چنے کھانے لگا۔

O......O......O

بہت جلد مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ میں غار میں آرام سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہاں مچھر بہت زیادہ تھے اور حبس بھی بہت تھا۔ ہوا اتنی ہی آ رہی تھی کہ جو زندہ رہنے کے لیے کافی ہو۔ پھر فضا میں دلدل سیلن اور گلے سڑے پتوں کی ناگوار بو بھی تھی۔ مچھروں نے مجھ پر حملہ کردیا۔ میں ادھر ادھر ہاتھ چلانے لگا لیکن وہ جنگل کے آدم خور مچھر تھے۔ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے لیکن وہ میری نوعمری کا زمانہ تھا۔ بدن میں تازہ گرم خون گردش کررہا تھا۔ اس کے علاوہ مجھ پر ہیرو بننے کی دھن سوار تھی۔ میں تو اس وقت اپنے آپ کو جنگل کی اس زمانے کی مشہور فلم ٹارزن کا ہیرو سمجھ رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھ سے وہاں زیادہ دیر نہ بیٹھا گیا اور میں غار سے نکل کر باہر جھاڑیوں کی آڑ میں بیٹھ گیا۔

یہاں اندر کے مقابلے میں فضا قابل برداشت تھی۔ خطرہ صرف اتنا ہی تھا کہ کہیں مجھ پر کسی کی نظر نہ پڑجائے لیکن میں نے اس کے لیے اپنے آپ کو جھاڑیوں اور اونچی گھاس کی آڑ میں اچھی طرح سے چھپایا ہوا تھا۔ جب آدمی وقت گزارنے کے لیے کسی جگہ خاص طور پر کسی سنسان جنگل میں بیٹھ جائے تو وقت گزارنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے وقت ایک جگہ آ کر رک گیا ہے اور بالکل نہیں گزر رہا۔ مجھے بھی یہی محسوس ہورہا تھا۔ میں آسمان کی طرف دیکھتا جو درختوں کی شاخوں میں سے نظر آرہا تھا۔ درختوں کے اوپر آسمان روشن تھا۔ درختوں کے نیچے تو گہری اور گھنی چھاؤں تھی لیکن درختوں کے اوپر شاید دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں صرف درختوں کی گنجان شاخوں میں سے نظر آنے والے آسمان کو دیکھ کر ہی اندازہ لگا سکتا تھا کہ شام ہوئی ہے یا نہیں لیکن جتنا بھی آسمان مجھے نظر آرہا تھا وہ دھوپ میں روشن تھا۔ میں وہیں بیٹھے بیٹھے چنے کھاتا رہا۔ خدا جانے یہ کس قسم کا آسیبی جنگل تھا کہ کسی پرندے تک کے بولنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ ایسے محسوس ہورہا تھا کہ جیسے سارے جنگل پر ایک دہشت سی طاری ہے۔ کسی جنگلی جانور کے بولنے کی بھی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔

میرے اوپر درختوں کی چلمن میں سے آسمان ابھی تک روشن روشن نظر آرہا تھا۔ چنے کھانے سے جب میری بھوک ختم ہوگئی تو میں آہستہ سے اٹھا۔ جھاڑیوں میں سے بڑے غور سے چاروں طرف خاص طور پر نالے کی طرف نظر دوڑائی۔ جب مجھے اطمینان ہوگیا کہ آس پاس کوئی آدمی نہیں ہے تو میں نالے کے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے جلدی جلدی پانی پیا' منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور جلدی سے اٹھ کر اسی طرح واپس جھاڑیوں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ مجھے وہاں بیٹھے دس پندرہ منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ مجھے فضا میں بیڑی کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔ میرا دوست جان بھی کلکتے میں بیڑی پیتا تھا۔ میں اس کے تمباکو کی بو سے بڑی اچھی طرح سے واقف تھا۔ میں جلدی سے غار میں جا کر اس کے دہانے کے قریب اونچی گھاس کی اوٹ میں چھپ گیا۔ چند لمحوں کے بعد دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ آواز دور سے آرہی تھی اور آہستہ آہستہ قریب ہوتی جارہی تھی۔ میں اونچی گھاس کو ذرا سا ایک طرف ہٹا کر دیکھنے لگا۔ آواز نالے کی طرف سے آرہی تھی۔ میں اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہاں دو آدمی نمودار ہوئے۔ دونوں کے کندھوں سے بندوقیں لٹک رہی تھیں۔ وہ بیڑیاں پی رہے تھے اور بنگلہ زبان میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے آرہے تھے۔ وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں

تھے۔ لیکن میں بڑی اچھی اور محفوظ آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ وہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تو میں انہیں نظر نہیں آسکتا تھا۔ یہ دونوں آدمی لکشمی مندر والے پجاری کے آدمی ہی ہوسکتے تھے۔ ان کا لباس یعنی دھوتی کرتا شہر کے آدمیوں والا لباس تھا۔ وہ جنگل میں رہنے والے دیہاتی نہیں تھے۔ جو تین آدمی اچھوت لڑکی کو تالاب پر اشنان کروانے لائے تھے ان کا بھی یہی لباس تھا۔ یہ شہر کے بڑے مندر کے سنگ دل پجاری کے ساتھی تھے اور شہر سے لڑکی کو اغوا کرکے اسے یہاں دیوی کی مورتی کے آگے قربان کرنے کے لیے لائے تھے۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے میرے سامنے سے گزر گئے' جب ان کی آوازیں آنا بند ہوگئیں تو میں آہستہ سے اٹھ کر غار کے اندر سے نکلا اور وہیں قریب ہی جھاڑیوں کے پاس بیٹھ گیا کیونکہ اندر مچھروں نے مجھ پر دوبارہ حملہ کردیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وقت اس آسیبی جنگل میں آ کر شاید رک گیا ہے لیکن ایسی بات نہیں تھی۔ پھر درختوں پر رات کے وقت بسیرا کرنے والے پرندوں نے بھی آنا شروع کردیا اور جنگل ان کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ یہ بڑا عجیب قسم کا شور تھا جس میں اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے یہ جنگل پرندوں کا بہت بڑا پنجرہ ہے اور میں اس پنجرے میں جانوروں کے ساتھ بند کردیا گیا ہوں۔

جیسے جیسے آسمان کی روشنی ماند پڑتی گئی پرندوں کا شور بھی کم ہوتا ہوگیا۔ سورج غروب ہوتا وہاں دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن سورج غروب ہوچکا تھا اور آسمان پر اب کوئی روشنی نظر نہیں آرہی تھی۔ شام ہوگئی تھی' درختوں میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں وہیں جھاڑیوں میں ہی بیٹھا تھا۔ کسی کسی وقت اٹھ کر ہاتھ پاؤں ہلا لیتا تھا اور پھر وہیں بیٹھ جاتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ جب رات کا اندھیرا گہرا ہوجائے تب اس کوٹھڑی کی طرف جاؤں' جہاں اچھوت لڑکی قید تھی۔ جب چاروں طرف رات کا اندھیرا ہوگیا اور پرندوں کی آوازیں بھی رک گئیں تو کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ رات کتنی گزر گئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اس وقت جاؤں جب وہ لوگ لڑکی کو کھانا وغیرہ کھلا چکے ہوں۔ کیونکہ ست پال نے بتایا تھا کہ لکشمی دیوی پر قربان کرنے سے پہلے لڑکی کو خوب اچھے اچھے کھانے اور حلوہ پوری کھلائی جاتی ہے' تاکہ اس کے جسم میں زیادہ سے زیادہ خون پیدا ہو اور یہ خون اسے ذبح کرکے لکشمی کے چرنوں میں بہایا جائے۔

بڑی خوفناک اور درندہ صفت دیومالا ہے ہندو قوم کی۔ ہماری نسل کے لوگ تو ہندو قوم کی اس بھیانک دیومالا کے تمام پہلوؤں سے واقف تھے لیکن پاکستان کی نئی نسل اپنے وطن کے دشمن کی دیومالا کے اس اصلی روپ سے ناواقف ہے۔ ہماری نئی نسل ڈش پر صرف ان کی عورتوں کے دیومالائی بھارت ناٹیم اور کتھک رقص ہی دیکھتی ہے وہ ہندو دیومالا کے بھیانک روپ سے بالکل ناآشنا ہے۔ میں اپنی نئی نسل کو اپنے دشمن کا اصلی روپ دکھانا چاہتا ہوں جسے میں نے سارے ہندوستان میں اپنی آوارہ گردیوں کے زمانے میں بڑے قریب سے دیکھا ہے۔

رات پڑجانے کے بعد جب کافی وقت گزر گیا اور جنگل کی خاموشی کافی گہری ہوگئی تو میں جھاڑیوں میں سے نکل کر نالے کے ساتھ ساتھ اس ٹیلے کی طرف چلنے لگا جس کے نشیب میں کوٹھڑی تھی۔ جنگل کا راستہ مجھے اندھیرے میں بھی یاد تھا۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ شہر کے کسی مکان کا کمرہ بند کرکے کھڑکیوں کے پردے گرادیے جائیں ساری بتیاں گل کردی جائیں تو کمرے میں اتنا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ کچھ

نظر نہیں آتا اور آدمی میز کرسیوں سے ٹکرانے لگتا ہے لیکن جنگل کے اندھیرے میں ایسی بات نہیں ہوتی۔ جنگل میں کتنی ہی تاریک رات کیوں نہ چھا جائے پھر بھی درختوں اور جھاڑیوں وغیرہ کے دھندلے دھندلے خاکے نظر آتے رہتے ہیں۔ کچھ میں بھی جنگل کی راتوں کے اندھیرے کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے اندھیری رات میں بھی جنگل میں وہ درخت نظر آرہے تھے جن کے قریب سے ہو کر مجھے ٹیلے کی طرف جانا تھا۔ جہاں مجھے نالے سے الگ ہونا تھا وہاں میں اس سے الگ ہو گیا اور کچھ فاصلے پر جو ٹیلا دھندلا سا نظر آرہا تھا اس طرف چلنے لگا۔ یہاں میں محتاط ہو گیا تھا۔ میں دبا دبا کر قدم اٹھا رہا تھا تا کہ چلتے وقت آہٹ پیدا نہ ہو۔

اوس پڑنے کی وجہ سے گھاس گیلی اور بے آواز ہو گئی تھی۔ میں ٹیلے سے ہٹ کر درختوں کے جھنڈ کی طرف چلا گیا اور اوپر کا لمبا چکر کاٹ کر ٹیلے کے قریب آ کر ایک جگہ درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ سامنے کچھ فاصلے پر ٹیلے کے نشیب میں بنی ہوئی کوٹھڑی دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ میں بڑے غور سے اس کے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے باہر وہ مسلح شخص نہیں بیٹھا تھا جسے میں نے دن کے وقت پہرے پر بیٹھے دیکھا تھا۔ شاید وہ اپنی ڈیوٹی دے کر چلا گیا تھا اور اب اس کی جگہ کوئی دوسرا آدمی آنے والا تھا۔ ایک اعتبار سے جائے واردات خالی پڑی تھی۔ پھر بھی میں پوری تسلی کرنا چاہتا تھا کہ آس پاس تو کوئی مسلح آدمی گشت نہیں کر رہا۔ میں نے سرمئی اندھیرے میں ٹیلے کے اردگرد نظریں دوڑائیں۔ مجھے وہاں کوئی آدمی چلتا پھرتا نظر نہ آیا مگر میں ابھی تک مطمئن نہیں ہوا تھا۔ میں نے فضا کو سونگھا فضا میں بیڑی کے تمباکو کی کوئی بو نہیں تھی۔ یہ لوگ بیڑیاں بہت پیتے تھے۔ اگر وہاں ان میں سے کوئی ہوتا تو فضا میں بیڑی کی بو ضرور پھیلی ہوتی۔ میں نے کان لگا کر جنگل کی خاموشی کو سننے کی کوشش کی۔ کسی طرف سے کسی قسم کی کوئی آہٹ یا آواز نہیں آرہی تھی۔ میں اٹھا اور جھک کر آہستہ آہستہ کوٹھڑی کے عقب کی طرف بڑھنے لگا۔ میں بالکل سلوموشن میں چل رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ کوٹھڑی کے پیچھے ضرور کوئی کھڑکی ہو گی میں اسے توڑ کر لڑکی کو نکال لے جانے کی کوشش کروں گا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ ایسا فلموں میں ہی ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اول تو میرے پاس کھڑکی توڑنے کے لیے کوئی اوزار نہیں تھا۔ دوسرے اگر میں نے کھڑکی توڑنے کی کوشش کی تو اس کی آواز پیدا ہو گی اور یہ آواز قاتل پجاریوں کو ہوشیار کر دے گی لیکن جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، یہ میری جوانی کے گرم خون اور ایک مظلوم لڑکی کی بے اختیار مدد کرنے کا جذبہ تھا جس نے مجھے بہت حد تک دلیر اور کسی حد تک بے وقوف بنا رکھا تھا۔ یہ میری بے وقوفی ہی تھی کہ میں بغیر سوچے سمجھے موت کے منہ میں چلا جا رہا تھا لیکن یقین کریں کہ اگر آپ بے وقوفی میں بھی کسی مظلوم انسان کی مدد کرنے چل پڑتے ہیں تو خدا اس طرح آپ کی مدد کرتا ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

بشرطیکہ آپ کی نیت نیک ہو اور بے وقوف آدمی عام طور پر بدنیت نہیں ہوتے۔ میں بے طرح اگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس اور پودوں میں سے پھونک پھونک کر قدم رکھتا کوٹھڑی سے بیس پچیس فٹ کے فاصلے پر پہنچ کر رک گیا۔ جنگل کی تاریک رات ساکت اور خاموش تھی۔ کوئی پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ ابھی تک نہ کسی نے مجھے دیکھا تھا نہ میں نے کسی کو

دیکھا تھا کوٹھڑی کے بند دروازے کے آگے کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ میں جھک کر چلتا کوٹھڑی کے پیچھے آ گیا۔ یہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں نے اندھیرے میں بڑے غور سے دیکھا۔ مجھے کوٹھڑی کی پچھلی دیوار میں کوئی کھڑکی وغیرہ دکھائی نہ دی۔ دیوار کے ساتھ جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ میں ہمت کر کے گھٹنوں کے بل چلتا جھاڑیوں کے پاس چلا گیا۔ دیوار، پتھر جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ کان لگایا۔ کوٹھڑی میں سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں اسی طرح گھٹنوں کے بل دیوار کے ساتھ چلتا کونے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے سر ذرا سا آگے نکال کر دیکھا۔ کوٹھڑی کا دروازہ مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھا۔ باہر کوئی پہرے دار وغیرہ نہیں تھا۔ میں دیوار سے لگ کر بلی کی طرح چاروں ہاتھ پاؤں چلتا دروازے کے پاس آ گیا۔

دروازہ بڑی مضبوط لکڑی کا تھا۔ میں کھڑے ہو کر دروازے کے ساتھ لگ گیا۔ ایک بار پھر تاریکی میں سامنے اور اردگرد کے درختوں کی طرف دیکھا۔ رات سنسان تھی۔ کوئی پہرے دار وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے تالے کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ یہ دیسی تالا تھا اور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس زمانے کے دیسی تالوں کو چابی گھما کر کھولا جاتا تھا اس کے کنڈے کے درمیان کافی جگہ تھی۔ میں نے اسے پکڑ کر نیچے کو جھٹکا دیا۔ مگر تالا اپنی جگہ پر قائم رہا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں اس کے کنڈے کے درمیان درخت کی کوئی مضبوط شاخ ڈال کر اسے اوپر سے نیچے دو چار جھٹکے دوں تو تالا کھل سکتا ہے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ گھٹنوں کے بل چل کر کوٹھڑی کے پیچھے جو درخت تھا ان کے پاس جا کر درخت کی کوئی گری پڑی ٹہنی تلاش کرنے لگا۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے ایک ٹہنی مل گئی۔ یہ مضبوط ڈنڈے کی طرح کی تھی۔ میں اسے لے کر دروازے کے پاس واپس آ گیا۔ ٹہنی کا ڈنڈا تالے کے کنڈے کے اندر سے گزر گیا۔ میں نے اس کے اگلے سرے کو دروازے کے ساتھ ٹکایا اور دونوں ہاتھوں سے اسے اوپر سے نیچے کی طرف زور سے جھٹکا دیا۔ تالا اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ مجھے یہ خیال بھی رکھنا پڑ رہا تھا کہ جھٹکا لگنے سے آواز پیدا نہ ہو۔ میں نے دو تین بار کوشش کی مگر تالا نہ کھلا۔ کم بخت بڑا مضبوط تالا تھا۔ مجھے کسی کے رونے کی دبی دبی آواز سنائی دی۔

میں دروازے کی درز تلاش کرنے لگا۔ رونے کی آواز کوٹھڑی کے اندر سے آرہی تھی۔ دروازے میں کوئی نہ کوئی جھری وغیرہ ضرور ہو گی مگر اندھیرے میں وہ مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا کر سنا۔ رونے کی آواز اندر سے آرہی تھی اور یہ مظلوم لڑکی کی آواز تھی جو دبی دبی آواز میں رو رہی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ظالم لوگ اسے دیوی کی بھینٹ چڑھانے والے ہیں۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مجھے کسی پہرے دار کے آ جانے کا بھی دھڑکا لگا تھا۔ میں نے تالا توڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایک بار میں نے زور سے جھٹکا دیا تو تالا کھل گیا۔ میں نے اسے دروازے کے کنڈے میں سے نکال کر ایک طرف زمین پر رکھ دیا اور دروازے کو آہستہ سے کھولا۔ دروازہ کم بخت چرچرایا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ کوٹھڑی میں لڑکی کے رونے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ اس نے سہمی ہوئی خشک آواز میں کہا۔

”مجھ پر دیا کرو (رحم کرو)، میری بھینٹ نہ دو۔“

میں جلدی سے کوٹھڑی میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر دیا۔ کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

”میں تمہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔ جلدی

سے میرے ساتھ باہر آ جاؤ۔ جلدی کرو۔''

کوٹھڑی میں خاموشی چھا گئی۔ نہ مجھے لڑکی نظر آ رہی تھی نہ لڑکی کو میں دکھائی دے رہا تھا۔ ہم دونوں اندھیرے کے سمندر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لڑکی نے ڈرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں، میں نہیں جاؤں گی۔ مجھ پر دیا کرو، مجھے دیوی کی بھینٹ نہ چڑھاؤ۔''

میں دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر جس طرف سے لڑکی کی آواز آئی تھی اس طرف بڑھا۔ میرا ایک ہاتھ لڑکی کے کندھے اور ایک اس کے منہ پر جا کر لگا۔ اس کی آنکھیں اور رخسار گیلے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کہا۔

''میں تمہارے بھائی کی طرح ہوں۔ جلدی سے میرے ساتھ یہاں سے بھاگ چلو۔ نہیں تو وہ لوگ تمہیں دن نکلتے ہی مار ڈالیں گے۔''

لڑکی کو میں نے دل سے بھائی کہا تھا۔ اس پر اس کا اثر ہو گیا۔ وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔

''باہر پجاری لوگ تو نہیں ہیں؟''

میں نے کہا۔

''باہر اس وقت کوئی نہیں۔ وقت ضائع نہ کرو۔ اگر کوئی آ گیا تو تمہارے ساتھ میں بھی قتل ہو جاؤں گا۔''

میں نے لڑکی کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ لڑکی اندھیرے میں دروازے کی طرف بڑھی۔ دروازے کے پاس آ کر میں نے دروازے کو ٹٹول کر دیکھا۔ پھر آہستہ سے اس کا ایک پٹ کھول دیا۔ ایک بار پھر دروازہ چرچرایا۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔ لڑکی بھی ڈر کر میرے ساتھ لگ گئی۔

دوسرے لمحے ہم دروازے سے باہر نکل گئے تھے اور لڑکی میرے ساتھ رات کی تاریکی میں جھاڑیوں اور درختوں میں بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ میرا رخ نالے کی طرف تھا۔

O......O......O

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں لڑکی کو موت کے منہ سے نکال کر لے آیا ہوں۔ لڑکی دبلی پتلی تھی۔ میرے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ نالے کے قریب پہنچ کر جہاں درخت جھاڑیاں گنجان ہو گئیں ہم بھاگنے کی بجائے تیز تیز چلنے لگے۔ میں نے اندھیرے میں ہی دیکھ لیا تھا کہ ہم رام ناتھ کے تالاب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے آگے نکل گئے ہیں۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ لکشمی دیوی کے پجاری جو بندوقیں لے کر پھر رہے تھے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ شاید رات کو انہوں نے زیادہ تاڑی پی لی تھی اور کہیں بے ہوش پڑے تھے۔ بہر حال میں نے ہیرو کا کردار ادا کر دیا تھا اور لڑکی کو دشمنوں کے نرغے سے نکال کر لے آیا تھا۔

میں صحیح سمت کو جا رہا تھا۔ آخر ہم اس جگہ آ گئے جہاں نالہ ندی میں سے نکل کر جنگل میں داخل ہوتا تھا۔ ہم نے ندی کا پل پار کیا تو سامنے کندرگام ریلوے اسٹیشن کی بتیاں نظر آنے لگیں۔ ان روشنیوں کو دیکھ کر میرا حوصلہ بلند ہو گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں مہذب دنیا میں آ گیا ہوں اور اب ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اسٹیشن کی ایک جانب کندرگام کی آبادی میں بھی کہیں کہیں روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں پولیس کی چوکی بھی ہوگی اور پولیس ہماری ضرور حفاظت کرے گی۔ کیونکہ کسی انسان کو کسی دیوی کی بھینٹ چڑھانا قتل کے جرم کے برابر تھا۔

میں لڑکی کو لے کر سیدھا کندرگام کے اسٹیشن آ گیا۔ اسٹیشن کی گھڑی رات کا ڈیڑھ بجا رہی تھی۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ بکنگ آفس کی کھڑکی بند تھی۔

صرف ایک کمرے میں ایک بابو رجسٹر سامنے رکھے بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے کلکتہ جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا تو اس نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''صبح جائے گی۔''

ہم خالی پلیٹ فارم پر آ کر ایک بند اسٹال کے پاس جہاں تھوڑا اندھیرا تھا بیٹھ گئے۔ لڑکی سانولے رنگ کی تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ ناک میں سرخ نگ والا کوکا تھا۔ وہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ لوگ اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہارا نام کیا ہے؟''

لڑکی نے آہستہ سے کہا۔ ''رانی۔''

اس کے باوجود کہ ہم خطرے سے بہت حد تک دور ہو گئے تھے میں اس علاقے سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہتا تھا۔ صبح ہونے میں ابھی بہت وقت تھا۔ لڑکی رانی بند اسٹال کی لکڑی کی دیوار سے ٹیک لگا کر سمٹ کر بیٹھی تھی۔

میری نگاہیں بار بار خالی پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ڈر اس بات کا تھا کہ اگر پجاری قاتلوں کو لڑکی کے فرار کا علم ہو گیا تو وہ اس کی تلاش میں ریلوے اسٹیشن پر ضرور آئیں گے۔ پہلے میں نے سوچا کہ لڑکی کو پولیس چوکی لے جاتا ہوں پھر خیال آیا کہ پولیس کی مصیبت خواہ مخواہ گلے نہ پڑ جائے۔ وہیں بیٹھا رہا۔ مگر میں سکون سے نہیں بیٹھا ہوا تھا مجھے بے چینی لگی ہوئی تھی۔

کلکتے کی طرف جانے والی ٹرین صبح کے وقت آتی تھی۔ کم از کم ریلوے بابو نے مجھے یہی بتایا تھا اور صبح تک مندر کے قاتل پجاریوں کو لڑکی کے فرار کا علم ہو جانا یقینی تھا اور ان کا لڑکی کی تلاش میں اسٹیشن پر آنا بھی یقینی تھا۔

طرح طرح کے وسوسے میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ رات بڑی آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ لڑکی کو ساتھ لے کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کسی اگلے اسٹیشن پر بیٹھ کر ٹرین کا انتظار کرتا ہوں۔ اس اسٹیشن پر بیٹھنا خطرناک ہے پھر خیال آیا کہ رات کا وقت ہے۔ راستے میں جنگل پڑتا ہے۔ راستہ میرا دیکھا ہوا بھی نہیں ہے۔ کہیں اس طرف سے ان لوگوں میں سے کوئی نکل نہ آئے۔ ان ہی خیالات میں گم میں لڑکی کے ساتھ بیٹھا رہا۔ پلیٹ فارم کا جائزہ میں لے رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر جہاں اسٹیشن کے آفس کا دروازہ تھا، اس کے اندر سے دو آدمی باہر نکلے۔ ان میں سے ایک شاید قلی تھا۔ اس نے کوئی بکس سر پر اٹھا رکھا تھا۔

دوسرا اسٹیشن ماسٹر یا اس کے دفتر کا کوئی کلرک وغیرہ تھا۔ قلی نے بکس پلیٹ فارم پر آگے جا کر رکھ دیا۔ دوسرا آدمی واپس دفتر میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور آدمی نمودار ہوا۔ ایک جگہ پلیٹ فارم پر ریلوے کی پٹڑی کا ایک ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ اس کے پاس آ کر اس نے لوہے کی موٹی سلاخ سے اسے بجانا شروع کر دیا۔ یہ گھنٹی اس بات کا اعلان تھا کہ ٹرین آنے والی ہے۔

میں نے تھوڑا سکھ کا سانس لیا لیکن ابھی رات کا وقت تھا۔ کلکتے جانے والی ٹرین کو صبح جانا تھا۔ میں نے رانی سے کہا کہ میں اس آدمی سے جا کر پتہ کرتا ہوں کہ اس وقت کون سی گاڑی آ رہی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ گاڑی کلکتے سے آ رہی ہو۔ لڑکی نے سہمی ہوئی نظروں سے میری طرف منہ کیا اور بولی۔

''دیر نہ لگانا۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایک منٹ میں واپس آ جاؤں

گا۔"

گھنٹی بجانے والا آدمی چلا گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر جو آدمی بکس لایا تھا وہ بکس کے اوپر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"کلکتہ ایکسپریس آ رہی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کلکتہ جانے والی گاڑی ہے؟"

اس نے کہا۔ "ہاں بابو' یہ کلکتے جانے والی گاڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو سنا تھا کہ صبح کو آتی ہے۔"

وہ بولا۔ "تم نے غلط سنا ہے۔ کلکتہ ایکسپریس اسی وقت آتی ہے۔ آج یہ رائٹ ٹائم پر آ رہی ہے۔"

میں جلدی جلدی چلتا لڑکی رانی کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ گاڑی آ رہی ہے۔ میں خاموشی سے اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں نے ٹکٹ تو لیے نہیں۔ میں نے لڑکی سے کہا۔

"میں ٹکٹ لے آؤں۔ تم یہیں رہنا۔"

اور تیز تیز قدموں سے چلتا باہر بکنگ آفس کے پاس آ گیا۔ بکنگ آفس کی کھڑکی کھلی تھی۔ اندر بتی جل رہی تھی۔ میں نے کلکتے تک کے تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ لیے اور واپس آ کر ایک ٹکٹ رانی کو دے دیا۔ "اسے سنبھال کر رکھنا۔"

وہ ڈری ہوئی آواز میں بولی۔ "پجاری لوگ تو نہیں ہیں؟"

میں نے اسے تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تک سب خیر خیریت ہے۔ پلیٹ فارم ابھی تک خالی پڑا تھا۔ وہاں سوائے ہم لوگوں کے اور کوئی مسافر نہیں تھا۔ تھوڑی دیر بعد زور سے ریل گاڑی کی سیٹی کی آواز آئی۔ میں نے خوش ہو کر لڑکی سے کہا۔ "گاڑی آ گئی ہے۔ ابھی بیٹھی رہو۔"

تھوڑی دیر بعد کلکتہ ایکسپریس آ کر پلیٹ فارم پر رک گئی۔ ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں رانی کو لے کر تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں گھس گیا۔ اکثر مسافر جن میں عورتیں بھی تھیں' سو رہے تھے۔ میں کھڑکی میں سے برابر باہر پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹرین بمشکل دو تین منٹ رکی ہوگی۔ گارڈ نے سیٹی دی اور ٹرین چل پڑی۔ جب ٹرین کافی آگے نکل گئی اور اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

دن کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا کہ ٹرین کلکتے کے اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ میں لڑکی کو لے کر اسٹیشن سے باہر آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟ میں تمہیں تمہارے ماتا پتا کے پاس پہنچانا چاہتا ہوں۔"

لڑکی نے مجھے کسی محلے کا نام بتایا جو میرے لیے اجنبی تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "رکشے والے کو یہ پتا بتا دینا۔"

باہر آ کر ہم نے ایک موٹر رکشا لے لیا۔ لڑکی نے بنگلہ زبان میں رکشے والے کو اپنے علاقے کا پتہ بتایا۔ رکشا چل پڑا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ جب ہمارا رکشا شہر کے ایک دور دراز غریبانہ سے گنجان آباد محلے میں داخل ہو گیا۔ لڑکی نے رکشے والے کو اپنی زبان میں ایک طرف چلنے کو کہا۔ ایک جگہ بوسیدہ سی جھونپڑیاں ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک جھونپڑے میں لڑکی کے ماں باپ رہتے تھے۔ لڑکی دوڑ کر اپنی جھونپڑی میں گھس گئی۔ اندر سے لڑکی کے اونچی اونچی رونے کی آواز آنے لگی۔

میں رکشے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بیمار سا آدمی باہر نکلا اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بھی تھی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور

بنگلہ زبان میں جھک جھک کر میرا شکریہ ادا کرنے لگے۔ لڑکی بھی جھونپڑی کے دروازے میں ساڑھی کے پلو سے آنسو پونچھتی آن کھڑی ہوئی۔ میں نے کہا۔

"رانی کو اب کچھ روز باہر نہ نکلنے دینا۔" یہ کہہ کر میں رکشے میں بیٹھ گیا اور اسے چت پور روڈ کی طرف چلنے کو کہا۔ سراج بلڈنگ میں آ کر جب میں نے جان کو اپنا سارا ایڈونچر سنایا تو وہ حیرت کی تصویر بنا میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"اس بار تو جو ہو گیا سو ہو گیا مگر آئندہ ایسی حماقت کبھی نہ کرنا۔ تم یہاں کے پجاری لوگوں کو نہیں جانتے۔ لکشمی دیوی کی بھینٹ کا معاملہ ان کے دھرم کا معاملہ ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ خود بھی سلامت واپس آ گئے۔ یہاں کرسٹول اسٹریٹ میں لکشمی دیوی کا مندر ہے۔ خدا کے لیے اس مندر کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "یار ان باتوں کو چھوڑو اور مجھے ناشتہ کراؤ۔ کل سے میٹھے چنے کھا رہا ہوں۔"

جان ایک پرانے رجسٹر پر کچھ حساب کتاب لکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "میں نے تو ناشتہ کر لیا۔ تم نیچے جا کر ناشتہ کر آؤ۔"

سراج بلڈنگ کی دکانوں میں ایک چھوٹا سا بنگلہ ریستوران تھا۔ میں نے وہاں بیٹھ کر ناشتہ کیا اور پان والے کی دکان پر آ گیا۔ میں کبھی کبھی یونہی شوقیہ سگریٹ پی لیا کرتا تھا۔ اس وقت میرا سگریٹ پینے کو جی رہا تھا۔ میں نے قینچی کا ایک سگریٹ لیا اور وہیں کھڑے ہو کر سگریٹ پینے لگا۔

پان والے کی دکان پر ریڈیو لگا ہوا تھا اور بنگلہ گیت گائے جا رہے تھے۔ سڑک پر سے ٹرام گزر گئی۔ میں اسے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ پان سگریٹ والے نے دکان میں اگربتیاں سلگا رکھی تھیں۔ میں وہیں ایک طرف کھڑا سگریٹ پیتا رہا۔

میرے قریب ہی ایک کالے رنگ کا دبلا پتلا بنگالی بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر بیڑی پی رہا تھا۔

غیر ارادی طور پر میری نگاہ اس پر پڑی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ پہلے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ سگریٹ ختم کر کے میں نے اسے سڑک پر پھینکا اور واپس جانے کے لیے مڑا تو میں نے دیکھا کہ بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا بنگالی مجھے مسلسل گھور رہا تھا۔

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے بھی اسے غور سے دیکھا تو اسے پہچان لیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب میں اچھوت لڑکی رانی کو اس کے ماتا پتا کے حوالے کر کے واپس جانے لگا تھا تو یہ بنگالی جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میں نے اسے محض ایک اتفاق خیال کیا اور اس کا خیال دل سے نکال دیا اور اوپر اپنے دوست جان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

جان اس وقت سلولائیڈ کے چھوٹے چوکور ٹکڑے جوڑ جوڑ کر ایک ڈبے میں رکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"یار مجھے بے حد نیند آ رہی ہے۔ ساری رات کا جاگا ہوا ہوں۔ میں تو سونے لگا ہوں۔"

وہ بولا۔ "سو جاؤ' سو جاؤ۔"

میں دیوار کے ساتھ جو پرانی چارپائی بچھی رہتی تھی اس پر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اور پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔ شام ہو رہی تھی جب جان نے مجھے جگایا۔ کہنے لگا۔

"اٹھو یار! باقی رات کو سونا۔"

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میرے لیے اتنی گہری نیند سونا کس قدر ضروری تھا۔ میں بالکل تازہ دم تھا۔ جان نے کہا۔

''میں زکریا اسٹریٹ چچا کے پاس جا رہا ہوں۔ انہیں پچھلے پندرہ دنوں کا حساب لکھوانا ہے۔ مجھے وہاں دس بج جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس بھوت بنگلے میں اکیلا بیٹھ کر کیا کروں گا۔''

وہ بولا۔ 'پیراڈائز ٹاکیز میں مار دھاڑ کی انگریزی فلم لگی ہے' وہ دیکھنے چلے جاؤ۔ وقت بھی گزر جائے گا اور تمہاری تفریح بھی ہو جائے گی۔''

مجھے اس کی تجویز پسند آئی۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔''

اس وقت پہلے شو کا ٹائم ہو رہا تھا۔ میں پیراڈائز سینما کی طرف اور جان زکریا اسٹریٹ کی طرف چل دیا۔ سینما ہاؤس ٹرام کار کے روٹ میں تھا اور ہماری بلڈنگ سے دور تھا۔ میں سراج بلڈنگ سے نکل کر سامنے والے ٹرام کار کے اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا۔ دو تین اور لوگ بھی کھڑے تھے۔

اتنے میں ایک ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی والی عورت بھی آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس عورت نے اپنے بالوں کے جوڑے میں رجنی گندھا کے پھول لگا رکھے تھے۔ اس کا رنگ عام بنگالی عورتوں کی طرح سانولا نہیں تھا بلکہ کھلتا ہوا گورا رنگ تھا۔ میں نے اسے ایک عام نظر سے دیکھا اور جیسے اسے بھول گیا۔ اتنے میں ٹن ٹن کی آواز پیدا کرتی ٹرام آ کر ہمارے قریب رک گئی۔ میں بھی اس میں سوار ہو گیا۔

نیلی ساڑھی والی عورت بھی سوار ہو گئی۔ میرے ساتھ والی سیٹ خالی دیکھ کر وہ میرے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بیٹھتے ہی مجھے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو آئی۔ اس زمانے میں یہ پرفیوم بڑا پاپولر تھا اور اس کی نیلے رنگ کی شیشی ہوا کرتی تھی۔ اس عورت نے بھی یہی پرفیوم لگا رکھا تھا۔ اس کا جسم کسی وقت چلتی ٹرام کے ہلکے ہلکے ہچکولوں میں میرے ساتھ لگ جاتا تھا۔ پہلی بار ٹرام کے موڑ کاٹتے ہوئے اس کا جسم میرے ساتھ لگا تو وہ ذرا پیچھے ہٹ گئی اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سوری۔''

پیراڈائز سینما کے اسٹاپ پر ٹرام رکی تو میں جلدی سے نیچے اتر گیا کیونکہ ٹرام زیادہ دیر نہیں رکا کرتی تھی۔ لوگ چلتی ٹرام کار میں بھی چڑھ جایا کرتے تھے۔ پیراڈائز سینما میں کافی رش تھا۔

میں عام طور پر سیکنڈ کلاس میں بیٹھتا تھا کیونکہ سیکنڈ کلاس سینما کی اسکرین یعنی پردہ سیمیں سے نہ تو زیادہ دور ہوتی تھی اور نہ اتنا قریب ہوتی تھی کہ سر اٹھا کر فلم دیکھنی پڑے۔ سیکنڈ کلاس کی بکنگ پر بھی قطار لگی تھی۔ میں نے قطار میں کھڑے ہو کر ٹکٹ خریدا اور سینما ہال میں آ کر درمیان والی کرسیوں کی قطار میں بیٹھ گیا۔

ہال تقریباً خالی پڑا تھا۔ اس سینما ہاؤس کا ہال بہت بڑا تھا۔ یہ بھی کسی زمانے میں تھیٹر ہوا کرتا تھا اور یہاں آغا حشر کاشمیری کے اسٹیج ڈرامے ہوا کرتے تھے۔ اتنے بڑے ہال میں لوگ آنا شروع ہو گئے۔ بعض مرد اپنے بال بچوں کو لے کر آئے ہوئے تھے۔ شو ٹھیک ساڑھے چھ بجے شام شروع ہو جاتا تھا۔

پہلی گھنٹی بج چکی تھی۔ تیسری گھنٹی بجنے کے بعد ہال کی بتیاں گل کر دی جاتی تھیں اور اسکرین پر کمرشل یا آنے والی فلموں کی سلائیڈیں آنا شروع ہو جاتی تھیں۔ اس کے بعد آنے والی فلموں کے نمونے دکھائے جاتے تھے اور پھر فلم شروع ہو جاتی تھی۔

میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اچھوت لڑکی رانی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ خدا نے اس کی زندگی لکھی ہوئی تھی اور وہ بچ گئی ورنہ اس کا ان ظالموں کی قید سے بچ کر نکل آنا ناممکن تھا۔ تیسری گھنٹی بجی اور سینما ہال کی بتیاں ایک ایک کر کے گل ہو گئیں۔ ہال میں اندھیرا ہو گیا اور اسکرین پر سلائیڈیں دکھائی جانے لگیں۔

مجھے ان میں سے دو سلائیڈیں یاد رہ گئی ہیں۔ ایک سلائیڈ اس زمانے کے مشہور بسکٹ ساز ادارے جے پی منگارام کے بسکٹوں کی سلائیڈ تھی اور دوسری لپٹن چائے کی سلائیڈ تھی۔ سلائیڈیں انگریزی اور بنگلہ زبان میں تھیں۔ اتنے میں کوئی میرے ساتھ والی خالی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور سلائیڈ پر لکھی ہوئی انگریزی پڑھتا رہا۔ اچانک مجھے ایوننگ ان پیرس کی خوشبو آئی۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اسکرین پر سلائیڈوں کی چمک کی وجہ سے ہال میں ہلکی چاندنی کی طرح کی روشنی کا غبار سا پھیلا ہوا تھا۔

دھیمی چاندنی کے اس غبار میں' میں نے اپنی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کو پہچان لیا۔ یہ وہی رجنی گندھا کے جوڑے والی عورت تھی جو ٹرام میں میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ میں نے دل میں سوچا کہ عجب اتفاق ہے۔ یہ عورت ٹرام کار میں بھی میرے ساتھ بیٹھی تھی اور سینما ہاؤس میں وہی میری ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہے۔

کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ میں نے سوچا اور اپنی نظریں پردہ سیمیں یعنی اسکرین کی طرف کر لیں۔ اسکرین پر اب آنے والی فلموں کے نمونے دکھائے جا رہے تھے۔

O.....O.....O

مجھے یاد ہے ان نمونوں میں ڈائریکٹر محبوب کی مشہور زمانہ فلم ''روٹی'' کا بھی نمونہ تھا جس کی ہیروئن اختری بائی فیض آبادی تھی۔ نمونوں کے بعد انگریزی فلم شروع ہو گئی۔ اس زمانے میں بمبئی' کلکتہ اور مدراس ایسے بڑے شہروں کی ریل گاڑیوں اور سینما ہالوں کی سیکنڈ کلاس اور انٹر کلاس میں عورتیں اور مرد ساتھ ساتھ سفر کرتے تھے۔ ریل گاڑیوں کی تو تھرڈ کلاس میں بھی عورتیں اور مرد اکٹھے بیٹھتے تھے۔ اس بات کو ہرگز معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کو بڑا نارمل سمجھا جاتا تھا۔

میرا مزاج بھی اس زمانے کا مزاج تھا اور میں نے بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی ہوئی ہے۔ ہاں یہ خیال ضرور آیا تھا کہ کیسا اتفاق ہے کہ جو عورت ٹرام کار میں میرے ساتھ بیٹھی تھی وہی عورت سینما ہال میں میرے ساتھ بیٹھی ہے۔ پھر میں بھی اسے ایک اتفاق سمجھ کر بھول گیا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ایسا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا۔ فلم شروع ہو چکی تھی۔ جاسوسی فلم تھی۔ اس کا آغاز بھی بڑے حیرت انگیز انداز میں ہوا تھا۔ میں فلم دیکھنے میں محو تھا' میرا دایاں ہاتھ سیٹ کے بازو پر تھا۔ عورت کا ہاتھ ساتھ والی سیٹ کے بازو پر تھا۔ اچانک میں نے اپنے ہاتھ پر عورت کے ہاتھ کی دو انگلیاں محسوس کیں۔ میں نے ذرا مڑ کر دیکھا۔ عورت نے جلدی سے انگلیاں ہٹا لیں۔

مجھے عورت کی یہ حرکت بڑی عجیب اور غیر معمولی لگی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ عورت باقاعدہ ایک منصوبے کے تحت ایسا کر رہی ہے۔ کچھ وقت خاموشی سے گزر گیا۔ اس کے بعد عورت نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ کے اوپر رکھ دیا۔ میرا ہاتھ سیٹ پر جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ میرے جسم میں عجیب قسم کا ہیجان سا پیدا ہونے لگا۔ میں نے عورت کے ہاتھ کے نیچے سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بعد اس عورت نے اس قسم کی کوئی حرکت نہ کی۔ جب انٹرول ہوا تو عورت نے میری طرف دیکھ کر ہلکے سے تبسم کے ساتھ بڑی صاف اردو میں کہا۔ ''بڑی دلچسپ فلم ہے۔''

میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔''

میں عورت سے آنکھیں چار کرتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ مجھے یوں شرم سی محسوس ہو رہی تھی جیسے مجھ سے کوئی نازیبا حرکت سرزد ہوگئی ہو مگر وہ عورت مجھے مسلسل دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک مقناطیسی کشش تھی، یا مجھے محسوس ہو رہی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ عورت مجھے اپنے طلسمی حلقے میں لے رہی ہے۔ کہنے لگی۔

"تم بنگال کے نہیں لگتے۔ پنجاب سے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔ "ہاں، پنجاب کے شہر امرتسر سے آیا ہوں۔"

اب وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تمہارا رنگ روپ دیکھ کر ہی سمجھ گئی تھی کہ تم پنجابی ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ کہنے لگی۔

"تم مسلمان ہو۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میرا نام نسیمہ ہے۔ دلی میں ہمارا گھر ہے۔ میں دلی کے اندر اپرستھا کالج میں لیکچرار ہوں۔ آج کل ہندو دھرم پر ریسرچ ورک کر رہی ہوں۔ اس سلسلے میں بنگال کے مندروں کا جائزہ لینے آئی ہوں، میں یہاں لڑکیوں کے ایک ہوسٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔"

میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ وہ مسلمان ہو کر ہندو دھرم پر ریسرچ کیوں کر رہی ہے۔ مجھے اس وقت اتنا شعور ہی نہیں تھا۔ دوسرے مجھے اس سے اتنی زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔ پھر اس نے خود ہی کہا۔

"جب میں نے تمہیں ٹرام کار کے اسٹاپ پر دیکھا تو پتہ نہیں کیوں تم مجھے بڑے اچھے لگے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ میں نے بھی آج پیراڈائز میں فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟"

میں نے اسے بتادیا کہ میں لوئر چیت پور روڈ پر اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ بات مجھے اسے نہیں بتانی چاہیے تھی مگر ایک تو وہ میری جوانی کا زمانہ تھا جب آدمی پر جذبات کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے۔ دوسرے میں شروع ہی سے بہت زیادہ جذباتی تھا۔ ہاف ٹائم ختم ہوگیا۔ ہال میں اندھیرا ہوگیا اور فلم دوبارہ شروع ہوگئی۔ کچھ دیر کے بعد اس عورت نے ایک بار پھر میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے ہاتھ پیچھے کرنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ایک بار تو مجھے پسینہ آ گیا۔ فلم ختم ہوئی تو سینما ہاؤس سے باہر آ کر اس عورت نے مجھ سے کہا۔

"چلو کہیں چل کر کافی پیتے ہیں۔"

میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اس وقت میرا بھی اس کے ساتھ کافی پینے کو جی چاہ رہا تھا۔ بس یونہی وہ عورت مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ ایسے حالات میں تو عقلمند سے عقلمند آدمی بھی ایک بار چکر کھا جاتا ہے اور میرے اندر تو عقل کی پہلے ہی بہت کمی تھی اور صرف جذبات ہی جذبات تھے جو اس عمر میں آگ ہوتے ہیں۔

بوندا باندی بھی شروع ہوگئی جس نے ماحول کو اور زیادہ رومانٹک بنادیا۔ ہم ٹیکسی رکشے کا انتظار کرنے لگے۔ وہ بولی۔

"ریستوران کو چھوڑو۔ ہوسٹل چلتے ہیں وہاں ایک مہمان کو ساتھ لانے کی اجازت ہے۔ میں اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر تمہیں پلاؤں گی۔"

میں پہلے ہی رومانوی فضا میں اڑ رہا تھا۔ اس نے یہ بات کہی تو پرواز کچھ اور بلند ہوگئی لیکن پھر میں نے اچانک اس سے معذرت کر لی اور اگلی صبح اس سے ملنے کا وعدہ کرلیا۔ صبح جب میں اس کے ہاسٹل پہنچا تو وہ مجھے گیٹ پر ہی مل گئی۔

نسیمہ اپنے ساتھ ایک بڑا تھرمس اور پکنک کی چوکور ٹوکری بھی لائی تھی۔ کہنے لگی کہ میں نے اس میں

کافی چکن سینڈوچز بنوا کر رکھ لیے ہیں۔

"ہم دوپہر کا کھانا تو چندر نگر کے کسی ریستوران میں کھائیں گے، یا پھر دریا کنارے بیٹھ کر سینڈوچز سے لنچ کریں گے۔ کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہم دریا کنارے بیٹھ کر ہی لنچ کریں گے۔ ریستوران میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" اس نے کہا اور میری طرف دیکھ کر مسکرادی۔ کہنے لگی۔ "آج میں بڑی خوش ہوں کہ تمہارے ساتھ سارا دن گزاروں گی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تم سے زیادہ خوشی ہو رہی ہے۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "یہ تو سیتا بن کے جنگل میں پہنچنے کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ ہم میں سے کون زیادہ خوش ہے۔"

اس جملے کے پیچھے جو پوشیدہ معنی چھپے ہوئے تھے میں انہیں بالکل نہ سمجھ سکا۔ اس وقت میں سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں صرف سمندر کی پرسکون سطح کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے نیچے جو طوفانی موجیں چھپی ہوئی تھیں ان کی مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسٹیشن پر آ کر پتہ چلا کہ ٹرین دو گھنٹے لیٹ ہے۔ ہم پلیٹ فارم پر ہی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ ویٹنگ روم وہاں سے کچھ فاصلے پر تھے۔ ہم اس طرف نہ گئے۔ کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ نسیمہ نے گہرے کاسنی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس نے ماتھے پر بندی بھی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"نسیمہ! تم تو مسلمان ہو۔ پھر ماتھے پر ہندو عورتوں کی طرح بندی کیوں لگائی ہے۔"

وہ مسکرا کر بولی۔

"یہ تو یہاں کا فیشن ہے۔ میں محض فیشن کے طور پر کبھی کبھی لگا لیتی ہوں اور پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

اس نے پکنک باسکٹ میں سے پلاسٹک کے دو چھوٹے کپ نکالے۔ تھرمس میں سے ان میں چائے ڈالی اور ہم وہیں بیٹھے چائے پیتے رہے۔ یہ عورت آج مجھ سے بڑی محبت کی باتیں کر رہی تھی۔ بار بار یہ جملہ دہراتی۔

"ہم ساری زندگی ایک دوسرے کے دوست رہیں گے اور دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے پیار کرتے رہیں گے۔ مجھے دوستی بہت پسند ہے۔"

اس قسم کی محبت بھری باتوں میں وقت کے گزرنے کا کچھ پتہ ہی نہ چلا۔ دو گھنٹے بھی گزر گئے۔ کلکتے کے مضافات میں جانے والی ٹرین تھی اس میں اتنا رش نہیں تھا۔ گھنٹے سوا گھنٹے میں ہم چندر نگر پہنچ گئے اس وقت تک چندر نگر فرانسیسی نوآبادی ہی تھی اور اس چھوٹے سے شہر پر فرانس کا قبضہ تھا۔ ہم اسٹیشن سے سیدھا دریا کے گھاٹ پر آ کر ایک جگہ درختوں کے نیچے بیٹھ گئے۔ لنچ کا وقت ہوگیا تھا۔ نسیمہ نے ٹوکری میں سے سینڈوچز نکال کر مجھے بھی پلیٹ میں ڈال کر دیے اور خود بھی لے لیے۔ باسکٹ کے اندر اس نے پانی کی بھی ایک تھرمس رکھی ہوئی تھی۔ سینڈوچز اس نے بڑے مزے دار بنائے تھے۔ ہم نے خوب مزے سے لنچ کیا۔ دریا کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر ادھر ادھر سے آ کر بادلوں کے ٹکڑے جمع ہونے شروع ہوگئے تھے۔ میں نے نسیمہ سے کہا۔

"کہیں بارش نہ آ جائے۔"

اس نے بادلوں کو ایک نظر دیکھا اور کہا۔

"میرے خیال میں یہ بارش والے بادل نہیں ہیں اور اگر بارش شروع ہو بھی گئی تو کوئی بات نہیں ہماری پکنک اور زیادہ رومانٹک ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو ٹھیک ہے مگر تم قدیم مندروں

پر ریسرچ ورک نہیں کر سکو گی۔"
اس نے ہنس کر کہا۔ "تم فکر نہ کرو مجھے بارش میں بھی کام کرنا آتا ہے۔"
جب ہم دریا پار کرنے کے لیے چندر نگر گھاٹ پر سے ایک بڑی کشتی میں بیٹھے تو آسمان پر کافی بادل جمع ہو چکے تھے اور دھوپ کسی وقت نکلتی تھی اور کسی وقت غائب ہو جاتی تھی۔ کلکتہ شہر میں بہنے والا دریائے جمنا عرف دریائے ہگلی بڑے سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ کیونکہ ہوا معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ کشتی میں اور مسافر بھی بیٹھے تھے۔ دریا پار پہنچنے کے بعد اس عورت نے ایک جانب جدھر درختوں کے جھنڈ تھے دیکھا اور بولی۔
"ٹھیک ہے ہمیں ان درختوں کی طرف جانا ہے۔ میں نے جو نقشہ دیکھا تھا اس میں ان درختوں کا جھنڈ صاف طور پر دکھایا گیا تھا۔"
ہم ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے۔
ہمارے اردگرد کافی گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ہم ان کے درمیان میں سے ہو کر جا رہے تھے۔ آخر ہم درختوں کے جھنڈ کے پاس پہنچ گئے۔ پگڈنڈی اس جھنڈ میں سے گزر کر دوسری طرف جاتی تھی۔ آگے درخت زیادہ قریب قریب اگے ہوئے تھے اور بادلوں کی وجہ سے وہاں درختوں کے نیچے ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہ اندھیرا گہرے سائے کی مانند تھا۔ نسیمہ کہنے لگی۔
"ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں۔"
وہ مجھ سے آگے آگے چل رہی تھی، میں اس کے پیچھے تھا اور میں نے پکنک والی بانس کی چھوٹی ٹوکری اٹھا رکھی تھی۔ پانی کا تھرمس ٹوکری کے اندر تھا اور چائے والا تھرمس نسیمہ نے اپنے کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔
"یہاں سے سیتا بن کا جنگل شروع ہو جاتا ہے۔"
ہم سیتا بن کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل میں ہر قسم کے درختوں اور جنگلی بیلوں کی اور جنگلی پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم کافی دیر تک درختوں کے نیچے چلتے رہے۔ راستے میں ہمیں کوئی دیہاتی آدمی نظر نہ آیا۔
میں نے نسیمہ سے پوچھا۔
"کیا اس طرف کوئی گاؤں وغیرہ نہیں ہے؟"
وہ بولی۔ "ایک گاؤں ہے مگر وہ مندر کے آگے ہے۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟"
اس نے رک کر مجھ سے پوچھا۔ میں نے بڑی دلیری سے جواب دیا۔ "بالکل نہیں، میں نے ایسے کئی جنگل دیکھے ہیں۔ بمبئی کی طرف جو جنگل آتے ہیں وہ اس سے زیادہ گھنے اور ڈراؤنے ہیں۔ میں نے ان میں کئی کئی دن گزارے ہیں۔"
نسیمہ نے میرے کندھے کو آہستہ سے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"تم سچ مچ بڑے بہادر لڑکے ہو۔ میں نے کچھ سوچ کر ہی تمہیں اپنا دوست بنایا ہے۔ مجھے بہادر لڑکے بڑے پسند ہیں۔"
اور اس نے دوبارہ آگے آگے چلنا شروع کر دیا۔
راستے میں ایک جگہ چھوٹی سی برجی دیکھی جو ایک ٹوٹے پھوٹے چبوترے پر بنی ہوئی تھی اور خستہ حالت میں تھی۔ نسیمہ نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔
"یہ اسی مندر کی ایک مڑھی ہے۔ ہم منزل کے قریب آ گئے ہیں۔"
ہم نے ایک چھوٹی سی ندی پار کی۔ ندی کے اوپر جھکے ہوئے درختوں نے ایک سرنگ سی بنا رکھی تھی۔ ابھی تک ہمیں کوئی جنگلی جانور نہیں ملا تھا۔ درختوں پر کہیں کہیں کسی پرندے کے بولنے کی آواز ضرور

آ جاتی تھی۔ ایک پراسرار سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ شاید زندگی میں پہلی بار مجھے اس خاموشی سے ڈر سا آنے لگا۔ میری چھٹی حس بیدار ہو چکی تھی اور مجھے آنے والے خطرات سے خبردار کرنے کی کوشش کر رہی تھی مگر میں اس عورت کے طلسم کے زیر اثر اس کے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔
ایک جنگلی بلا زور سے غراتا ہوا ہمارے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ میں ڈر کر عورت کے ساتھ لگ گیا۔ عورت یعنی نسیمہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
"ڈر گئے؟"
میں جلدی سے الگ ہو کر بولا۔ "بالکل نہیں۔"
وہ ہنس پڑی۔ ہم چلتے چلتے جنگل کے وسط میں ایک جگہ آ گئے۔ جہاں درخت اتنے قریب قریب ہو گئے تھے اور ان کے درمیان اتنی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں کہ چلنا دشوار ہو رہا تھا مگر وہ عورت اس طرح راستہ بناتے آگے آگے چلی جا رہی تھی جیسے اس نے پہلے سے یہ راستہ دیکھ رکھا ہو اور وہ کئی بار اس راستے سے گزری ہو۔ مجھے پکنک کی ٹوکری سنبھال کر ان جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے کافی محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ اس وقت نہ جانے کیوں اچانک میرے دل میں خیال آ گیا کہ مجھے اس طرف نہیں آنا چاہیے تھا۔
اس عورت نے شاید میرے چہرے سے میرے دل کے خوف کو پڑھ لیا تھا۔ وہ مجھے اپنے قریب کرتے ہوئے بولی۔
"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے ہیں۔"
درختوں کا گھنا پن تھوڑا تھوڑا ختم ہو گیا اور اب مجھے ان کے درمیان ایک پگڈنڈی بھی نظر آئی۔ کچھ دور چلنے کے بعد میں نے درختوں کے نیچے ایک پرانے مندر کی کھنڈر نما عمارت دیکھی۔ وہ عورت یعنی نسیمہ بڑی خوش ہو کر بولی۔
"لو ہم رام چندر جی کے قدیم مندر کے پاس آ گئے ہیں۔"
مندر کی عمارت ایک طرف سے بالکل ہی بیٹھ چکی تھی۔ جو دیواریں سلامت تھیں ان کی بھی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں اور ان پر گھاس اگ رہی تھی۔ مندر کے کھنڈر کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ سامنے کی جانب ایک شگاف سا بنا ہوا تھا شاید وہاں کبھی کوئی دروازہ ہوا کرتا ہوگا۔ جو اب غائب ہو چکا تھا اور دروازے کا صرف شگاف ہی باقی رہ گیا تھا۔ اس کے بالکل سامنے پتھروں کو جوڑ کر ایک چبوترا سا بنایا ہوا تھا جس کے پتھر بوسیدہ ہو چکے تھے اور ان کے درمیانی درزوں میں سے سوکھی گھاس باہر نکلی ہوئی تھی۔ نسیمہ چبوترے پر جا کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔
"شکر ہے بھگوان۔"
میں نے ذرا سا چونک کر اسے دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔
"تم ضرور حیران ہو رہے ہو گے کہ میں نے مسلمان ہوتے ہوئے بھگوان کا نام کیوں لیا؟ اصل میں بات یہ ہے کہ ہندو دیو مالا پر کام کرتے کرتے مجھ پر اس کا تھوڑا تھوڑا اثر ہو گیا ہے اور کبھی کبھی میرے منہ سے خدا کی بجائے بھگوان کا لفظ نکل جاتا ہے۔"
میں نے تب بھی کوئی خیال نہ کیا اور پکنک کی ٹوکری رکھ کر چبوترے پر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا اور اپنے اردگرد جنگل کو اور کبھی سامنے عجیب و غریب خستہ حال مندر کے کھنڈر کو تکنے لگا۔ ہم نے تھرمس میں سے پانی نکال کر پیا۔ کچھ سینڈوچز کھائے، میں نے چائے کی چھوٹی پیالیاں نکال کر چبوترے کے پتھر پر رکھیں

تو وہ عورت بولی۔ ”ایک منٹ ٹھہرو پہلے مجھے اس مندر کے گرد ایک چکر لگا کر اس کا جائزہ لے لینے دو۔ ویسے تو مجھے یقین ہے کہ یہ وہی مندر ہے جس پر مجھے ریسرچ کرنی ہے لیکن ایک بار اس کا جائزہ لینے سے میرا شک دور ہو جائے گا تم یہیں بیٹھے رہو۔“

وہ مجھے چبوترے پر بیٹھا چھوڑ کر مندر کے پیچھے چلی گئی۔

O......O......O

ایک عجیب سناٹا ماحول پر چھایا ہوا تھا۔ پہلے کسی پرندے کے بولنے کی آواز کسی وقت آ جاتی تھی اب وہ بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ کوئی پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔

دس پندرہ منٹ گزرنے کے بعد وہ عورت یعنی نسیمہ مندر کے کھنڈر کی دوسری طرف سے درختوں جھاڑیوں کے درمیان سے آتی نظر آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی آ کر میرے پاس بیٹھ گئی' کہنے لگی۔

”میں نے تسلی کر لی ہے۔ یہ وہی مندر ہے یہاں ایک پیالی چائے پیتے ہیں۔ اس کے بعد تم اسی جگہ بیٹھنا میں اس مندر کو اندر سے جا کر ایک نظر دیکھوں گی اور ضروری نوٹس لینے کے بعد ہم سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے واپس چل دیں گے۔“

میں تھرمس سے چائے نکال کر پیالیوں میں ڈالنے لگا۔ اس ویران سے جنگل میں چائے پینے کا بے حد لطف آیا۔ چائے بھی تھرمس میں پڑی رہنے کی وجہ سے ابھی تک گرم تھی۔ جب ہم ایک ایک پیالی چائے پی چکے تو اس عورت نے تھرمس کھولتے ہوئے کہا۔

”ایک ایک پیالی اور پینی چاہیے اس سے ہماری رہی سہی تھکان بھی اتر جائے گی۔“

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا کہ وہاں چائے نے واقعی بڑا مزہ دیا تھا۔ اور سفر کی تھکان کافی دور ہو گئی تھی۔ اس عورت نے اپنی پیالی میں چائے ڈالنے کے بعد میری پیالی میں چائے ڈالی اور ہم چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ابھی میں نے چائے کے دو تین گھونٹ ہی پیے تھے کہ اس عورت نے چبوترے کے نیچے ایک طرف جھاڑیوں میں دیکھتے ہوئے میرا نام لے کر کہا۔

”وہ دیکھ رہے ہو؟“

وہ جھاڑیوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر رہی تھی۔ میں بھی ادھر دیکھنے لگا۔ ”ادھر کیا ہے؟“

وہ بولی۔ ”شاخوں میں ایک سرخ پھول کھلا ہوا ہے۔ یہ گل مہر کا پھول ہے۔ مجھے گل مہر کے پھولوں سے بڑی محبت ہے۔ پلیز میری خاطر وہ پھول مجھے لا دو گے؟“

یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے پھول لانے کے لیے کہتی اور میں نہ جاتا۔ میں نے چائے کی پیالی وہیں رکھ دی اور چبوترے سے اتر کر جھاڑی کی طرف بڑھا۔ یہ گل مہر کے پھولوں کا پودا یا جھاڑی تھی۔ گل مہر کے پھول سرخ ہوتے ہیں اور اس کا جھاڑ چھ سات فٹ سے زیادہ اونچا نہیں ہوتا۔ میں نے سرخ پھول توڑا اور اسے لا کر نسیمہ کو دیا۔ وہ بڑی خوش ہوئی۔ اس نے پھول کو اپنے بالوں میں لگا لیا اور بولی۔

”تم سچ مچ بڑے بہادر ہو۔ تمہارے اندر ایک مرد کی ساری خوبیاں موجود ہیں' بھگوان نے چاہا تو......“

وہ ایک دم رک گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری ڈیئر! میرے منہ سے پھر غلطی سے بھگوان کا نام نکل گیا۔ میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ خدا نے چاہا تو ہماری دوستی ساری زندگی قائم رہے گی۔“

پھر اس نے میری چائے کی پیالی اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لو اپنی چائے پیو' میں بھی اپنی چائے پیتی ہوں۔“ اور اس نے اپنی پیالی بھی اٹھا لی۔ ہم ایک ایک گھونٹ کر کے چائے پینے لگے۔ درختوں کے درمیان سے کہیں کہیں آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ دھوپ بالکل نہیں تھی۔ سورج بادلوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ عورت مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پر بڑا بے معلوم سا تبسم تھا۔ میں نے چائے کا گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ ”تمہارا چہرہ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ”تم بھی مجھے بڑے اچھے لگتے ہو' میرے ساتھ دلی چلو گے؟ تم اب انکار نہیں کر سکتے' تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”ضرور چلوں گا۔“

میں بھی مسکرانے لگا تھا۔ مجھے اپنے اندر سرور کی ہلکی ہلکی سی لہر دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید یہ جنگل میں اپنی دوست عورت کے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے اور باتیں کرنے کا اثر تھا لیکن چائے کے مزید تین چار گھونٹ پینے کے بعد اس سرور میں اضافہ ہو گیا۔ جب میں نے چائے کی پیالی خالی کر کے نیچے رکھی تو سرور کی یہ کیفیت ہلکے سے نشے کی حالت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ عورت بدستور میری طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

”تمہیں ضرور ہلکا ہلکا سرور محسوس ہو رہا ہو گا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں۔“

کہنے لگی۔ ”مجھے بھی ہو رہا ہے' یہ اس جنگل کی ہوا کی وجہ سے ہے۔ کہتے ہیں کہ سیتا بن کے تالاب کے کنارے جو اس مندر کی دوسری طرف ہے' ایسے درخت اگتے رہتے ہیں جن کی شاخوں اور پتوں سے نشے کے بخارات نکل نکل کر ہوا میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نشہ اس ہوا کی وجہ سے ہو رہا ہے۔“

لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ وہ نشے یا سرور کی کیفیت میں نہیں تھی وہ بڑے سکون سے اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی جبکہ میرا سر اس نشے کی کیفیت میں آہستہ آہستہ ڈولنے لگا۔ میں گھبرا گیا اور اس عورت سے کہا۔

”مجھے چکر آ رہے ہیں۔“

اس نے مجھے تھام لیا۔ کہنے لگی۔ ”اگر نیند آ رہی ہے تو سو جاؤ۔“

میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو رہی تھیں۔ میں نے انہیں کھلا رکھنے کی کئی بار کوشش کی مگر میں کامیاب نہ ہوا اور میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میرا دماغ ابھی تک گھوم رہا تھا۔ بند آنکھوں کے اندر سفید دائرے گھوم رہے تھے۔ یہ دائرے گھومتے گھومتے سفید سے نیلے ہو گئے' پھر سرخ ہو گئے' پھر غائب ہو گئے اور اندھیرا چھا گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی مگر میں انہیں ہلا نہ سکا۔ میرا سارا بدن جیسے پتھر ہو چکا تھا۔ مگر بے ہوش اس طرح ہوا تھا کہ میرے کانوں میں اس عورت نسیمہ کی آواز برابر آ رہی تھی۔ وہ مجھے آہستہ آہستہ میرا نام لے کر پکار رہی تھی۔

”کیا تم سو گئے ہو؟ تم میری آواز سن رہے ہو؟“

میری زبان بند تھی میں بول نہیں سکتا تھا اس عورت کا بھید مجھ پر کھل چکا تھا۔ اس نے مجھے چائے میں کچھ پلا دیا تھا۔ جب میں اس کے لیے گل مہر کا پھول لینے گیا تھا تو اس وقت اس نے میری پیالی میں بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ مجھے اس کی آواز مدھم مگر پوری طرح سے سنائی دے رہی تھی۔

مجھے اس کے جسم کا' اس کے ہاتھوں کا لمس بھی محسوس ہو رہا تھا' مگر میں اپنے ہاتھ پیر ہلانے سے قاصر تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے مجھے چبوترے پر لٹا دیا ہے۔ اس کے بعد مجھے اس کے چبوترے سے اترنے کی آواز آئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کہاں گئی ہو گی۔

میری سمجھ میں ابھی تک یہ معمہ نہیں آیا تھا کہ اس نے مجھے کس لیے بے ہوش کیا ہے اور وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ایک مرد اور ایک عورت کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب آئی تو میں نے اس عورت نسیمہ کی آواز کو پہچان لیا' وہ اپنے ساتھ کسی مرد کو لے آئی تھی۔ وہ میرے قریب آ کر باتیں کرنے لگے۔ نسیمہ نے کہا۔

''میں نے اپنا کام کردیا ہے' اب آگے جو کچھ کرنا ہوگا تم لوگوں کو کرنا ہوگا۔''

مرد کی آواز آئی۔

''رانی اندو تم نے لکشمی میا کے دشمن کو ہمارے قدموں میں ڈال کر اپنا کرتوے پوری طرح نبھایا ہے اس کے بدلے لکشمی دیوی تمہیں جنم جنم کے چکر سے مکت کردے گی۔''

تب مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ یہ عورت مسلمان نہیں ہندو تھی اور اس کا نام رانی اندو تھا۔ اس کو ایک سازش کے تحت میری تلاش میں اور مجھے پکڑنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اندو رانی نے کہا۔ ''لکشمی میا تو مجھے جنم جنم کے چکر سے مکتی دلانے کا جو وردھان دے گی وہ میرے سوبھاگ ہیں لیکن تم لوگوں نے مجھے اس کے عوض دو ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا وہ بھی تمہیں پورا کرنا ہوگا۔''

مرد نے کہا۔ ''وہ صبح ہوتے ہی تمہارے گھر پہنچا دیے جائیں گے' ابھی ہمیں لکشمی میا کے اس دشمن کو جس نے دیوی کی بھینٹ کو اس کی استھان سے چھینا تھا' یہاں سے بھدرگام کے جنگل والے مٹھ میں پہنچانا ہوگا جہاں بڑے پجاری جی کے آنے کے بعد اسے لکشمی میا کی مورتی کے آگے قتل کرنے کے بعد مورتی کو اس کے خون سے نہلانا ہے۔ اس کے بعد ہم سب لکشمی دیوی کے سراپ (بددعا) سے بچ سکیں گے۔''

عورت نے کہا۔ ''تم اپنے آدمی بلا کر اسے یہاں سے لے جاؤ' میں یہاں سے واپس کلکتے درگا دیوی کے دریا کنارے والے مندر میں چلی جاؤں گی۔''

مرد نے کہا۔ ''ہمارا آدمی تمہیں وہیں آ کر صبح دو ہزار روپے دے جائے گا۔ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرو میں چھکڑا گاڑی اور اپنے آدمیوں کو لے کر آتا ہوں۔ ہم نے سب کام تیار کر رکھا تھا۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ وہ آدمی چلا گیا تھا' مکار عورت شاید میرے قریب ہی بیٹھ گئی تھی۔ کسی کسی وقت مجھے اس کے آہستہ سے کھانسنے کی آواز آ جاتی تھی۔ پھر مجھے ایسی آواز آئی کہ وہ پیالیاں وغیرہ بانس کی ٹوکری میں ڈال رہی تھی۔ میں بولنا چاہتا تھا' میں چیخ چیخ کر اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا ہے' مگر میری زبان بند تھی۔ میں صرف سن سکتا تھا' نہ بول سکتا تھا' نہ ہاتھ پاؤں اور جسم کو ہلا سکتا تھا۔ مجھے اندھے جذبات میں بہہ جانے اور عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینے کی سزا مل رہی تھی۔ میں نے صدق دل سے اللہ کے حضور دعا مانگی کہ یا اللہ پاک مجھے اس عذاب سے بچا لے۔ میں آئندہ کبھی ایسا گناہ نہیں کروں گا۔

مجھے چھکڑا گاڑی کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی دو تین آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ چھکڑا گاڑی چبوترے کے پاس آ کر رک گئی جو مرد پہلے مکار عورت رانی اندو سے باتیں کر رہا تھا اس نے کہا۔ ''اسے اٹھا کر گاڑی میں ڈال دو۔''

دو تین آدمیوں نے مجھے اٹھایا اور چھکڑا گاڑی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد گاڑی چل پڑی۔ مجھے نہیں معلوم گاڑی کے آگے بیل جتا ہوا تھا یا گدھا' گاڑی آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتی ایک طرف چل پڑی۔ یہ لوگ مجھے وسطی جنگلوں میں کسی جگہ واقع بھدرگام کے کسی مٹھ میں لے جا رہے تھے جہاں مجھے کسی مورتی کے آگے قتل کر دینا تھا۔

O......O......O

میں صرف سن سکتا تھا اس کے علاوہ مجھے کچھ محسوس نہیں ہوتا تھا۔ چھکڑا گاڑی کے ہچکولے محسوس ہوتے تھے' جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ گاڑی ابھی تک جنگل میں ہی جا رہی ہے۔ کتنی ہی دیر تک گاڑی چلتی رہی۔ پھر مجھے بارش کی آواز سنائی دینے لگی۔ بیل گاڑی کے اوپر کوئی ترپال وغیرہ ڈال کر مجھے شاید ڈھانپ دیا گیا تھا۔ یہ آواز بارش کی بوندوں کے ترپال پر گرنے کی تھی۔ ٹپاٹپ کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ بیل گاڑی کے پہیوں کی چرخ چوں بھی سنائی دے رہی تھی۔ کسی آدمی کے بولنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں' بیل گاڑی ایک گھنٹے تک چلتی رہی کہ دو گھنٹوں تک چلتی رہی۔ ایک جگہ پہنچ کر بیل گاڑی رک گئی۔ لاری کے ہارن کی آواز سنائی دی اور پھر ایسے لگا جیسے کوئی لاری بیل گاڑی کے پیچھے آ کر رک گئی ہے۔ دو تین آدمیوں کی کچھ فاصلے پرے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوا کہ بیل گاڑی کسی ریلوے پھاٹک کے پاس آ کر رک گئی تھی جو بند تھا۔ کچھ دیر کے بعد ریل گاڑی کی شور مچا کر گزرنے کی آواز آئی۔ جب یہ آواز دور نکل گئی تو ریلوے پھاٹک کھل گیا اور ہماری بیل گاڑی پھر سے چل پڑی۔

یہ سفر جہاں تک میرا اندازہ ہے پانچ چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ اب گاڑی کو بہت کم ہچکولے لگ رہے تھے اور وہ قدرے ہموار سڑک پر جا رہی تھی۔ کچھ دیر تک مجھے لاریوں کے گزرنے کی آوازیں بھی آتی رہیں۔ اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی اور گاڑی کو ہچکولے لگنے شروع ہو گئے۔ گاڑی پھر کسی جنگل میں داخل ہو گئی تھی۔ میں نے دو تین بار کوشش کی کہ آنکھیں کھولوں مگر میرے پپوٹوں نے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ میرا باقی کا جسم بھی اسی طرح سن ہو چکا تھا۔ خدا جانے اس عورت نے مجھے چائے میں کیا پلا دیا تھا میرا ذہن برابر کام کر رہا تھا اور میں سوچ بھی رہا تھا اور مجھے گزرے ہوئے سارے واقعات یاد بھی آ رہے تھے۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ میرے ذہن پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں سو گیا ہوں کیونکہ باہر کی آوازیں سنائی دینی بند ہو گئی تھیں۔ کچھ معلوم نہیں کہ میں کب تک سویا رہا۔ پوری رات سویا رہا کہ پورے دوسرے دن بھی سوتا رہا۔ جب میری سماعت واپس آئی اور میرا ذہن بیدار ہو گیا تو مجھے موٹر کے انجن کے چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ مجھے کسی موٹر کار یا جیپ میں ڈال کر کسی دوسری جگہ لے جایا جا رہا تھا۔ جیپ سڑک پر ہموار چل رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی پکی سڑک تھی۔ کافی دیر کے بعد جیپ ایک طرف کو مڑ کر شاید کچی سڑک پر تھوڑا اچھل اچھل کر چلنے لگی۔ یہ حالت پندرہ بیس منٹ تک رہی۔ اس کے بعد جیپ کی رفتار کافی ہلکی ہو گئی اور اسے کم ہچکولے لگنے لگے۔ میرے اوپر جو ترپال ڈالی ہوئی تھی اس کے ساتھ درختوں کی شاخوں کے ٹکرانے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ شاید ہم ایک بار پھر کسی جنگل سے گزر رہے تھے۔

ترپال پر بارش کی رم جھم کی آواز رک گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بارش رک گئی تھی۔ جیپ بہت دیر تک ہلکے ہلکے ہچکولوں کے ساتھ چلتی رہی۔ پھر وہ ایک جگہ رک گئی۔ یہاں کچھ آدمیوں کے بولنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ اتنی دیر میں مجھے وہ لوگ جیپ سے اٹھا کر کسی جگہ لے گئے۔ اتنا اندازہ

ہوا کہ وہ کوئی زینہ اتر کر نیچے گئے تھے۔ شاید یہ کوئی قید خانہ تھا جہاں مجھے لا کر ایک چارپائی پر ڈال دیا گیا تھا۔ خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد مجھ پر بھی غنودگی سی طاری ہونا شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ میری غنودگی گہری بے ہوشی میں تبدیل ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا میری نیند کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے جسم کی طاقت واپس آ گئی ہے۔ میں ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو میری آنکھیں بھی کھل گئیں۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کی دیوار کے طاق میں دیا روشن تھا۔

سامنے ایک زینہ اوپر کو جاتا تھا۔ میں اٹھ کر زینے کی طرف جانے لگا تو میں نے دیکھا کہ میرا ایک پاؤں چارپائی کے ساتھ زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ زنجیر لوہے کی تھی اور جہاں اس کا سرا چارپائی کے ساتھ بندھا تھا وہاں ایک تالا بھی لگا ہوا تھا۔ یعنی اگر میں زنجیر کو کھولنا بھی چاہوں تو ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ میرے سر کے چکر بالکل ختم ہو چکے تھے جسم کی طاقت بھی واپس آ گئی تھی۔ اس مکار عورت نے مجھے چائے میں ملا کر جو سفوف پلایا تھا اس کے اثرات بالکل ختم ہو چکے تھے۔ اوپر سے کسی کے زینے سے اترنے کی آواز آئی۔ میں چارپائی پر سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ یہ دو آدمی تھے۔ ان کی رنگت کالی تھی۔ ایک نے ہاتھوں میں بندوق پکڑی ہوئی تھی اور ایک قدم پیچھے تھا۔ دوسرے کے ہاتھوں میں تھالی تھی جس میں چاول تھے جن کے اوپر زرد رنگ کی دال ڈالی ہوئی تھی۔ اس آدمی نے کہا۔

"اٹھو یہ کھالو۔" میں آہستہ سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے تھالی میرے ہاتھوں میں تھمائی اور بندوق والے آدمی کے ساتھ زینہ چڑھ کر چلا گیا۔ اوپر سے مجھے دروازے کے بند ہونے اور باہر تالا لگنے کی آواز آئی۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ یہ بھدرگام کا وہ جنگل ہے جہاں مجھے کسی دیوی کی مورتی کے آگے ہلاک کر کے مجھ سے لکشمی دیوی کی بھینٹ کو بھگا کر لے جانے کا بدلہ لیا جائے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا تھا کہ وہاں سے میرے لیے اپنی جان بچانا بہت مشکل اور دشوار ہے۔ صرف خدا ہی غیب سے میری مدد کا کوئی سامان پیدا کر سکتا تھا۔ بظاہر میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

وقت کا تو مجھے کوئی اندازہ تھا ہی نہیں۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا کہ اس کوٹھڑی میں قید میں پڑے مجھے کتنے دن، کتنی راتیں گزر گئی تھیں۔ پھر ایک روز مجھے کوٹھڑی سے نکال کر باہر لایا گیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ درخت ہی درخت تھے۔ درختوں کے اوپر آسمان پر دن کی روشنی گلابی ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ سامنے ایک بہت بڑا درخت تھا جس کے موٹے تنے کی دونوں جانب مشعلیں روشن تھیں۔ درخت کے آگے چھوٹے سے چبوترے پر کسی دیوتا کی مورتی رکھی ہوئی تھی۔ مورتی کے آگے تیل کے تین چار دیئے ایک تھالی میں جل رہے تھے۔ ایک پجاری یا مہنت ٹائپ کا موٹے پیٹ والا آدمی مورتی کے پاس بیٹھا خدا جانے کیا بولتا جا رہا تھا۔ مجھے پکڑ کر اس کے پاس لے جایا گیا۔ مہنت نے کہا۔

"اس کو بٹھا دو۔"

مجھے اس سے ایک گز کے فاصلے پر بٹھا دیا گیا۔ مہنت نے وہ تھالی جس میں دیے جل رہے تھے اٹھائی، اپنی جگہ سے اٹھا اور کچھ الاپتے ہوئے تھالی کو میرے سر کے اوپر گھمانے لگا۔ دس بارہ مرتبہ میرے سر کے اوپر تھالی کو گھمانے کے بعد وہ مورتی کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور جو آدمی مجھے پکڑ کر لائے تھے ان کی

طرف دیکھ کر بولا۔

"اس کو لے جا کر بند کر دو۔ آدھی رات کے بعد چندر ماں آکاش پر نکلے تو اس ملیچھ کو دیوی ماتا پر قربان کر دیا جائے گا۔"

میں نے دیکھ لیا تھا کہ مورتی کے آگے سنگ مرمر کا ایک بڑا پتھر رکھا ہوا تھا جس پر ایک کلہاڑی اور دو چھریاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان چھریوں سے آدھی رات کے بعد مجھے ذبح کیا جانے والا تھا۔ انہیں دیکھ کر میرے اندر دہشت کی لہریں دوڑنے لگیں۔

مجھے تہہ خانے میں واپس لا کر کے چارپائی پر ڈال کر زنجیر سے باندھ دیا گیا۔ دونوں آدمی چلے گئے اور تہہ خانے کا دروازہ بند کر کے اسے تالا بھی لگا گئے۔ اس کا مطلب تھا کہ میری زندگی میں بظاہر چند ایک گھنٹے ہی باقی رہ گئے تھے۔ پہلے تو مجھ پر موت کا خوف طاری ہو گیا اور میرا جسم ایک دم ٹھنڈا ہو گیا۔ پھر میں ہاتھ اٹھا کر خدا کے حضور دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ پاک میرے گناہ معاف فرما دے۔ زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ مجھ پر رحم فرما اور مجھے ان قاتلوں سے نجات دلا دے۔ دعا مانگنے کے بعد مجھے کچھ حوصلہ ہو گیا لیکن موت مجھے سامنے نظر آ رہی تھی۔ موت میرے سر سے ابھی ٹلی نہیں تھی۔

جیسے جیسے رات گہری ہوتی جا رہی تھی میرے اندر موت کا خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ پردہ غیب سے اگر کوئی مدد آنے والی تھی تو اس کا مجھے علم نہیں تھا لیکن بظاہر میرے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ طاق میں دیا جل رہا تھا۔ کوٹھڑی میں موت کا سناٹا طاری تھا۔ میں زنجیر سے بندھا چارپائی پر بیٹھا تھا کسی بھی وقت موت کا فرشتہ زینے میں نمودار ہو کر مجھے باہر مورتی کے سامنے لے جا کر ہلاک کر سکتا تھا۔ میں بے بسی کے عالم میں بیٹھا سامنے والی دیوار کو یونہی

زندگی کی ڈش

اجزاء:۔ غم، فکر، حسرتیں، ناکام تمنائیں، ارمان۔

ترکیب:۔ سب سے پہلے زندگی کی دیگچی میں خون ڈال کر اس کی سفیدی ختم کرنے کے لئے کیس مارک 5 پر رکھ دیں۔ اور ایک فرائی پین میں "غم" کو فرائی کر لیں۔ پھر "فکر" بھی شامل کر لیں اور پھر دیگچی میں ڈال دیں۔ پھر "حسرت" کو دھیمی آنچ پر پکاتی رہیں...... پکاتی رہیں...... لیکن یاد رکھیں "دعا" کا چمچہ برابر ہلاتا ہے۔ جب ذرا سرخی مائل ہو جائے تو اس میں تھوڑی سی "ناکام تمنائیں" بھی ڈال دیں۔ اور بہت دیر تک بھونتے رہیں۔ یہ مصالحہ جب نمکین پانی چھوڑنے لگے تو جلدی سے سلگتے ارمان شامل کریں۔ جب اس سے ٹھنڈی آہیں نکلنا شروع ہو جائیں تو ذائقہ اچھا کرنے کے لئے تھوڑی سی محبت اور راحت بھی ملا دیں۔ زندگی کی نمکین اور کھٹی میٹھی ڈش تیار ہے۔

ہم کہتے ہیں

○ دوسروں کو یقین دلانے کے لئے اپنا سر جھکانا بے وقوفی ہے۔

○ انسان کو اتنا بھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے کہ اسے اپنی کہی ہوئی بات کی سچائی ثابت کرنے کے لئے کسی دوسرے کی گواہی کی ضرورت پڑے۔

○ جو نہیں ہو رہا اس میں یقیناً "اس" کی منشا ہے پر جو رہا ہے دعا کرو اس میں "وہ" راضی ہو۔

○ علم حاصل کرو اور اسے دل میں اتارو، جو دل میں اترے وہ علم ہے۔ جو دماغ پر نقش ہو وہ شیطانیت ہوتی ہے۔

(قرۃ العین کامل بھٹ شاہ)

تکے جا رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا جیسی دیوار میں کوئی چیز حرکت کر رہی ہے۔ میں نے اس پر نظریں جما دیں۔ پہلے میں یہی سمجھا کہ شاید کوئی سانپ ہے جو جنگل میں سے اندر آ گیا ہے اور اب دیوار پر رینگ رہا ہے۔ حرکت کرتی ہوئی چیز نے ایک انسانی سائے کی شکل اختیار کر لی۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اچانک انسانی سایہ دیوار سے اتر کر زمین پر آ گیا۔ میں ڈر گیا کہ یہ کوئی آسیب ہے۔ جلتے ہوئے چراغ کی دھیمی روشنی میں سائے کے نقش صاف ہونے لگے اور پھر میں نے اس انسانی سائے کو پہچان لیا۔ یہ وہی

میری ہمدرد بھٹکی ہوئی بدروح ترشنا تھی۔ آج وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا نہیں رہی تھی' خاموش تھی۔ وہ وہیں دیوار کے ساتھ کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی پھر مجھے اس کی سرگوشی نما آواز سنائی دی۔ کہنے لگی۔

"جہاں میں کھڑی ہوں۔ میرے جانے کے بعد دیوار میں اس جگہ میں سے نکل جاؤ۔ میں تمہارے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔ اس سے زیادہ نہیں کرسکتی۔ میں دیوتا کی مورتی کے منہ سے اس کا شکار چھین رہی ہوں۔ مجھے اس کی بددعا لگے گی مگر میں تمہیں ان وحشی درندوں کے ہاتھوں مرتا نہیں دیکھ سکتی۔ میرے گناہوں میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہوجائے گا۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ترشنا میرے دیکھتے دیکھتے انسانی جسم سے سائے میں تبدیل ہوگئی پھر یہ سایہ دیوار میں جذب ہوگیا۔ ترشنا جاچکی تھی۔ میں کچھ دیر ساکت سا ہوکر بیٹھا رہا پھر خیال آیا کہ میرا ایک پاؤں زنجیر سے بندھا ہوا ہے میں اٹھ کر دیوار کے پاس کیسے جاسکتا ہوں۔ میں نے اپنا لوہے کی زنجیر میں جکڑا ہوا پاؤں ہلایا تو زنجیر میرے پاؤں میں سے نکل گئی۔ میرا پاؤں آزاد ہوچکا تھا۔

میں جلدی سے اٹھ کر دیوار کے پاس آ گیا۔ دیوار پتھر کی تھی۔ اس میں کوئی درز تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ پتھر کی طرح سخت تھی۔ میں اس میں سے کیسے گزر سکتا تھا۔ کہیں ترشنا نے میرے ساتھ سنگین مذاق تو نہیں کیا؟ کہیں ترشنا کی جگہ یہ کوئی دوسری بدروح تو نہیں تھی۔ طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔

پھر سوچتا کہ اگر ترشنا نے میرے ساتھ مذاق کیا ہوتا تو وہ میرا پاؤں زنجیر سے آزاد نہ کرتی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے دیوار کو ٹٹولا۔ اس پر دونوں ہاتھ پھیرے۔ اسے اندر کی طرف دبایا۔ دیوار پتھر کی طرح تھی۔ مجھے خیال آ گیا کہ ترشنا نے کہا تھا کہ جب میں چلی جاؤں تو تم دیوار میں سے گزر جانا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ گزرنے سے پہلے دیوار کو ٹٹول کر ہاتھ لگا کر اسے دبا کر دیکھنا۔

میں نے دیوار میں سے گزرنے کی اداکاری کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوسکتا تھا کہ میں دیوار سے ٹکرا جاتا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور دیوار کی طرف اس طرح بڑھا جیسے میں دیوار میں سے نہیں بلکہ کسی دروازے میں سے گزرنے والا ہوں۔ میں آج بھی حیران ہوں کہ دیوار میں سے کیسے گزر گیا۔ یہ کوئی جادوٹونہ ہی ہوسکتا تھا۔ میں دیوار کے ساتھ بالکل نہیں ٹکرایا تھا۔ میں نے جو قدم بڑھایا تھا وہ دیوار میں سے ایسے گزر کر دوسری طرف چلا گیا جیسے دروازے میں سے گزرا ہو۔ میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ میں نے دوسرا پھر تیسرا اور چوتھا قدم اٹھایا۔ تازہ اور ٹھنڈی ہوا میرے چہرے کو لگی تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ منظر بدل گیا ہے۔ جہاں مجھے لایا گیا تھا یہ وہ جگہ نہیں ہے۔ میرے دائیں بائیں دو ٹیلے تھے جن کی ڈھلانوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ٹیلوں کے درمیان ایک تنگ سا راستہ بنا ہوا تھا۔ میں جتنی تیز چل سکتا تھا اس راستے پر چلنے لگا۔ میں اس خیال سے تیز چل رہا تھا کہ کہیں میرا اندازہ غلط نہ ہو اور یہ وہی جگہ نہ ہو جہاں میرے دشمنوں نے مجھے قید میں ڈال رکھا تھا۔ اگر یہ وہی جگہ تھی تو آس پاس کوئی نہ کوئی مسلح پہرے دار ضرور موجود ہوگا۔ میں ٹیلوں کے درمیانی تنگ راستے میں سے نکل گیا۔

میرے سامنے ایک مختصر سا کھلا میدان تھا۔ وہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ میں میدان میں سے بھی گزر گیا۔ آگے پھر اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ جب میں کافی اندر نکل گیا اور کوئی آدمی میرے پیچھے نہ آیا تو مجھے یقین ہوگیا کہ ترشنا نے اپنے طلسم کی مدد سے مجھے میری موت کے مقام سے نکال کر کسی دوسری جگہ پہنچا دیا ہے۔ میں اندھیرے میں درختوں کے نیچے چلا جا رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کہ میری دائیں جانب اندھیرے میں جھاڑیں حرکت کررہی ہیں۔ میں نے رک کر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں چل پڑا۔ پھر مجھے میری بائیں جانب جھاڑیوں میں حرکت کا احساس ہوا۔ میں خوفزدہ ہوکر رک گیا۔ غور سے بائیں جانب دیکھا۔ وہاں کوئی دکھائی نہ دیا۔ جھاڑیاں اندھیرے میں بالکل ساکت تھیں۔ میں پھر چلنے لگا۔ چند قدم چلا ہوں گا کہ اب مجھے اپنی دونوں جانب جھاڑیوں میں حرکت کا احساس ہوا۔ مجھے ایسے لگا جیسے میری دونوں جانب کوئی میرے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

میرے جسم میں خوف ودہشت کی ٹھنڈی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔ اتنے میں میرے دائیں جانب سے کسی نے بھاری مردانہ آواز میں پوچھا۔

"کدھر جارہے ہو؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ دونوں جانب کی جھاڑیوں میں سے دو انسانی سائے نکل کر میرے سامنے آ گئے۔ وہ مجھ سے چھ سات فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ اندھیرے میں مجھے ان کی لال آنکھیں انگاروں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ ایک نے پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

میں نے اتنی دیر میں اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ میں نے کہہ دیا کہ ایک دوست کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ جنگل میں راستہ بھول گیا ہوں۔ ان دونوں کی بندوقیں میں نے دیکھ لی تھیں جو انہوں نے ہاتھوں میں پکڑ رکھی تھیں۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

"بائیں طرف مڑ کر ہمارے آگے آگے چلو۔ بھاگنے کی کوشش کی تو گولی ماردیں گے۔"

موت کے منہ سے نکل کر موت کی جھولی میں گر گیا تھا۔ یہاں تھوڑی بہت بچنے کی امید تھی۔ میں بائیں طرف مڑ کر درختوں میں چل پڑا۔ دونوں میرے پیچھے مجھ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر چلے آرہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد مجھے اندھیرے میں درختوں کے نیچے ایک لالٹین جلتی ہوئی دکھائی دی۔ یہ لالٹین ایک کوٹھڑی کے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ ایک جانب کچھ گھوڑے کھڑے تھے۔ ان آدمیوں نے مجھے کوٹھڑی کھول کر اندر دھکیلا اور دروازہ بند کرکے باہر سے کنڈی لگادی۔ کوٹھڑی میں گھپ اندھیرا تھا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے کی درزوں میں سے اندر آتی ہوئی لالٹین کی مدھم روشنی میں مجھے کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی ایک خالی چارپائی نظر آئی۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھیں تقدیر مجھے کیا دکھاتی ہے۔

جو دو آدمی مجھے وہاں لائے تھے وہ چلے گئے تھے۔ باہر خاموشی تھی۔ پھر باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دروازے کی کنڈی کسی نے اتاری اور دروازہ کھول دیا۔ ایک آدمی لالٹین لیے کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک اونچا لمبا بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی تھا جس کے کندھے سے بندوق لٹک رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں دو مسلح آدمی تھے جو شاید اس کے باڈی گارڈ تھے۔ بڑی بڑی مونچھوں والے آدمی نے میرے قریب آ کر مجھے گھور کر دیکھا اور رعب دار آواز میں پوچھا۔

”تم ایس پی مکندر لال کے آدمی ہو؟“

میں نے کہا۔ ”میں کسی مکندر لال کو نہیں جانتا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ جنگل میں شکار کھیلنے آیا تھا۔ راستہ بھول کر ادھر آنکلا۔ آپ کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔“

مونچھوں والے آدمی نے اس آدمی کی طرف دیکھا جس نے لالٹین پکڑ رکھی تھی۔ وہ آدمی بولا۔

”رانا جی یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ پولیس کا جاسوس ہے۔“

مونچھوں والے آدمی نے اس سے پوچھا۔ ”تو پھر اس کا کیا کریں؟“

وہ آدمی کہنے لگا۔ ”اس نے ہمارا خفیہ ٹھکانہ دیکھ لیا ہے۔ اس کو مار ڈالتے ہیں۔“

مونچھوں والے رانا نے میری طرف دیکھا اور بولا۔

”اس کو بند کر کے پہرہ لگادو۔ سویرے اس سے پوچھ گچھ کریں گے۔“

وہ مجھے کوٹھڑی میں بند کر کے چلے گئے۔ میں نے باقی رات کوٹھڑی کے اندر گزار دی۔ دروازے کی جھریوں میں سے دن کا اجالا اندر آنے لگا تو کسی نے کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ لال لال آنکھوں والا ایک آدمی اندر آیا اور مجھ پکڑ کر درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف لے گیا۔ وہاں وہی بڑی بڑی مونچھوں والا آدمی جس کو رانا کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا ایک چارپائی پر بندوق ایک طرف رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پیتل کا گلاس تھا۔

اس میں شاید چائے تھی۔ وہ چائے پی رہا تھا۔ ایک آدمی بندوق اٹھائے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ جو آدمی مجھے پکڑ کر لایا تھا اس نے مجھے رانا کے سامنے زمین پر بٹھا دیا اور خود ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔

دوسرے درختوں کی طرف سے کچھ آدمیوں کے بولنے کی کسی وقت آواز آ جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ڈاکو لوگ ہیں اور انہوں نے اس جنگل میں ڈیرا ڈال رکھا ہے اور یہ بڑی بڑی مونچھوں والا رانا ڈاکوؤں کا سردار ہے۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”لڑکے صاف صاف بتادو' تم کون ہو۔ ہم تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔“

میں نے ڈاکوؤں کے سردار رانا کو صاف صاف بتادیا کہ میں اصل میں گھر سے بھاگ کر کلکتے آیا تھا۔ وہاں سے کچھ لوگوں نے مجھے اغواء کیا اور ایک جنگل میں لے آئے۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر میرے رشتے داروں سے پیسہ وصول کرنا چاہتے تھے۔ آج شام میں موقع پا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا ہوں اور اس وقت سے جنگل میں بھٹک رہا ہوں کہ کوئی راستہ باہر نکلنے کا مل جائے تا کہ میں ٹرین یا کسی لاری کو پکڑ کر واپس کلکتے چلا جاؤں۔“

ڈاکوؤں کے سردار نے پوچھا۔

”تم ہندو ہو کہ مسلمان؟“

میں نے کہا۔ ”میں مسلمان ہوں اور پنجابی ہوں۔“

ڈاکوؤں کا سردار خاموشی سے چائے پیتا رہا اور مجھے دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے میرے بیان پر یقین آ گیا ہے۔ اپنے آدمیوں کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہ لڑکا بڑا چالاک لگتا ہے۔ مجھے یقین ہے اسے پولیس نے ہماری ٹوہ لگانے کے لیے بھیجا ہے۔“

اس کا آدمی کہنے لگا۔

”رانا جی! ہمیں تو پہلے ہی یقین تھا۔ حکم دیں' ابھی اس کو مار کر دبا دیتے ہیں۔“

رانا جی نے کہا۔

”ایسا کرو اسے لے جا کر بند کردو۔ جس روز یہاں سے ڈیرہ اٹھائیں گے اس کو مار کر دبا دینا اور ایس پی مکندر لال کو پرچی لکھ کر بھیج دینا کہ ہم نے تمہارے آدمی کو فلاں جگہ دبایا ہے آ کر لاش لے جاؤ۔“

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک بار پھر موت میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے اس کوٹھڑی میں لا کر بند کر کے باہر پہرہ لگا دیا گیا۔ ایک آدمی مجھے کچھ کھانے کو دے گیا۔

انہوں نے مجھ پر اتنی مہربانی ضرور کی تھی کہ میرے ہاتھ پاؤں نہیں باندھے تھے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد دروازے کی جھریوں میں سے باہر دیکھ لیتا تھا۔ باہر ایک کی بجائے دو مسلح ڈاکو چارپائیوں پر بیٹھے میری نگرانی کررہے تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں [illegible]

ایک خیال میرے دل کو تھوڑا سہارا دیتا تھا کہ شاید ترشنا کی بدروح میری مدد کو آ جائے لیکن وہ عین وقت پر آتی تھی۔ ہوسکتا ہے اس دفعہ اس کو پتہ ہی نہ چلے کہ میں کس مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ ہوسکتا ہے وہ اس وقت آئے جب یہ لوگ مجھے مارنے کے بعد میری لاش کو زمین میں دفن کر رہے ہوں۔

باہر شام کا اندھیرا ہونے لگا۔ ایک آدمی کوٹھڑی میں آ کر مجھے کھانے کو دو روٹیاں اور اچار دے گیا۔ یہ سارے لوگ مسلح تھے اور چہروں ہی سے بڑے سفاک قاتل لگ رہے تھے۔ میں بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ کوٹھڑی کے چاروں طرف ڈاکو ہی ڈاکو چلتے پھرتے مختلف کام کرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ میں نے دروازے کی درزوں میں سے دیکھا کہ ڈاکو وہاں سے چلنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گھوڑوں پر تھوڑا بہت سامان لادا جا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری موت کا وقت آن پہنچا تھا۔

ترشنا کی بدروح میری مدد کرنے ابھی تک نمودار نہیں ہوئی تھی۔ میں سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کبھی چارپائی پر بیٹھ جاتا' کبھی اٹھ کر کوٹھڑی میں سے باہر دیکھنے لگتا۔ باہر اب رات کا اندھیرا ابھار رہا تھا۔ ایک دو درختوں کے نیچے لالٹین روشن ہو گئی تھیں۔ کوٹھڑی کے باہر والی لالٹین بھی روشن کردی گئی تھی۔

کوٹھڑی کے آگے جو دو بانس کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں وہ بھی اٹھالی گئی تھیں۔ اب باہر صرف ایک ڈاکو بندوق لیے ایک پتھر پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ کوٹھڑی کے آگے سے چھ سات گھوڑے جن پر سامان رکھا ہوا تھا گزر گئے۔ ان کے ساتھ ڈاکو چل رہے تھے۔

میری موت کا وقت آ گیا تھا۔ ابھی تک ترشنا کی بدروح میری مدد کو نہیں آئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں موت کے خوف سے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اتنے میں کوٹھڑی کا دروازہ کھلا اور دو ڈاکو اندر آ گئے۔ ایک ڈاکو بندوق پکڑے کھڑا رہا۔ دوسرے نے رسی سے میرے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔ وہ مجھے چلاتے ہوئے ایک طرف درختوں کے جھنڈ کے پاس لے گئے۔ ایک ڈاکو نے بندوق تان لی۔ دوسرے نے مجھے حکم دیا۔

”یہاں بیٹھ جاؤ اور اپنے خدا کو یاد کرو۔“ میرے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

میں بیٹھ گیا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ مجھے نہیں پتہ پھر کیا ہوا اتنا یاد ہے کہ میں نے روتے ہوئے خدا کو اس طرح یاد کیا جیسے وہ میرے سامنے موجود ہو۔ ایک آسمانی بجلی سی چمکی' جھماکا سا ہوا اور میری آنسوؤں سے بھری آنکھیں چکاچوند ہو گئیں اور میرے حلق سے خوف کے مارے چیخ نکل گئی۔ میں یہی سمجھا کہ مجھ پر بندوق کا فائر ہوا ہے۔ میرا جسم صحیح سالم تھا' میں منہ کے بل پڑا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ اب کوئی

بجلی نہیں چمک رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میرے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے تھے۔ شروع رات کے تاروں کی دھندلی دھندلی روشنی میں میں نے دیکھا کہ دونوں ڈاکوؤں میں سے کوئی بھی وہاں نہیں تھا۔

میں نے سامنے کی طرف دوڑنا شروع کردیا۔ میں اسکول کے کھیلوں میں بڑا تیز دوڑا کرتا تھا۔ اندھیرے میں کچھ نظر آ رہا تھا' کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں بے تحاشا دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ میں جھاڑیوں میں الجھ رہا تھا' سامنے آ جانے والے درختوں سے اپنے آپ کو بچا رہا تھا۔ ایک جگہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر بھی پڑا مگر میں رکا نہیں' دوڑتا چلا گیا۔

آگے ڈھلان آ گئی یہ ڈھلان ایک گہری گھاٹی میں اترتی تھی۔ میں گھاٹی میں اتر گیا۔ یہاں تاریکی زیادہ تھی مگر میں دوڑ رہا تھا۔ گھاٹی کے دونوں کنارے اونچے تھے۔ درمیان میں تنگ سا راستہ تھا جس میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں گھاس میں ایک طرف کو بھاگ رہا تھا۔

مجھے یہ بھی خبر نہیں تھی کہ یہ گھاٹی آگے کہاں جاتی ہے اور میں کس طرف جا رہا ہوں۔ میرا کام جان بچا کر بھاگنا تھا اور میں بھاگ رہا تھا۔ ایک جگہ گھاٹی ختم ہوگئی۔ سامنے تھوڑی سی چڑھائی تھی میں چڑھائی چڑھ کر گھاٹی سے باہر نکل آیا۔

وہاں کالی سیاہ بڑی بڑی چٹانیں تھی جو آڑی ترچھی زمین پر پڑی ہوئی تھیں۔ کوئی بالکل سیدھی کھڑی تھی' کوئی ٹیڑھی ہو رہی تھی اور کوئی زمین سے نکل کر کچھ دور جا کر واپس زمین میں چلی گئی تھی۔ ان کے درمیان پتھروں سے ٹکراتا چشمہ بہہ رہا تھا۔

چشمہ ایک ندی کی شکل میں تھا۔ اس کے بہتے پانی کی آواز آ رہی تھی۔ میں چشمے میں اتر گیا۔ پانی ٹھنڈا تھا اور میری پنڈلیوں تک تھا۔ میں چشمے میں سے لمبے لمبے ڈگ بھرتا نکل کر دوسرے کنارے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا' مجھے ہر لمحے ڈاکوؤں کا ڈر لگا ہوا تھا۔

مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ میرا پیچھا نہ کر رہے ہوں۔ میں کیسے ان کی گولیوں سے بچ گیا تھا؟ یہ میں آج بھی نہیں سمجھ سکا۔ میرا ایمان ہے کہ خدا نے مجھے بچالیا تھا۔ بس اللہ کو میرے آنسو دیکھ کر مجھ پر رحم آ گیا تھا اور اس نے مجھے بچالیا تھا۔ کیسے بچالیا تھا اور وہ قیامت خیز بجلی کی چمک کیا تھی جس نے مجھے چکاچوند کردیا تھا اور ڈاکوؤں کو غائب کردیا تھا۔ یہ میں کوشش بھی کروں تو آپ کے آگے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ میں خود اس راز کو نہیں سمجھ سکا' آپ کو کیا سمجھاؤں گا۔

خدا جانے میں اس خوفناک جنگل میں رات کی تاریکی میں کب تک اور کہاں تک بھاگتا اور کبھی تیز تیز چلتا چلا گیا۔ جب میرے پاؤں میں چلنے کی بالکل سکت نہ رہی اور ٹانگوں نے بھی جواب دے دیا تو میں ایک جگہ گر پڑا اور دیر تک اسی حالت میں سوکھی خشک گھاس پر پڑا رہا۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

آسمان کی طرف دیکھا' تارے چمک رہے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے ان ظالموں سے میری جان بچالی۔ اس کے بعد اردگرد کا جائزہ لیا کہ میں کہاں آ گیا ہوں۔ میرے سامنے کی جانب اب کوئی گھنا جنگل نہیں تھا زمین صاف تھی اور ستاروں کی روشنی میں ایسے لگ رہا تھا جیسے آگے کھیت ہی کھیت ہیں۔

میں ان کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ ان کھیتوں میں کہیں تو فصل کھڑی تھی اور کہیں کھیتوں میں ہل چلا ہوا تھا۔ میں اونچی فصل کی آڑ میں سامنے کی جانب چلا جا رہا تھا۔ میں نے ایک جگہ کھڑی فصل کے ناٹنڈوں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ یہ کماد کا کھیت تھا۔ کماد یعنی گنے دیسی تھے جو پتلے ہوتے ہیں۔ وہ شبنم میں بھیگے ہوئے تھے۔

میں نے دو تین گنے اکھاڑے اور وہیں بیٹھ کر انہیں توڑ توڑ کر چوسنے لگا۔ تازہ میٹھے رس نے مجھے کافی حد تک پھر سے تازہ دم کردیا۔ یقین کریں میں نے تین چار گنے ختم کردیے۔ کسی طرف سے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی' میں اٹھ کر چلنے لگا۔ میں کھیتوں کے درمیان چل رہا تھا تاکہ مجھے کوئی دیکھ نہ لے۔ چلتے چلتے اونچی فصل سے باہر نکلا تو سامنے دور دو تین روشنیاں ٹمٹماتی دکھائی دیں۔

ابھی تک مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں کون سے علاقے میں آ گیا ہوں۔ جن ڈاکوؤں سے میں جان چھڑا کر بھاگا تھا وہ ہندی اردو بول رہے تھے' بنگلہ نہیں بول رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں صوبہ بنگال سے آگے نکل آیا ہوں اور بہار کے جنگلوں میں سے گزر کر آیا ہوں اور ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھ کر مجھے حوصلہ ہوا کہ میں انسانوں کی آبادی میں پہنچ گیا ہوں۔

میرا رخ ان روشنیوں کی طرف تھا۔ کھیت ختم ہوگئے۔ آگے ایک ریلوے لائن آ گئی۔ ٹمٹماتی روشنیاں ریلوے لائن کی جانب ہی تھیں۔ شاید یہ کوئی ریلوے اسٹیشن تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا ریلوے لائن ایک طرف کو گھوم گئی تو سامنے سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔

میں تیز تیز چلنے لگا۔ میں ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ اس کے پلیٹ فارم پر تین چار بتیاں جل رہی تھیں۔ پلیٹ فارم خالی پڑا تھا۔ پلیٹ فارم کا ایک گیٹ تھا' بس گیٹ کے پاس خالی

بنچ پر بیٹھ گیا۔ کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد ایک نیلی قمیص والا ٹرالی پر کچھ سامان لادے پلیٹ فارم پر نمودار ہوا۔ میں اٹھ کر اس کے پاس گیا اور پوچھا۔

”یہ کون سا اسٹیشن ہے؟“

اس نے ٹرالی ایک طرف رکھ دی تھی اور اس میں سے سامان اتار رہا تھا۔ میرے سوال پر میری طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ ”تمہیں کہاں جانا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”پنجاب جاؤں گا۔ کیا یہاں سے کوئی ٹرین پنجاب جاتی ہے؟“

وہ بولا۔ ”صبح چھ بجے ایک پسنجر میل جاتی ہے۔“

وہ خالی ٹرالی لے کر جس طرف سے آیا تھا اس طرف چلا گیا۔

مجھے اب ساری رات اس ویران پلیٹ فارم پر گزارنی تھی۔ مجھے یہ خوف تھا کہ ڈاکوؤں کا کوئی پتہ نہیں کہیں میری تلاش میں اسٹیشن پر بھی نہ پہنچ جائیں۔ جس بینچ پر میں بیٹھا تھا اس پر بجلی کے کھمبے کی روشنی پڑ رہی تھی۔

میں وہاں سے اٹھ کر پلیٹ فارم کے دوسرے سرے کی طرف چلا گیا۔ وہاں تھوڑا اندھیرا تھا۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ شام کو ڈاکوؤں نے مجھے کچھ کھلا پلا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے مجھے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔ قریب ہی ایک نلکا تھا میں نے اٹھ کر پانی پیا۔ منہ دھویا اور بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔

اگرچہ موسم سردیوں کا نہیں تھا لیکن رات کو خنکی ہو گئی تھی اور مجھے تھوڑی سردی لگنے لگی تھی۔ میں نے ٹھنڈی پتلون اور قمیص پہنی ہوئی تھی۔ میرے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں تھا۔ میں سمٹ سمٹا کر بنچ کے کونے میں بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ کب دن چڑھے گا اور کب پنجاب جانے والی ٹرین آئے گی۔ اسٹیشن کا نام عجیب سا تھا جو مجھے یاد نہیں رہا۔

یہ صوبہ بہار کا علاقہ ہی تھا۔ وہاں سے پنجاب کافی دور تھا۔ لیکن ایک بار ٹرین میں بیٹھنے کی دیر تھی، پھر امرتسر تک میرے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ میں بغیر ٹکٹ سفر کروں گا۔ راستے میں پکڑا گیا تو ٹی ٹی مجھے وہیں ٹرین سے اتار دے گا۔

میں نے سوچ رکھا تھا کہ اگر ٹی ٹی ٹرین سے اتار دے گا تو میں کوئی دوسری ٹرین پکڑ لوں گا۔ واپس کلکتے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب تو کسی نہ کسی طرح میں اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ ویران پلیٹ فارم کی رات بڑی آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ کسی وقت تو ایسے لگتا کہ جیسے رات گزر ہی نہیں رہی۔ ویران پلیٹ فارم پر آ کر وہ بھی رک گئی ہے۔

ٹھنڈ لگتی تو میں اور زیادہ سمٹ جاتا۔ کسی وقت اٹھ کر بنچ کے پیچھے اندھیرے میں ٹہلنے لگتا۔ وقت تو گزر ہی رہا تھا، صرف مجھے احساس ہو رہا تھا جیسے وہ رک گیا ہے۔ رات بھی وقت کے ساتھ گزر رہی تھی۔ پلیٹ فارم پر کوئی گھڑی بھی نہیں لگی ہوئی تھی کہ جس سے اندازہ ہوتا کہ رات کا کیا بج رہا ہے۔

بے چینی اور کوفت کی وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔ بنچ پر دبک کر بیٹھے بیٹھے کسی وقت مجھے نیند بھی آ جاتی تھی لیکن سردی لگنے سے کچھ دیر بعد ہی آنکھ کھل جاتی تھی۔ بڑی مشکل سے آسمان پر پھیلی ہوئی تاریکی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ میں نے آسمان کے مشرق کی جانب نگاہ ڈالی۔ وہاں آسمان کے کناروں پر نیلاہٹ سی جھلکنے لگی تھی۔ یہ صبح کے آثار تھے۔ یہ نیلاہٹ بڑے بے معلوم انداز میں سفیدی مائل ہونے لگی۔ آسمان پر سورج نکلنے سے بہت پہلے کا نورانی غبار اڑنے لگا۔ جن کھیتوں اور جنگلوں سے میں گزر کر آیا تھا ان کی جانب سے کسی کسی وقت ٹھنڈی

ہوا آتی۔ اس ہوا میں جنگلی پھولوں، درختوں اور شبنم میں بھیگی ہوئی جھاڑیوں اور گھاس کی مہک تھی۔

اس کے بعد سورج نکل آیا اور پلیٹ فارم پر کچھ مسافر بھی نظر آنے لگے۔ دھوپ نکلنے سے فضا کی خنکی اور سردی کم ہو گئی تھی۔ میں اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

O.....O.....O

پسنجر ٹرین اپنے وقت پر آ گئی۔ میں پچھلی بوگی کے ایک ڈبے میں چڑھ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لیے ہی رکی اور پھر چل پڑی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک تو ٹرین کی رفتار ہلکی تھی اور دوسرے وہ تقریباً ہر اسٹیشن پر کھڑی ہوتی تھی۔ بنارس پہنچتے پہنچتے دن ڈھلنے لگا تھا۔ ابھی تک ڈبے میں کوئی ٹکٹ چیکر نہیں آیا تھا۔ بنارس کے اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں محتاط ہو گیا۔ یہ بڑا اسٹیشن تھا۔ یہاں پلیٹ فارم پر بھی ٹکٹ چیکر کا خطرہ تھا۔ یہ بات میرے بغیر ٹکٹ سفر کرنے کے تجربے میں آ چکی تھی کہ کبھی کبھی کسی بڑے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بھی ٹکٹ چیکر اگر کسی پر شک ہو جائے تو ٹکٹ چیک کر لیتا تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اترتے ہی ٹرین سے دور ہٹ کر کتابوں رسالوں کے اسٹال کے کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ جتنی دیر ٹرین بنارس کے اسٹیشن پر رکی رہی میں وہیں کھڑا رسالے وغیرہ دیکھتا رہا۔ جب ٹرین چل پڑی تو میں بھی ٹرین کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میرے ڈبے میں کوئی ٹکٹ چیکر نہیں چڑھا تو میں دوڑ کر ڈبے میں گھس گیا۔

اس کے آگے بڑا اسٹیشن لکھنؤ تھا۔ یہاں بھی بغیر ٹکٹ پکڑے جانے کا شدید خطرہ تھا مگر میں بھی بغیر ٹکٹ سفر کرنے میں بڑا ماہر ہو گیا تھا۔ اس کھیل کے تمام کرداروں کی نفسیات سے واقف تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جب تک گاڑی تھوڑی رفتار نہیں پکڑ لیتی، ٹکٹ چیکر ڈبے میں داخل نہیں ہوتا۔ اگر وہ رکی ہوئی ٹرین کے کسی ڈبے میں سوار ہو تو اس ڈبے میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے والا مسافر ٹکٹ چیکر کی شکل دیکھ کر ہی اتر سکتا تھا لیکن جب ٹرین تھوڑی تیز ہو جاتی تھی تو پھر بغیر ٹکٹ سفر کرنے والے کے لیے اترنا مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ عام طور پر چیکر چلتی ٹرین میں دوڑ کر ڈبے میں سوار ہوا کرتے تھے اس طرح کسی مسافر کو اترنے کا بہت کم موقع ملتا تھا۔

میں بھی ٹکٹ چیکر کے منصوبے پر عمل کیا کرتا تھا اور جب ٹرین پلیٹ فارم پر اسپیڈ پکڑ لیتی تھی تب اس میں سوار ہوتا تھا۔ اس دوران میں یہ تسلی کر لیتا تھا کہ ڈبے میں کوئی چیکر سوار نہیں ہوا۔ اگر چیکر سوار ہوتا تھا تو میں وہ بوگی چھوڑ کر کسی پچھلی بوگی کے ڈبے میں گھس جاتا تھا۔

بعض ڈبوں کے دروازے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے تھے۔ ٹکٹ چیکر چلتی ٹرین میں ایک ڈبے کے مسافروں کو چیک کر کے دروازے کے ہینڈلوں کو پکڑ کر دوسرے ڈبے میں آ جاتا تھا۔ مگر دو بوگیوں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا تھا۔ یہاں وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس وجہ سے میں چیکر والی بوگی چھوڑ کر دوسری بوگی میں سوار ہو جاتا تھا۔

ٹرین بنارس شہر کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل آئی تھی۔ شام کے وقت ٹرین دریائے گومتی کے پل پر سے گزری اور پھر لکھنؤ کے اسٹیشن پر رکتے ہی میں حسب عادت ڈبے سے اتر کر ادھر ادھر ہو گیا۔ مجھے اس طریقہ کار پر اس وقت تک عمل کرتے رہنا تھا جب تک ٹرین امرتسر نہیں پہنچ جاتی۔ کیونکہ میرے پاس ٹرین کا ٹکٹ نہیں تھا اور میں بغیر ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ پتہ نہیں آج کل کیا صورتحال ہے مگر انگریز کے زمانے میں یہ بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا اور ٹکٹ چیکر پکڑے ہوئے مسافر

کو اس وقت تک نہیں چھوڑتا تھا جب تک وہ ڈبل جرمانہ ادا نہ کردے۔ اگر مسافر کے پاس پیسے نہیں ہوتے تھے تو اسے ریلوے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ میری عمر کے لڑکوں کو اکثر ٹکٹ چیکر پکڑنے کے بعد راستے میں ہی کسی اسٹیشن پر اتار دیا کرتے تھے۔ میرے ساتھ ایسا تین چار مرتبہ ہو چکا تھا۔ ایک تو لکھنو کا اسٹیشن ایک بڑا جنکشن تھا' دوسرے ٹرین پسنجر تھی' وہ کافی دیر تک وہاں رکی رہی اور میں ٹکٹ چیکروں سے آنکھ بچاتا ادھر ادھر چھپتا پھرتا رہا۔ بڑی مشکل سے گارڈ نے سیٹی دی' پھر انجن نے دو تین بار وسل دیا اور ٹرین پلیٹ فارم پر سے کھسکنے لگی۔ میں ذرا پرے ہٹ کر ٹرین کے ساتھ ساتھ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اپنے ڈبے کی نشاندہی میں نے یاد کر رکھی تھی۔ میرا ڈبہ میرے پیچھے سے آرہا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرا اور میں نے دیکھ لیا کہ اس میں کوئی چیکر سوار نہیں ہوا تو میں نے دوڑتے دوڑتے ڈبے کے ہینڈل کو پکڑا اور اس میں سوار ہو گیا۔

جس روٹ پر یہ پسنجر ٹرین سفر کر رہی تھی اس روٹ پر سارے بڑے بڑے شہر آتے تھے۔ لکھنو کے آگے شاہجہان پور تھا' پھر بریلی تھا' اس کے بعد رامپور تھا اور اس کے آگے مراد آباد کا شہر تھا لیکن ایک بات میرے حق میں جاتی تھی کہ اب رات ہو گئی تھی اور رات کو ٹرین میں چیکنگ کا خطرہ کم ہوتا ہے۔ بریلی اسٹیشن پر میں پلیٹ فارم پر اتر گیا لیکن اس کے بعد میں ڈبے میں ہی رہا۔ ٹرین رات کے وقت سفر کرتی رہی۔ کم بخت کوئی اسٹیشن نہیں چھوڑ رہی تھی۔ جب مراد آباد آیا تو دن نکل آیا تھا۔ بھوک سے میرا حال کافی خراب ہو رہا تھا۔ پانی تو میں پی لیتا تھا' مگر سارا دن میں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ میرے پاس ایک پیسہ تک نہیں تھا لیکن اللہ میاں بڑا کارساز ہے اور رازق ہے۔ مراد آباد سے میرے ڈبے میں ایک بزرگ سوار ہوئے جن کے پاس ایک بڑا سا ٹفن کیریئر بھی تھا۔ اتفاق سے وہ میرے پاس ہی آکر بیٹھ گئے۔ مراد آباد سے ٹرین نے دلی کا رخ کیا۔ جب ٹرین چل پڑی تو اس بزرگ نے ٹفن کیریئر کھول دیا۔ اس کے اندر کھانے کو بہت کچھ تھا۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اتنے میں اس بزرگ نے میری طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"برخوردار ناشتہ کرو گے؟"

میں نے دل پر جبر کر کے تکلفاً کہہ دیا۔

"جی نہیں' شکریہ۔"

اس بزرگ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"میاں! ہم کبھی اکیلے ناشتہ نہیں کرتے۔ میرے ساتھ شامل ہو جاؤ۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

مجھے بھی بہت خوشی ہوئی۔ پوریاں تھیں' حلوہ تھا' کچوریاں تھیں' مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی پھر بھی میں ہاتھ روک کر کھا رہا تھا کہ بزرگ مجھے ندیدہ نہ سمجھیں لیکن بڑے مشفق بزرگ تھے انہوں نے زبردستی مجھے بہت کچھ کھلا دیا۔ میری بھوک ختم ہو گئی۔ راستے میں ٹرین ایک جگہ رکی تو انہوں نے تھرمس میں سے چائے نکال کر ایک کپ مجھے بھی دیا۔

مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں میں نے کہا۔ "امرتسر جا رہا ہوں۔"

"کہاں سے آرہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

خدا جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے کہہ دیا۔

"یہی مراد آباد سے سوار ہوا ہوں۔ ایک دوست سے ملنے آیا تھا۔ پتہ چلا کہ وہ کلکتے جا چکا تھا۔ اب واپس اپنے شہر جا رہا ہوں۔"

میں اس بزرگ سے باتیں کر رہا تھا کہ اچانک ہمارے ڈبے میں ایک ٹکٹ چیکر سوار ہو گیا۔ اسے

دیکھتے ہی میں گھبرا گیا سوچا ڈبے سے اتر جاؤں مگر اس دوران ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ صاف ظاہر تھا کہ ٹکٹ چیکر مجھے پکڑ لے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ مجھے ٹرین سے نیچے نہ اتارے اور کہے تمہیں دلی پہنچ کر پولیس کے حوالے کر دوں گا۔ دلی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ اس بزرگ کے آگے میری بڑی بے عزتی ہوگی۔ اب کیا کروں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ ٹکٹ چیکر مسافروں کے ٹکٹ چیک کرتا ہماری نشستوں کی طرف آرہا تھا۔ بزرگ مجھ سے کچھ باتیں ضرور کر رہے تھے۔ میں ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا اور میری ساری توجہ ٹکٹ چیکر کی طرف تھی جو آہستہ آہستہ ہمارے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ آخر وہ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے بزرگ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ان سے ٹکٹ مانگی۔ بزرگ نے بڑے اطمینان سے اچکن کی اوپر والی جیب سے زرد رنگ کا ریلوے ٹکٹ نکال کر چیکر کو دیا۔ چیکر نے اس پر پنسل سے نشان بنایا اور ٹکٹ واپس کر دیا۔ اب اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ٹکٹ؟"

اس کی آواز بم کا دھماکہ بن کر میرے کانوں میں گونج اٹھی۔ میں نے وہی پرانا نسخہ استعمال کیا اور یونہی اپنی پتلون کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ چیکر بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی ساری جیبوں کی تلاشی لینے کے بعد حیران ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"خدا جانے کہاں گم ہو گیا ہے ٹکٹ۔ میں نے اسی جیب میں رکھا تھا۔"

ٹکٹ چیکر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"برخوردار! تمہاری شکل بتا رہی ہے کہ تم نے ٹکٹ نہیں خریدا تھا۔ کہاں سے سوار ہوئے تھے؟"

چیکر نے اپنی خاکی بش شرٹ کی جیب میں سے کاپی پینسل نکالتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہہ دیا۔ "مراد آباد سے سوار ہوا ہوں۔"

چیکر نے حساب لگا کر مراد آباد سے لے کر دلی تک کے ریل کے کرائے کی رقم مع جرمانے کے بتائی تو میں نے کہا۔

"میرے پاس تو اتنے ہی پیسے تھے جس کا میں نے ٹکٹ خرید لیا تھا۔ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔"

چیکر بولا۔ "تو پھر برخوردار یہیں آرام سے بیٹھے رہو۔ دلی آرہا ہے' وہاں میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔"

اچکن پوش بزرگ بڑی خاموشی سے ہمارے درمیان جاری مکالمے سن رہے تھے۔ جب ٹکٹ چیکر نے پولیس کا نام لیا تو انہوں نے کہا۔

"مراد آباد سے دلی کا ٹکٹ کاٹ دیجیے۔ پیسے میں دیے دیتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں نہیں جناب آپ تکلیف نہ کریں۔"

انہوں نے بٹوے میں سے روپے نکال کر ٹکٹ چیکر کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں برخوردار! تم میرے بچوں کی طرح ہو۔"

ٹکٹ چیکر کو شاید افسوس ہو رہا تھا کہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ اس نے پیسے لے کر مجھے چھپے ہوئے کاغذ کی شکل میں مراد آباد سے دلی تک کا ٹکٹ تھمایا اور ڈبے کے دروازے کی طرف چلا گیا۔ میں اس بزرگ کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ وہ بولے۔

"میاں! تمہیں تو امرتسر جانا ہے۔ آگے کیا کرو گے۔ تمہارے پاس تو کوئی پیسہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں دلی اتر کر اپنے کسی رشتے دار

کے پاس جا کر پیسے ادھار لے لوں گا۔"
وہ بولے۔ "میاں! تمہاری یہ عمر اپنے رشتے داروں کے احسان لینے کی نہیں ہے فکر نہ کرو۔"
انہوں نے بٹوے میں سے بیس روپے نکال کر مجھے دیے اور فرمایا۔ "یہ کرائے کے لیے اپنے پاس رکھو۔ تمہیں میں اپنے بچوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔"
مراد آباد کے اس بزرگ کی مہربان صورت آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ میں انہیں ہمیشہ نیک دعاؤں کے ساتھ یاد کرتا ہوں۔ اس زمانے میں بیس روپوں کی بڑی قیمت تھی۔ گاڑی دلی پہنچی تو وہ بزرگ مجھے خدا حافظ کہہ کر دوسرے مسافروں کے ہجوم میں میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے لیکن میرے تصور میں آج وہ دنیا کے ہجوم میں سب سے الگ نظر آتے ہیں۔ دلی اسٹیشن پر اس پسنجر ٹرین کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ٹھہرنا تھا۔ میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ کسی طرح پلیٹ فارم سے نکل کر باہر گیا اور دلی سے امرتسر تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر جیب میں سنبھال کر رکھ لیا۔ اس وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں آگے بھی بغیر ٹکٹ ہی جاؤں لیکن اب میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں جلدی اپنے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنا گھر، اپنے گھر والے، بہن بھائی، اپنا شہر، اپنے شہر کی گلیاں اور سب سے بڑھ کر اپنے امرتسر شہر کا کمپنی باغ بہت یاد آ رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس بار میں نے اپنے ایڈونچرس سفر میں بہت مصیبتیں اٹھائی تھیں اور دو تین بار موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا تھا۔
میں اپنی پسنجر ٹرین میں آ کر بیٹھ گیا۔ ٹکٹ میری جیب میں تھا۔ اب مجھے کسی کی فکر نہیں تھی۔ بلکہ میری خواہش تھی کہ کوئی ٹکٹ چیکر ڈبے میں آئے اور میں بڑی شان سے ٹکٹ نکال کر اسے دکھاؤں لیکن میری یہ حسرت پوری نہ ہوئی۔ امرتسر تک کوئی چیکر ٹکٹ چیک کرنے نہ آیا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جب ٹکٹ اپنے پاس ہو تو ٹکٹ چیکر ڈبے میں نہیں آتا۔ جب ٹکٹ پاس نہ ہو تو چلتی ٹرین میں ٹکٹ چیکر ڈبے میں آ جاتا ہے۔ عجیب لوگ ہیں یہ بھی۔
ہماری پسنجر ٹرین اسی طرح بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ جیسے یہ اس کا آخری سفر تھا جو ختم ہو گیا ہے۔ اس کا انجن بھی غائب ہو گیا تھا۔ ٹرین کے آس پاس ریلوے کا کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ گارڈ کا ڈبہ بھی خالی پڑا تھا۔ لگتا تھا کہ ٹرین کا کوئی وارث نہیں رہا۔ انتہائی صبر آزما انتظار کے بعد آخر گارڈ صاحب کی صورت نظر آئی۔ وہ سرخ اور سبز جھنڈیاں بغل میں دبائے سگریٹ پیتے ایک طرف سے چلے آ رہے تھے۔ گارڈ کو دیکھ کر کچھ حوصلہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ایک انجن بھی کسی طرف سے شنٹ کرتا آیا اور ٹرین کے آگے لگ گیا۔ آخر گارڈ کو مسافروں پر رحم آ گیا۔ اس نے سیٹی بجائی۔ ایک بار نہیں دو تین بار سیٹی بجائی۔ اس کی سیٹی کی آواز سن کر انجن کو بھی ہوش آ گیا۔ اس نے بھی دو تین بار وسل دیا اور پسنجر ٹرین کے مردہ جسم میں جان پڑ گئی۔ اس نے تکلیف دہ آوازوں کے ساتھ اپنی جگہ سے حرکت کی اور پلیٹ فارم پر کھسکنا شروع کر دیا۔ ٹرین کے ہمارے ڈبے کے پہیوں میں سے عجیب دردناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ ٹرین آدھی رات کے وقت امرتسر پہنچی۔ گھر میں سب سو رہے تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ آپو جی یعنی والدہ نے دروازہ کھولا۔ مجھے دیکھ کر اپنے ساتھ لگا کر میرا ماتھا چوما۔ میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔